سہ ماہی کتابی سلسلہ 13

اسالیب سرگودھا

عالمی اردو ادب کا ترجمان

ستمبر تا دسمبر 2011ء

ڈاکٹر وزیر آغا نمبر

مدیر: ── ذوالفقار احسن

نائب مدیران: ── طلعت شہزاد بابر، ارم ہاشمی، محمد ایوب ناز

قانونی مشیر
محمد اظہر امین ایڈووکیٹ

قیمت فی شمارہ ──── 200 روپے
سالانہ چندہ مع ڈاک ──── 250 روپے
بیرونی ممالک کے لیے ──── 40 امریکی ڈالر

مجلس مشاورت
ڈاکٹر عابد سیال، شاکر کنڈان، ارشد ملک،
عابد خورشید، مرزا محمد اشرف
سرکولیشن منیجر: احمد جمال احسن، اویس ذوالفقار

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ہیڈ آفس: گلی نمبر 4، مکان نمبر 85/8 اسلام پورہ سرگودھا 0300-8704221

E.mail zulfiqarahsen@yahoo.com

فہرست

☆☆☆☆☆

جاتے کہاں کہ رات کی بانہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا
وزیر آغا

وہی ہے ساعتِ مُردہ ، وہی دَر و دیوار
بُرے دنوں کو گئے آج پورا سال ہوا

ابھی آنکھوں کی نمی کم نہ ہو پائی کہ جریدۂ وقت کا سالنامہ بھی آ گیا۔ہم وزیر آغا کے وصال کے غم میں مستغرق تھے کہ ان کی پہلی برسی بھی آ گئی۔وقت کتنی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا ہے۔آنکھوں کی نمی اہلِ سرگودھا کے حصہ میں بڑی دیر سے آئی ہوئی ہے۔کبھی شکیب جلالی کی المناک موت کا سانحہ،کبھی الطاف مشہدی،غلام جیلانی اصغر،نصرت چوہدری کی وفات اور پھر دنیائے ادب کے بلند پایہ انشائیہ نگار،شاعر،اور عالمی سطح کے ایک ایسے اردو نقاد تھے،جنھوں نے جدید ادبی تھیوریز پیش کر کے اُردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔اُن کے سایۂ شفقت کا ہمارے سروں سے اُٹھ جانا بھی شامل ہے ابھی کل کی بات ہے جب ہم وزیر آغا کی شام دوستاں آباد میں کچھ سیکھنے کی غرض سے شریک ہوا کرتے تھے۔وہ محفل نہ تھی، ایک درس گاہ تھی کہ جس نے اردو کی مختلف اصناف مثلاً اردو افسانہ،انشائیہ کی شروعات،جدید اُردو نظم کی تحریک،جدید اردو غزل کی نشاۃ الثانیہ،ملکی مسائل اور عالمی حالات حاضرہ کا ہر موضوع ان کے ہاں زیرِ بحث رہا ہے۔

وزیر آغا نے عہد ساز ادبی جریدے ''اوراق'' کے ذریعے پوری اُردو برادری کو اپنے خیالات اور فکر سے فیض یاب کیا۔آج ہم اس عظیم تخلیق کار کی پہلی برسی منا رہے ہیں۔پہلی برسی کے موقع پر سہ ماہی ''اسالیب'' نے ڈاکٹر وزیر آغا کو زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے وزیر آغا نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔اس نمبر کو کامیاب بنانے کے لیے ہم تمام اہلِ قلم کے شکرگزار ہیں جنھوں نے ہماری گزارش پر وزیر آغا کے لیے اپنی نگارشات دیں۔اس نمبر میں پاکستان کے علاوہ ناروے،انڈیا،سری نگر،امریکہ اور دیگر ممالک کے اہلِ قلم کی نگارشات بھی شامل ہیں۔یوں ہم اس وزیر آغا نمبر کو ایک عالمی سطح کا نمبر بھی قرار دے سکتے ہیں۔کچھ مضامین اس نمبر میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ان شاءاللہ وہ مضامین آئندہ عام شماروں میں ''گوشۂ وزیر آغا'' کے تحت شائع ہوتے رہیں گے ''اسالیب'' کے ہر عام شمارہ میں ''گوشۂ وزیر آغا'' مخصوص کر دیا گیا ہے۔آئندہ وزیر آغا کے بارے مضامین اور دیگر نگارشات اس گوشے میں شائع ہوا کریں گی۔

مدیر

میر ظہیر عباس روستمانی

حرفِ چند
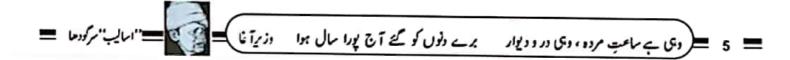
میں اپنے والد گرامی ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں مختصراً یہی کہوں گا کہ وہ ایک عہد ساز ادیب اور دانشور تھے۔ انھوں نے بہ حیثیت مدیر، خرد افروزی کی جو شمع مجلّہ اوراق کے ذریعے روشن کی تھی وہ آج ایک مینارہ نور کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مجلّہ "اوراق" کی وساطت سے اُردو ادب کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی کئی پیڑھیوں کی ادبی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اسی طرح صنف انشائیہ کو متعارف کرانے اور اسے ایک تحریک کی صورت عطا کرنے میں انھوں جواں تھک کام کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ایک ناقد کی حیثیت سے اُنھوں نے نظری اور عملی تنقید کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا اس سے اُردو تنقید ایک طرح سے تخلیق کے درجے پر فائز ہو گئی۔ نظریہ سازی کے میدان میں اُنھوں نے "جست" کا نظریہ پیش کیا، بعینہٖ تنقید کے سلسلے میں امتزاجی تنقید کے نظریے کی داغ بیل ڈالی۔ دوسری طرف اُن کی نظموں میں موجود عمودی اور اُفقی سوچ، باطنی تجربے، عمیق مشاہدے اور تخلیقی اُپج نے انھیں بین الاقوامی سطح پر ایک صاحب طرز نظم گو شاعر کی حیثیت سے استحکام بخشا۔ علوم کی مختلف شاخوں مثلاً فلسفہ، بشریات، حیاتیات، عمرانیات، سائنسیات، طبیعات، فلکیات، لسانیات، تاریخ تہذیب اور جدید تنقیدی دبستانوں کے ہمہ جہتی مطالعے کے نتیجے میں انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا کہ جن کو گرفت میں لینے کے لیے قاری کا صاحبِ علم ہونا ازبس ضروری ہے۔ ان کی غیر معمولی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف اُردو کے تمام اہم ادیبوں اور نقادوں نے واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔

درحقیقت اُن کی ہر تحریر سوچ کے نئے در وا کرتی تھی اور قارئین ادب کی ذہنی سیرابی کا باعث بنتی تھی، مگر اُن کی تحریر کردہ کتابوں میں سے کچھ کتابیں اردو ادب کی تاریخ میں سنگ ہائے میل کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کتابوں میں "اردو ادب میں طنز و مزاح"، "نظم جدید کی کروٹیں"، "اردو شاعری کا مزاج"، "تخلیقی عمل"، "تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں"، "سائنسیات اور سائنس"، "معنی اور تناظر"، "دستک اس دروازے پر"، "دوسرا کنارہ"، "سمندر اگر میرے اندر گرے"، "آدھی صدی کے بعد" اور "ایک کتھا انوکھی" شامل ہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں کو پڑھے بغیر جدید اردو ادب کا مطالعہ کسی صورت میں مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مجھے کامل یقین ہے کہ ان کے اعلیٰ پائے کے علمی اور ادبی کام سے کسب فیض کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ جامعات میں اِن کی شاعری، تنقید اور انشائیہ نگاری پر پی ایچ ڈی کی سطح کا کام آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ اور سرکاری ادبی ادارے ان کی کتب کی اشاعت نیز ان کے علمی اور ادبی سرمائے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا خصوصی اہتمام بھی کریں گے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

بنیادی کوائف وسوانحی خاکہ
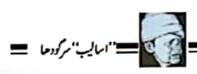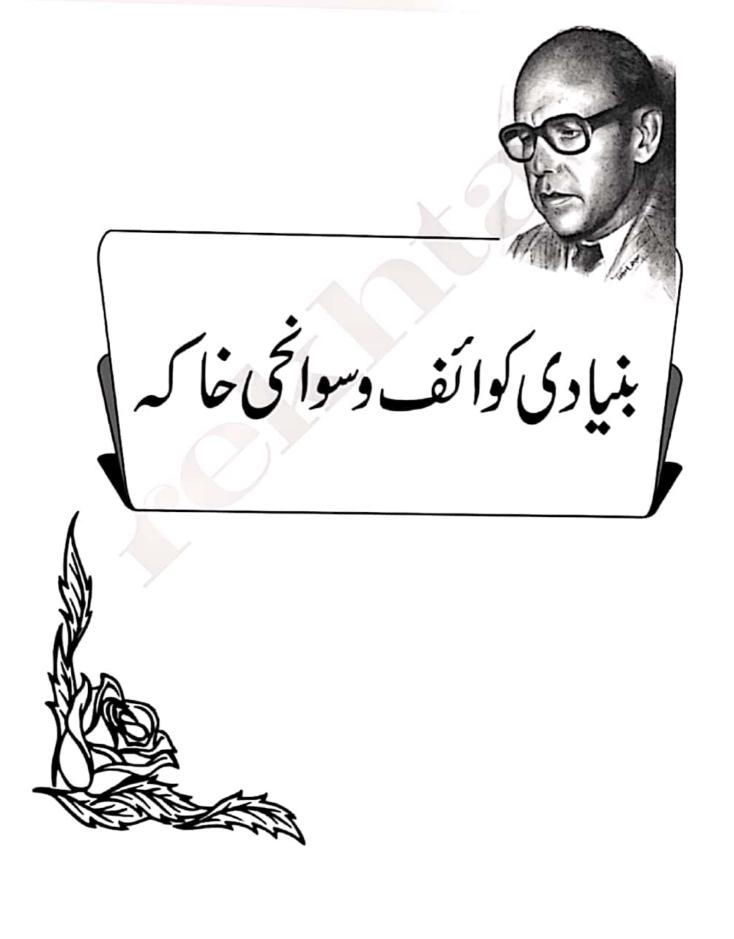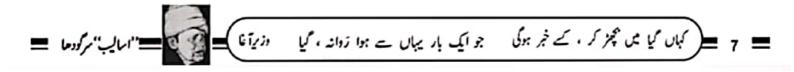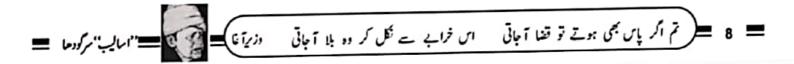
ڈاکٹر وزیر آغا: بنیادی معلومات

تحقیق و ترتیب: طارق حبیب
لیکچرار شعبہ اردو یونی ورسٹی آف سرگودھا

نام : وزیرآغا
قلمی نام : وزیرآغا
کچھ عرصہ نصیرآغا اور نصرت آرا نصرت کے نام سے بھی لکھتے رہے۔
مذہب : اسلام
تاریخِ پیدائش : ۱۸۔مئی۱۹۲۲ء/ ۲۱۔رَمَضانُ المبارک۱۳۴۰ھ۔جمعرات]
جائے پیدائش : وزیرکوٹ۔تحصیل وضلع سرگودھا۔پنجاب۔پاکستان
والد کا نام : آغا وسعت علی خان
[پیدائش:۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۷ھ۔
وفات :۸۔جنوری۱۹۷۰ء/ ۲۹۔شوال المکرم۱۳۸۹ھ۔جمعرات]
والدہ کا نام : حیدری بیگم
[وفات:۲۳۔اپریل۱۹۶۶ء/ ۴۔محرم الحرام۱۳۸۵ھ۔اتوار]
دادا کا نام : آغا وزیر علی خان
نانا کا نام : مہدی حسین شاہ کاظمی
تعلیم : پی ایچ ڈی (اُردو) ۱۹۵۶ء۔پنجاب یونی ورسٹی لاہور
موضوع : اُردو ادب میں طنز ومزاح
نگران : ڈاکٹر عبادت بریلوی
ایم اے (معاشیات) ۱۹۴۳ء
گورنمنٹ کالج لاہور،منسلک: پنجاب یونی ورسٹی لاہور
بی اے ۱۹۴۱ء۔گورنمنٹ کالج لاہور
انٹرمیڈیٹ ۱۹۳۹ء۔گورنمنٹ کالج جھنگ
[کالج میں اوّل پوزیشن]
میٹریکولیشن ۱۹۳۷ء۔
گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا
زبانیں : پنجابی مادری زبان۔اُردو۔انگریزی۔فارسی
[پردادا ایران سے ہجرت کرکے آئے تھے۔والد گھر میں فارسی بولتے تھے۔خود ڈاکٹر وزیرآغا نے فارسی علم وادب کے مطالعات بھی کیے۔]
ذریعۂ روزگار : کاشت کاری
ادارت وصحافت: شریک مدیر: مجلّہ ''ادبی دُنیا''، لاہور ۱۹۶۰ء۔۱۹۶۳ء
مدیر: مجلّہ ''اوراق''، لاہور ۱۹۶۵ء۔۲۰۰۵ء
شادی : ۱۸۔اپریل۱۹۴۹ء/ ۱۹۔جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ۔سوموار
سُسر کا نام : مرزا انور علی
بیوی کا نام : صفیہ آغا
[تاریخ پیدائش:۱۹۳۱ء/ ۱۳۴۹۔۱۳۵۰ھ
تاریخ وفات:۱۳۔اپریل۲۰۰۴ء/ ۲۱۔صفر المظفر ۱۴۲۵ھ۔سوموار]

اولاد : ایک بیٹی اور ایک بیٹا
بیٹی کا نام : وقارالنسا
[پیدائش:۵۔اکتوبر۱۹۵۲ء/ ۱۵۔محرم الحرام۱۳۷۲ھ۔اتوار۔
جائے پیدائش:لاہور۔تعلیم:بی اے۔
نکاح: فروری۱۹۷۲ء۔ رُخصتی: جنوری۱۹۷۴ء]
بیٹے کا نام : سلیم آغا قزلباش
[پیدائش:۲۳۔نومبر۱۹۵۶ء/ ۱۸۔ربیع الثانی۱۳۷۶ھ۔جمعرات
جائے پیدائش:لاہور۔]
[تعلیم:پی ایچ ڈی (اُردو)۔ ۱۹۹۶ء۔پنجاب یونی ورسٹی لاہور
ایم اے (اُردو)۔۱۹۷۹ء۔اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی]
داماد کا نام : ملک زوار علی [۱۴۔اگست۱۹۴۷ ـــــ ۱۴۔جولائی۱۹۸۸ء]
اسفار : بھارت ۱۹۶۳ء۔۱۹۸۰ء۔۱۹۸۲ء۔۱۹۸۹ء۔
انگلستان ۱۹۸۷ء
سویڈن ۱۹۹۴ء
تاریخِ وفات : ۷۔ستمبر۲۰۱۰ء۔منگل۔رات ساڑھے گیارہ بجے
بمطابق ۲۷اور ۲۸ رَمَضانُ المبارک۱۴۳۱ھ کی درمیانی شب
مقامِ وفات : نیشنل ہسپتال،ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی،لاہور کینٹ
نمازِ جنازہ : ۸۔ستمبر۲۰۱۰ء/ ۲۸۔رَمَضانُ المبارک۱۴۳۱ھ۔بدھ
ساڑھے چار بجے۔بوقتِ عصر۔بہ مقام: وزیرکوٹ،ضلع سرگودھا
جنازے میں شرکا: سینکڑوں لوگ نمازِ جنازہ اور تدفین کے مراحل میں شریک ہوئے۔
انجم رعارف، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر رشید امجد، منشایاد، جلیل عالی، شاہد شیدائی، اقتدار جاوید، شاہد بخاری، علی محمد فرشی، انور محمود خالد اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے علاوہ سرگودھا کے بیش تر اہلِ قلم نے شرکت کی۔
تدفین : ۸۔ستمبر۲۰۱۰ء/ ۲۸۔رَمَضانُ المبارک۱۴۳۱ھ۔بدھ۔شام ۵بجے
مقامِ تدفین : ڈاکٹر وزیرآغا کو وزیرکوٹ،تحصیل وضلع سرگودھا میں اُن کے آبائی گھر کے پچھلے احاطے میں اپنی اہلیہ مرحومہ کے دائیں پہلو میں دفن کیا گیا۔
عرصۂ حیات : ۸۸ برس۔۳ ماہ۔۲۰ دن (شمسی)
۹۱ برس۔۷ دن (قمری)
یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر وزیرآغا کی پیدائش اور وفات دونوں ہی رَمَضانُ المبارک میں ہوئیں۔
رسمِ سوئم : ۱۲۔ستمبر۲۰۱۰ء۔اتوار/ ۲۔شوال المکرم۱۴۳۱ھ۔گیارہ بجے دن
بہ مقام: وزیرکوٹ،ضلع سرگودھا
رسمِ چہلم : ۳۔اکتوبر۲۰۱۰ء۔اتوار/ شوال المکرم۱۴۳۱ھ۔گیارہ بجے دن
بہ مقام: وزیرکوٹ،ضلع سرگودھا

تحقیقی ریفرنسز: ۲۰۔ستمبر ۲۰۱۰ء۔مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد
۲۶۔ستمبر ۲۰۱۰ء۔قائدِ اعظم لائبریری لاہور
۲۶۔ستمبر ۲۰۱۰ء۔شعبۂ اُردو: یونی ورسٹی آف سرگودھا
۱۰۔اکتوبر ۲۰۱۰ء۔ایوانِ اقبال۔زیرِ اہتمام: حلقۂ اربابِ ذوق لاہور
۔اکتوبر ۲۰۱۰ء۔انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی
۳۱۔اکتوبر ۲۰۱۰ء۔زیرِ اہتمام: سرگودھا رائٹرز کلب سرگودھا
۱۰۔نومبر ۲۰۱۰ء۔قائدِ اعظم لاء کالج سرگودھا

اعزازات : تمغۂ امتیاز ۲۳۔مارچ ۱۹۸۵ء
ستارۂ امتیاز ۲۳۔مارچ ۱۹۹۹ء
مسعود کھدر پوش ادبی ایوارڈ ۲۰۰۴ء

❀❀❀

ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات:

اُردو شعری مجموعے:

۱۹۶۴ء

۱۔ ''شام اور سائے''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: اکتوبر ۱۹۶۴ء، لاہور، جدید ناشرین،
طبع ثانی: ۱۹۸۵ء، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان، ریلوے روڈ

۱۹۶۹ء

۲۔ ''دن کا زرد پہاڑ''، (نظمیں اور غزلیں)، طبع اوّل: جنوری ۱۹۶۹ء، لاہور، جدید ناشرین، چوک اُردو بازار،

۱۹۷۳ء

۳۔ ''غزلیں''، (۱۹۷۲ء تک کہی گئی تمام غزلیں)، طبع اوّل: ۱۹۷۳ء، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان، ریلوے روڈ، طبع دوم: ۱۹۷۹ء،

۱۹۷۹ء

۴۔ ''نردبان''، (نظمیں)، طبع اوّل: جنوری ۱۹۷۹ء، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان،

۱۹۸۱ء

۵۔ ''آدھی صدی کے بعد''، (طویل نظم)، طبع اوّل: ۱۹۸۱ء، لاہور، مکتبۂ فکر و خیال،
طبع دوم (ہندی): ۱۹۸۳ء، طبع سوم (اُردو): ۱۹۸۸ء،
طبع چہارم (اُردو): جون ۱۹۸۹ء، لاہور، مکتبۂ فکر و خیال، اقبال ٹاؤن،
''آدھی صدی کے بعد'' (انگریزی: اشاعت اوّل)، ۱۹۸۹ء،
ترجمہ: راجندر سنگھ ورما، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی،
''آدھی صدی کے بعد'' (ڈینش ترجمہ)، از: نصیر ملک، ۱۹۹۸ء،
''اَدھی صدی پچھوں'' [پنجابی ترجمہ]، مترجم: راز سنتو کھ سری، طبع اوّل: ۱۹۹۴ء،

۱۹۸۵ء

۶۔ ''گھاس میں تتلیاں''، (غزلیں، نظمیں، طویل نظمیں)
طبع اوّل: جولائی ۱۹۸۵ء، لاہور، مکتبۂ فکر و خیال، ۲۷۱۔ستلج بلاک اقبال ٹاؤن ۱۹۹۰ء،

۷۔ ''اِک کتھا انوکھی''، (نظمیں، غزلیں)، طبع اوّل: اگست ۱۹۹۰ء، لاہور، مکتبۂ فکر و خیال، ۲۷۱۔ستلج بلاک اقبال ٹاؤن،
''اِک کتھا انوکھی''، انگریزی ترجمہ، از: وزیر آغا، ۱۹۹۲ء، لاہور، مکتبۂ فکر و خیال،
''اِک کتھا انوکھی'' (یونانی ترجمہ) ترجمہ Danae Papastratou، ۱۹۹۴ء،
''اِک کتھا انوکھی'' (سویڈش ترجمہ)، مترجم: Eva M Alander، ۱۹۹۵ء،

۱۹۹۱ء

[۱۹۹۰ء تک شائع ہونے والے درج بالا ساتوں شعری مجموعے: ۱۹۹۱ء میں ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' کے نام سے ایک ہی جلد میں پیش کیے گئے۔]

۱۹۹۵ء

۸۔ ''یہ آواز کیا ہے''، (نظمیں اور غزلیں)، طبع اوّل: ۱۹۹۵ء، سرگودھا، مکتبۂ نردبان،

۱۹۹۷ء

۹۔ ''عجب اک مسکراہٹ''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: مارچ ۱۹۹۷ء، سرگودھا، مکتبۂ نردبان، ۱۰۹۔اولڈ سول لائنز،

۱۹۹۸ء

[۱۹۹۷ء تک تمام مطبوعہ غزلیات ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' کے نام سے ایک ہی جلد میں پیش کی گئیں۔ تفصیل آگے موجود ہے۔]

۱۹۹۹ء

۱۰۔ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ''، (نظمیں)، طبع اوّل: اگست ۱۹۹۹ء، لاہور،

۲۰۰۰ء

[۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک پنجابی شعری مجموعہ: ''چھج تاریاں دا'' شائع ہوا، تفصیل آگے ''پنجابی شاعری'' کے ضمن میں دی گئی ہے۔]

۲۰۰۱ء

۱۱۔ ''ہم آنکھیں ہیں''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: جون ۲۰۰۱ء، لاہور،

۲۰۰۳ء

[۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک پنجابی شعری مجموعہ: ''واجاں باجھ جھوڑے'' شائع ہوا، جس پر انھیں ''مسعود کھدر پوش ادبی ایوارڈ'' دیا گیا۔ تفصیل آگے موجود ہے۔]

۱۲۔ ''دیکھ دھنک پھیل گئی''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: مئی ۲۰۰۳ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۰۵ء

۱۳۔ ''چٹکی بھر روشنی''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: جولائی ۲۰۰۵ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۰۹ء

۱۴۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو''، (نظمیں)، اشاعت اوّل: جنوری ۲۰۰۹ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۱۰ء

۱۵۔ ''کاسۂ شام''، (نظمیں)، از: وزیر آغا، زیرِ طبع، لاہور، کاغذی پیرہن،

پنجابی شعری مجموعہ:

۲۰۰۰ء

۱۔ ''چھج تاریاں دا''، (نظماں، غزلاں)، پہلی وار: یکم جنوری ۲۰۰۰ء، لاہور، پنجابی پبلی کیشنز، ۳۹۔فیروز پور روڈ اچھرہ،

۲۰۰۳ء

۲۔ ''واجاں باجھ جھوڑے''، (نظماں، غزلاں)، اشاعت اوّل: جنوری ۲۰۰۳ء، لاہور، کاغذی پیرہن، ۲۷۔بیڈن روڈ،

شاعری کا انتخاب:

۱۹۷۴ء

۱۔ ''وزیر آغا کی نظمیں''، (انتخاب)، مرتبہ: غلام حسین اظہر، طبع اوّل: مارچ ۱۹۷۴ء،

سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان،

۲۰۰۱ء

۲۔ ''برکھا بھیگے خوابوں کی (وزیر آغا کی منتخب نظمیں)''، انتخاب: نجمہ منصور، اشاعت اوّل: مئی ۲۰۰۱ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۰۷ء

۳۔ ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں (وزیر آغا کی منتخب نظمیں)''، انتخاب و ترتیب: فیصل ہاشمی، اشاعت اوّل: ۲۰۰۷ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

تنقید:

۱۹۵۸ء

۱۔ ''اُردو ادب میں طنز و مزاح''، اشاعت اوّل: ۱۹۵۸ء، لاہور، اکادمی پنجاب،
[یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس پر ۱۹۵۶ء میں ڈگری دی گئی۔]
تیسرا ایڈیشن: ۱۹۷۷ء، چوتھا ایڈیشن: ۱۹۸۴ء، پانچواں ایڈیشن: ۱۹۸۷ء،
چھٹا ایڈیشن: ۱۹۹۳ء، لاہور، مکتبہ عالیہ، اُردو بازار، ناشر: الطاف حسین،

۱۹۶۳ء

۲۔ ''نظمِ جدید کی کروٹیں''، از: وزیر آغا، طبع اوّل: ۱۹۶۳ء لاہور، ادارۂ ادبی دُنیا،
دوسرا ایڈیشن: ۱۹۷۴ء، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، تیسرا ایڈیشن: ؟
چوتھا ایڈیشن: ۲۰۰۷ء، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۵۔ سی لوئر مال،

۱۹۶۵ء

۳۔ ''اُردو شاعری کا مزاج''، اشاعت اوّل: ۱۹۶۵ء، لاہور، جدید ناشرین، چوک اُردو بازار،
اشاعت دوم: ۱۹۷۵ء،
گیارھواں ایڈیشن (مکتبہ عالیہ کے تحت چھٹا ایڈیشن): ۱۹۹۹ء، لاہور، مکتبہ عالیہ،
''اُردو شاعری کا مزاج''، [مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کے تحت]
اشاعتِ اوّل: مئی ۲۰۰۸ء/ جمادی الاوّل ۱۴۲۹ھ، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،

۱۹۶۸ء

۴۔ ''تنقید اور احتساب''، طبع اوّل: ۱۹۶۸ء، لاہور، جدید ناشرین، چوک اُردو بازار،

۱۹۷۰ء

۵۔ ''تخلیقی عمل''، پہلی بار: اکتوبر ۱۹۷۰ء، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان،

۱۹۷۲ء

۶۔ ''نئے مقالات''، فروری ۱۹۷۲ء، طبع اوّل، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان،

۱۹۷۶ء

۷۔ ''تنقید اور مجلسی تنقید''، پہلی بار: جنوری ۱۹۷۶ء، سرگودھا، مکتبۂ اُردو زبان،
طبع دوم: ۱۹۸۱ء، لاہور، آئینۂ ادب،
طبع سوم: اگست ۲۰۰۹ء، لاہور، القمر انٹرپرائزز،

۱۹۷۷ء

۸۔ ''تصوّراتِ عشق و خرد: اقبال کی نظر میں''، طبع اوّل: ۱۹۷۷ء، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان،
طبع دوم: ۱۹۸۷ء، لاہور، طبع سوم: ۱۹۹۴ء، طبع چہارم: ۲۰۰۰ء، طبع پنجم: ۲۰۰۸ء،
طبع ششم: ۲۰۱۰ء، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۸ ص

۱۹۷۹ء

۹۔ ''نئے تناظر''، بار اوّل: ۱۹۷۹ء، الٰہ آباد (بھارت)، اُردو رائٹرز گلڈ،
طبع دوم (پاکستان میں پہلی بار): ۱۹۸۱ء، لاہور، آئینۂ ادب، چوک مینار انارکلی،

۱۹۸۶ء

۱۰۔ ''دائرے اور لکیریں''، طبع اوّل: فروری ۱۹۸۶ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال،

۱۹۸۹ء

۱۱۔ ''تنقید اور جدید اُردو تنقید''، اشاعت اوّل: ۱۹۸۹ء، کراچی، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان،

۱۹۹۰ء

۱۲۔ ''انشائیہ کے خدوخال''، طبع اوّل: ۱۹۹۰ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال،

۱۹۹۱ء

۱۳۔ ''ساختیات اور سائنس''، طبع اوّل: نومبر ۱۹۹۱ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال،
۱۴۔ ''مجید امجد کی داستانِ محبت''، از: ڈاکٹر وزیر آغا، بار اوّل: نومبر ۱۹۹۱ء، لاہور،

۱۹۹۷ء

۱۵۔ ''غالب کا ذوقِ تماشہ''، از: ڈاکٹر وزیر آغا، طبع اوّل: ۱۹۹۷ء، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان،

۱۹۹۸ء

۱۶۔ ''معنی اور تناظر''، از: وزیر آغا، طبع اوّل: ۱۹۹۸ء، سرگودھا، مکتبۂ اردو زبان،
بھارت سے اشاعت اوّل: ۲۰۰۰ء، نئی دہلی، انٹرنیشنل اُردو پبلی کیشنز،

۲۰۰۶ء

۱۷۔ ''امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر''، از: وزیر آغا، طبع اوّل: ۲۰۰۷ء، لاہور، اُردو سائنس بورڈ،

۲۰۰۹ء

۱۸۔ ''کلچر کے خدوخال''، از: وزیر آغا،
اشاعت اوّل: مئی ۲۰۰۹ء/ جمادی الاوّل ۱۴۳۰ھ، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،
۱۹۔ ''اُردو ادب میں عورت کا سماجی کردار''، از: ڈاکٹر وزیر آغا، سالِ اشاعت: ؟، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ؟

تنقیدی مضامین کا انتخاب:

۱۹۹۵ء

۱۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین (ایک انتخاب)''، مرتب: سجاد نقوی، اشاعت اوّل: ۱۹۹۵ء، لاہور، مکتبہ عالیہ،

۲۰۰۷ء

۲۔ ''میراجی بہ حوالہ ڈاکٹر وزیر آغا''، [میراجی پر ڈاکٹر وزیر آغا کے پانچ مقالات]، مشمولہ: ''شبیہ''، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، خوشاب، سہ ماہی، جلد: ۱۶، شمارہ: ۱،۲، سلسلۂ متن کا ایک خاص شمارہ، مدیر: طارق حبیب،

۲۰۱۰ء

۳۔ ''کشفِ ذات کی آرزو کا شاعر (ن م راشد پر ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالات)''، تحقیق و تجزیہ: طارق حبیب، اشاعت اوّل: ۲۰۱۰ء، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، [ن م راشد اور ڈاکٹر وزیر آغا کے تعارفی اشاریے اور تجزیاتی مطالعے کے ساتھ]

انشائیہ نگاری:

۱۔ ''خیال پارے''، طبع اوّل: ۱۹۶۱ء، لاہور، اکادمی پنجاب،
۲۔ ''چوری سے یاری تک''، طبع اوّل: ۱۹۶۶ء، لاہور، جدید ناشرین،
۳۔ ''دوسرا کنارہ''، طبع اوّل: ۱۹۸۲ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال،

۴۔ ''سمندر اگر میرے اندر گرے''،طبع اوّل:۱۹۸۹ء،لاہور،
[''پگ ڈنڈی سے روڈ رولر تک'' اور'' پگ ڈنڈی'' انشائیوں کی کلیات ہیں،
جن کی تفصیل ''کلیات'' کے تحت دی گئی ہے۔]

سفرنامہ نگاری:

۱۔ ''تمّن سفر''،باراوّل:۱۹۹۶ء،سرگودھا،مکتبہ نردبان،۹۔اولڈ سول لائنز،

آپ بیتی:

۱۔ ''شام کی منڈیر سے''،اشاعت اوّل:۱۹۸۶ء،لاہور،مکتبہ عالیہ،
اشاعت دوم(دوسرے حصے کے اضافے کے ساتھ)،۲۰۰۹ء،لاہور،اظہار سنز،

یادنگاری:

۱۔ ''شام دوستاں آباد''،طبع اوّل:۱۹۷۶ء،لاہور،مکتبہ عالیہ،اُردو بازار،
طبع دوم:۱۹۹۴ء،لاہور،مکتبہ عالیہ،اُردو بازار،

فکروفلسفہ:

۱۔ ''مسرت کی تلاش''،اشاعت اوّل:جنوری ۱۹۵۴ء،
۲۔ ''دستک اُس دروازے پر''،طبع اوّل:جون ۱۹۹۳ء،لاہور،مکتبہ فکروخیال،

اوراق کے اداریے:

۱۔ ''پہلا ورق(ڈاکٹر وزیر آغا کے قلم سے ''اوراق'' کے لیے لکھے گئے اداریوں کا مجموعہ)''،
مرتبین:حیدر قریشی،راغب شکیب،اشاعت اوّل:جنوری ۱۹۹۰ء،کراچی،
مکتبہ ہم زبان،
۲۔ ''اوراق کے اداریے(اوراق کے پینتیس سال)''،
ترتیب و تدوین: پروفیسر اقبال آفاقی، (۱۹۶۶ء سے فروری ۲۰۰۰ء تک کے
اداریے)،
اشاعت اوّل:اکتوبر ۲۰۰۰ء،لاہور،کاغذی پیرہن،

دیباچے:

۱۔ ''وزیر آغا کے دیباچے''،از:وزیر آغا،مرتبہ:ڈاکٹر سید احسن زیدی،
باراوّل:جنوری ۱۹۹۰ء،فیصل آباد،نگ پوائنٹ کارنر ہاؤس،بھوانہ بازار،

انٹرویوز:

۱۔ ''مکالمات[وزیر آغا سے]''،مرتبہ:ڈاکٹر انور سدید،طبع اوّل:اکتوبر ۱۹۹۱ء،
لاہور،مکتبہ فکروخیال،
۲۔ ''نئے مکالمات[گزشتہ بیس سال کے عرصے پر پھیلے وزیر آغا کے انٹرویو]''،
تہذیب وترتیب:شاہد شیدائی،عابد خورشید،اشاعت(اوّل):جولائی ۲۰۱۰ء،
لاہور،جمہوری پبلی کیشنز،[وزیر آغا کی اٹھاسیویں سالگرہ پر]،

مکاتیب:

۱۔ ''وزیر آغا کے خطوط:انور سدید کے نام''،مرتب:انور سدید،طبع اوّل:مارچ ۱۹۸۵ء،
لاہور،مکتبہ فکروخیال،
۲۔ ''وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام''،مرتبہ:اکبر حمیدی،
اشاعت اوّل:۱۹۹۵ء،اسلام آباد،بُک پبلشرز،
[ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط اوران کے نام دیگر مشاہیر کے خطوط پر ایک ضخیم کتاب کا
مواد موجود اور منتظر اشاعت ہے۔ اِن مشاہیر میں رشید احمد صدیقی،کنھیا لال کپور،شاد امرت سری،فراق گورکھ پوری،مولانا صلاح الدین احمد،ن م راشد،ابن انشا،قیوم نظر،ممتاز مفتی،سلام مچھلی شہری،سید علی عباس جلال پوری،راجہ مہدی علی خاں،احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹر جمیل جالبی،سید عابد علی عابد،مظفر علی سید،ڈاکٹر وحید قریشی،ڈاکٹر عبادت بریلوی،خلیل الرحمان اعظمی،شمس الرحمان فاروقی،حمایت علی شاعر،غلام جیلانی اصغر،ڈاکٹر داؤد راہبر،سید ضمیر جعفری،ریاض احمد،نظیر صدیقی،مشفق خواجہ،فتح محمد ملک،ظہور نظر،جوگندر پال،ستار طاہر،انور جمال،رام لعل،گوپی چند نارنگ،منظر علی خاں منظر،عبدالشکور،جعفر طاہر،اکبر حمیدی،رشید امجد،بلراج کومل،رشید نثار،عرش صدیقی،رضی الدین رضی،فکر تونسوی،اُسلوب احمد انصاری،ڈاکٹر فہیم حنفی،ڈاکٹر انور سدید،عبدالعزیز خالد،غلام حسین اظہر،غلام الثقلین نقوی،نظام صدیقی،عارف عبدالمتین،ریاض صدیقی،ساقی فاروقی،ظفر اقبال،رب نواز مائل،علی اعظم بخاری،اوراظہر نا سک وغیرہ شامل ہیں۔]

ترتیب وتدوین:

۱۔ ''۱۹۵۸ء کی بہترین نظمیں''،انتخاب:وزیر آغا،لاہور،اکادمی پنجاب،
۲۔ ''۱۹۵۹ء کی بہترین نظمیں''،انتخاب:وزیر آغا،لاہور،اکادمی پنجاب،
۳۔ ''۱۹۶۰ء کی بہترین نظمیں''،انتخاب:وزیر آغا،لاہور،اکادمی پنجاب،
۴۔ ''۱۹۶۱ء کی بہترین نظمیں''،انتخاب:وزیر آغا،لاہور،اکادمی پنجاب،
۵۔ ''عبدالرحمٰن چغتائی:شخصیت اور فن''،طبع اوّل:مئی ۱۹۸۰ء،لاہور،
لاہور،مجلس ترقی ادب/ اشاعت دوم:۲۰۰۹ء،
۶۔ ''انتخاب نظم جدید''،مرتبہ:ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر انور سدید،سجاد نقوی،
اشاعت اوّل:۱۹۸۱ء،کراچی،انجمن ترقی اُردو،
۷۔ ''مولانا صلاح الدین احمد(فن اور شخصیت)''،
مرتبین:ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر انور سدید،اشاعت اوّل:۱۹۹۰ء،کراچی،
انجمن ترقی اُردو،

کلیات:

۱۹۷۳ء
۱۔ ''غزلیں''،(۱۹۷۲ء تک کی تمام غزلیں)،اشاعت اوّل:۱۹۷۳ء،لاہور،

۱۹۹۱ء
۲۔ ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل''،(۱۹۹۰ء تک تمام نظمیں اور غزلیں)،
اشاعت اوّل:۱۹۹۱ء،لاہور،
۳۔ ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل''،(کلیاتِ غزل)اشاعت اوّل:۱۹۹۱ء،لاہور،
مکتبہ فکروخیال،

۱۹۹۸ء
''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل''،(کلیاتِ غزل)،اشاعت دوم:نومبر ۱۹۹۸ء،
لاہور،کتب نما،

۲۰۰۷ء
''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل''،(کلیاتِ غزل)،اشاعت سوم:۲۰۰۷ء،
لاہور،اظہار سنز،

۱۹۹۵ء
۴۔ ''پگڈنڈی سے روڈ رولر تک(کُل انشائیے ایک جلد میں)''،
طبع اوّل:جون ۱۹۹۵ء،سرگودھا،مکتبہ نردبان،۹۔اولڈ سول لائنز،

۲۰۱۰ء
''پگ ڈنڈی''،(انشائیوں کا مجموعہ)،۲۰۱۰ء،لاہور،اظہار سنز،
اشاعت دوم(ترمیم واضافے کے ساتھ)،اظہار سنز لاہور سے طبع اوّل،

Naseer Malik,

13. Selected Poems of Wazir Agha, English, 1998, Lahore,
Maktaba Auraq, 115/3 Sarwar Raod,
Introduction: Prof. Magnus Rohi, Head: Deptartment of Literature,

1999

14. Poems and Haiku Poems, English, 1999,
Translated by: Wazir Agha,

2000

15. "IS ANY ONE OUT THERE?",
(A Bouquet of Poems For the New Year), 1st Ed: 2000
Authored and Translated by: WAZIR AGHA, Lahore,
Kaghadhi Paerahen,

2001

16. "LET THE STRINGS VIBRATEI",
(A Bouquet of Poems For the New Year), 1st Ed: 2001
Authored and Translated by: WAZIR AGHA, Lahore,
Kaghadhi Paerahen,

2002

17. Haiku, Greek, International Anthology, 2002, Ten Haikus,
Translated by: Zoe Savina

18. Siscrive, Italian, World Anthology, 2002, Twenty Poems ,
Translated by: Bruno Rombi,

2003

19. Late Showers, English, 2003, Translated by: Wazir Agha,

2004

20. Selected Poems and Haiku, Norwegian, 2004,
Selected by: Afzal Abbas and Paul Erik Norton,

2005

21. Qnros, Greek, International Anthology, 2005,(3 Poems)
Translated by: Zoe Savina

22. Babilonia, Italian, World Anthology, 2005, Four Poems ,
Translated by: Bruno Rombi,

۶۔ ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل''، (کلیاتِ نظم مع تمام طویل نظمیں)، زیرِ طبع،

❀❀❀

وزیر آغا کی نظموں کے مختلف زبانوں میں تراجم:

1978

1. Selected Poems of Wazir Agha, English,
Selected by: Jamil Azar , Mushtaq Qamar
1978, Sargodha, Maktaba e Urdu Zuban,

۱۹۸۰ء

۲۔ ''چھڑو دیاں کلماں''، [وزیر آغا کی نظموں کا سرائیکی میں ترجمہ]،
طبع اول: ۱۹۸۰ء، خان پور، جدید پبلی کیشنز،

۱۹۸۳ء

۳۔ ''آدھی صدی کے بعد''، [ہندی میں ترجمہ]، از: ش ک نظام
طبع اول: ۱۹۸۳ء، انڈیا،

1989

4. Half a Century Later, English,
Translated by: Rajinder Singh Verma,
1st Ed: 1989, Lahore, Maghrabi Pakistan Urdu Acadamy,

1992

5. A Tale So Strange, English, Translated by: Wazir Agha,
1st Ed: 1992, Lahore, Maktaba e Fikr o Khayal,

6. Seven Poems of Wazir Agha, English, Translated by:
Azad Gulati, 1st Ed: 1992,

1994

7. A Tale So Strange, Greek, 1994, Translated by:
Danae Papastratou,

8. Winds of Fire, English, 1994, Translated by:
Muzaffar A Ghaffar,

۱۹۹۴ء

۹۔ ''آدھی صدی پچھوں''، [پنجابی ترجمہ]، مترجم: راز سنتوکھ سری، طبع اول: ۱۹۹۴ء،

1995

10. A Tale So Strange, Swedish, Translated by:
Eva M Alander, 1st Ed: 1995,

1997

11. Poems, Mild and Mellows, English, Translated by:
Satyapal Anand, 1st Ed: 1997,

1998

12. Half a Century Later, Danish, 1998, Translated by:

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدی کتاب کا ترجمہ:

۱۹۸۷ء

۱۔ ''اُردو شاعری کا مزاج'' از: ڈاکٹر وزیر آغا، ہندی میں ترجمہ: سیمانت پرکاش، اشاعت اوّل: ۱۹۸۷ء، انڈیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا ترجمہ:

2005

1. Selected Light Essays, English, By: Jai Rattan , 1st: 1995

ڈاکٹر وزیر آغا پر لکھی جانے والی باقاعدہ کُتب:

[سالِ اشاعت کے اعتبار سے]

۱۹۸۳ء

۱۔ ''وزیر آغا: ایک مطالعہ''، مرتبہ: انور سدید، طبع اوّل: ۱۹۸۳ء، کراچی، مکتبۂ اُسلوب،

۱۹۸۷ء

۲۔ ''اُردو شاعری کا مزاج۔ معاصرین کی نظر میں''، مرتبہ: سجاد نقوی، طبع اوّل: ۱۹۸۷ء، سرگودھا، مکتبہ نردبان

۱۹۸۹ء

۳۔ ''شام کا سورج''، مرتبہ: انور سدید، طبع اوّل: جنوری ۱۹۸۹ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال

۱۹۹۳ء

۴۔ ''دن ڈھل چکا تھا''، از: ناصر عباس نیر، طبع اوّل: جون ۱۹۹۳ء، سرگودھا، مکتبہ نردبان

۱۹۹۵ء

۵۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا: عہد ساز شخصیت''، از: حیدر قریشی، اشاعت اوّل: ۱۹۹۵ء، خان پور، ضلع رحیم یار خان، ابتدائیہ: حیدر قریشی

۱۹۹۶ء

۶۔ ''وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی''، از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، طبع اوّل: ۱۹۹۶ء، راول پنڈی، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی (پیاس)،

۱۹۹۷ء

7. "Wazir Agha : In Recognition of his great services to Urdu Literature", Publishers: Sargodha Acadamy, Sargodha Writers Club and Sargodha Arts Council, 1997

۸۔ ''وزیر آغا اہلِ قلم کی نظر میں''، مرتبہ: گل بخشالوی، اشاعت (اوّل): ۱۹۹۷ء، کھاریاں، ناشر: قلم قافلہ ادبی ویلفیئر سوسائٹی،

۱۹۹۸ء

۹۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد''، از: ڈاکٹر رشید نثار، پہلی بار: ۱۹۹۸ء، راول پنڈی، ناشر: پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی (پیاس)

۲۰۰۱ء

۱۰۔ ''بیاضِ شب و روز''، از: ارمان نجمی، اشاعت: مارچ ۲۰۰۱ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۰۳ء

۱۱۔ ''امتزاجی تنقید کی شعریات''، از: رفیق سندیلوی، اشاعت اوّل: جولائی ۲۰۰۳ء، لاہور، کاغذی پیرہن،

۲۰۰۶ء

۱۲۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن'' [پاکستانی ادب کے معمار]، از: رفیق سندیلوی، اشاعت (اوّل): ۲۰۰۶ء، اسلام آباد، ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان،

۲۰۰۷ء

۱۳۔ ''وزیر آغا کی بائیس نظمیں''، مرتب: عابد خورشید، اشاعت اوّل: جنوری ۲۰۰۷ء، سرگودھا، مکتبہ نردبان، ۹۰۔ اولڈ سول لائنز،
[وزیر آغا کی ۲۲ نظموں کے تجزیاتی اور ایک نظم کا فیض کی نظم سے تقابلی مطالعہ]

زیرِ طبع:

۱۴۔ ''تنقیدات وزیر آغا کی متنوع جہات''، از: محمد رفیع ازہر، زیرِ طبع

❀❀❀

رسائل کے ''ڈاکٹر وزیر آغا نمبر'':

۱۔ ''الزبیر''، ''وزیر آغا نمبر''، مرتب: شہاب دہلوی، بہاول پور،

۲۔ ''آوازِ جرس'' ''وزیر آغا نمبر'' مرتبین: ظفر معین، افتخار ایلی، لاہور، آوازِ جرس پبلی کیشنز،

۳۔ ''تخلیقی ادب''، خصوصی گوشہ برائے ڈاکٹر وزیر آغا، مرتبہ: مشفق خواجہ، کراچی،

۴۔ ''سکائی لارک انٹرنیشنل'' (انگریزی)، ''وزیر آغا نمبر''، مرتب: بل دیو مرزا، انڈیا،

۵۔ ''طلوعِ افکار''، خصوصی گوشہ، مارچ ۱۹۸۳ء، کراچی،

۶۔ ''چہار سُو''، خصوصی گوشہ، جنوری ۱۹۹۴ء، مرتبہ: گلزار جاوید، راول پنڈی،

۷۔ ''تسطیر''، وزیر آغا کی نظموں کے مجموعے: ''یہ آواز کیا ہے؟'' کا خصوصی مطالعہ، اپریل تا ستمبر ۱۹۹۸ء، لاہور،

۸۔ ''تسطیر''، وزیر آغا کی نظموں کا خصوصی مطالعہ، جولائی اگست ۱۹۹۹ء، لاہور،

۹۔ ''کاغذی پیرہن''، ۲۰۰۷ء، لاہور، ''وزیر آغا نمبر''، مدیر: شاہد شیدائی،

۱۰۔ ''شبیہ''، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، خوشاب، سہ ماہی،
''میرا جی بہ حوالہ ڈاکٹر وزیر آغا'' [میرا جی پر ڈاکٹر وزیر آغا کے پانچ مقالات]، جلد: ۱۶، شمارہ: ۱، ۲، سلسلۂ متن کا ایک خاص شمارہ، مدیر: طارق حبیب، ۹۶ ص

۱۱۔ ''شعر و سخن''، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، مانسہرہ، سہ ماہی، ''وزیر آغا نمبر''، جلد: ۹، شمارہ: ۳۶، مدیر: جان عالم، ۱۰۸ ص

۱۲۔ ''اخبارِ اُردو''، اکتوبر ۲۰۱۰ء، اسلام آباد، ''گوشہ وزیر آغا''، نگران: افتخار عارف، مدیر: محمد اسلام نشتر، جلد: ۲۷، شمارہ: ۱۰، مضامین کی تعداد: ۹، ص: ۲۱ تا ۳۰،

۱۳۔ ''کاغذی پیرہن''، ۲۰۱۰ء، لاہور، ''وزیر آغا نمبر''، مدیر: شاہد شیدائی

۱۴۔ ''مخزن'' ۲۰۱۱ء، لاہور، ''گوشہ وزیر آغا''، جلد ۱۱، شمارہ ۱، مدیر: شہزاد احمد

❀❀❀

ڈاکٹر وزیر آغا پر لکھے گئے سندی تحقیقی مقالات

۱۔ ''وزیر آغا کا فن''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نگران: ڈاکٹر عبدالواسع، مملوکہ: بہار یونی ورسٹی، بھارت،

۲۔ ''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نگران: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مملوکہ: مارواڑی کالج بھاگل پور، بھارت،

۳۔ ''وزیر آغا کی تنقید''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نگران: ڈاکٹر وہاب اشرفی، مملوکہ: پٹنہ، بھارت،

۴۔ ''تنقید اور وزیر آغا کی تنقید''، از: شاذیہ عمیر، بھارت،

[اوائل ۲۰۱۰ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی (بھارت) سے اس کتاب کی اشاعت ''تنقید اور وزیر آغا کی تنقید'' کے نام ہی سے عمل میں آچکی ہے۔]

۵۔ ''وزیر آغا کی نظم نگاری''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۲۰۱۰ء، مقالہ نگار: محسن عباس، نگران: ڈاکٹر رشید امجد، مملوکہ: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، پاکستان

۶۔ ''وزیر آغا کا اُسلوبِ نثر''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، مقالہ نگار: عباس نیر، نگران: ؟، مملوکہ: پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، پاکستان،

۷۔ ''وزیر آغا بحیثیت نقاد''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، ۱۹۸۸ء، مقالہ نگار: محمد اسلم، نگران: محمد فخر الحق نوری، مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور

۸۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت شاعر''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، ۱۹۹۰ء، مقالہ نگار: اشتیاق اُحمد، نگران: محمد فخر الحق نوری، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

۹۔ ''وزیر آغا کی نظموں کے انگریزی تراجم''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ ایم اے (اُردو)، ۲۰۰۰ء، مقالہ نگار: نعیم اُحمد، نگران: سجاد حسین شیرازی، گورنمنٹ کالج سرگودھا، مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور

۱۰۔ ''وزیر آغا کی تنقید (۱۹۹۰ء کے بعد)، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، ۱۹۸۸ء، مقالہ نگار: صبوحی سیف، نگران: ڈاکٹر زاہد منیر عامر، مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی

۱۱۔ ''وزیر آغا کی اقبال شناسی''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، مقالہ نگار: مس رضوی، نگران: ؟، مملوکہ: اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، پاکستان

۱۲۔ ''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، مقالہ نگار: ارم ضیا، نگران: مملوکہ: پشاور یونی ورسٹی، پشاور، پاکستان،

۱۳۔ ''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری [بحوالہ چوری سے یاری تک]''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، مقالہ نگار: ؟، نگران: ؟، مملوکہ: اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، پاکستان،

۱۴۔ ''سرگودھا میں سفرنامہ نگاری کی روایت کا تجزیہ''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، تعلیمی میقات: ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۸ء، مقالہ نگار: کاشف علی، نگران: طارق حبیب، [ایک باب ڈاکٹر وزیر آغا سے متعلق] مملوکہ: یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، پاکستان، ص: ۳۵ تا ۵۱، ۱۳۵ص

۱۵۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدی جہات''، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے (اُردو) تعلیمی میقات: ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۸ء، مقالہ نگار: محمد رفیع، نگران: طارق حبیب مملوکہ: یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، پاکستان، ۲۵۲ص

۱۶۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات اور تنقید کے حوالے''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، ۲۰۱۱ء، مقالہ نگار، سعیدہ طاہر، نمل اسلام آباد

❁❁❁

ڈاکٹر وزیر آغا کا سوانحی خاکہ

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

پروفیسر/صدر نشین مسند ظفر علی خان، ادارہ علوم ابلاغیات،

جامعہ پنجاب قائداعظم کیمپس، لاہور

ڈاکٹر وزیر آغا کے اسلوب حیات کا دقت نظر سے مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان کی زندگی ایک خاص مدار کے تحت بسر ہوتی ہے، ایک ایسا مدار جس کا مسافر اس میں بند بھی ہے۔ اور آزاد بھی۔ قید ان معنوں میں کہ وہ زندگی کے بارے میں اپنی طے کردہ حدود Limitations کو پورے طور پر پابندی سے نبھاتا ہے۔ اور آزاد ان معنوں میں کہ وہ جب چاہتا ہے اپنے ان مداروں سے بے نیازی اور لاتعلقی کا اعلان کر کے اپنے رہوار حیات کو ایک نئی ایڑ بھی لگا دیتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ وزیر آغا نے جس صنف نثر کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی زندگی کی بہترین توانائیوں کو استعمال کیا ہے، وہی صنف نثر، ان کی ذات کے ساتھ اس طرح چپک کر رہ گئی ہے کہ وزیر آغا کے سوانحی حالات کا مطالعہ بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں اور ان کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی زندگی کا سفر بھی ایک انشائیے کے مانند ہے کہ جو اپنے مضمون کی وحدت کے حصار میں بند بھی ہے اور آزاد بھی۔

میں نے وزیر آغا کی زندگی کو ایک انشائیے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ کوئی دعوٰے محض نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت میں ان کی حیات مستعار کے موٹے موٹے پہلو قارئین کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن کے مطالعے کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میں اپنے دعویٰ میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

خاندانی پس منظر :

وزیر آغا کے آباؤ اجداد گھوڑوں کا کاروبار کرتے تھے ان کے پڑدادا جو ایران میں مقیم تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلہ میں افغانستان آ گئے تھے۔ جہاں سے ان کے صاجزادے حاجی وزیر خاں پشاور اور پشاور سے کچھ عرصہ بعد لاہور آ گئے تھے۔ لاہور میں ان کا قیام سلطان کی سرائے میں تھا۔ گھوڑوں کا ذوق رکھنے کے باعث بعض اہم انگریزوں کے دوست بن گئے۔ جن میں مشہور ناول نگار ڈیارڈ کپلنگ بھی شامل تھے۔ حاجی وزیر خاں جن دنوں لاہور میں تھے۔ کپلنگ ان ہی ایام میں لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں کام کرتے تھے لہا جاتا ہے کپلنگ کے ناول kim میں گھوڑوں کے جس سوداگر کا تذکرہ ہے۔ وہ کردار اس نے وزیر خاں کے کسی بھائی کی شخصیت سے اخذ کیا ہے۔ وزیر خاں کا خاندان معاشی اعتبار سے خاصا آسودہ حال تھا لیکن ان کے چھوٹے بھائی کی اچانک وفات نے ان کا دل کاروبار سے اچاٹ کر دیا جس کے نتیجے میں خاندان کی مالی حالت روز بروز کمزور ہونے لگی۔ نتیجتاً جب وزیر خاں اس صدمہ سے سنبھلے تو کاروبار قریباً ختم ہو چکا تھا۔ ان کا خاندان معاشی اعتبار سے پیچھے رہ گیا۔ ان حالات میں ان کے صاحب زادے وسعت علی خاں آگے بڑھے تو اتفاق سے ان ہی دنوں برطانوی حکومت نے گھوڑی پال سکیم کے تحت مختلف لوگوں کو اس شرط پر زمینیں دیں کہ وہ ہر پچاس ایکڑ پر ایک گھوڑی پالیں گے اور گھوڑی کے بچے حکومت کو سستے داموں دیے جائیں گے۔ چنانچہ وسعت علی خاں نے اس سکیم میں حصہ لے کر سات سو ایکڑ کا ایک سٹڈ قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور اس مقصد کے لیے لاہور سے سرگودھا آ گئے۔

سرگودھا آ کر انہوں نے زمین کو قابل کاشت بنانے کے بعد اس کا نام اپنے والد حاجی وزیر خاں کے نام وزیر کوٹ رکھا اور یہیں رہائش پزیر ہو گے۔ جہاں ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو ان کے ہاں وزیر آغا پیدا ہوئے۔ وزیر آغا کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد زمیندار طبقہ پریشانیوں کی زد میں آ گیا۔ اور ۱۹۲۹ء کے عالمی بحران نے اس صورت حال کو اور بھی شدید بنا دیا۔ زمیندار اپنا مالیہ اور آبیانہ تک دینے کے لیے مہاجن کا مرہونِ منت ہو گیا ۔ وسعت علی خان بھی اس بحرانی کیفیت کی زد میں آئے او ر آخر کار وہ گھر کے زیورات تک فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان واقعات نے وزیر آغا کے ننھے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا لیکن اس کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے خاندانی حالات میں بہتری پیدا ہوتی گئی نتیجتاً دس پندرہ برس میں اس کے خاندان کی معاشی حالت مستحکم ہو گئی۔

تعلیم:

وزیر آغا نے ابتدائی تعلیم مختلف دیہاتی مدرسوں میں حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں انہیں چک نمبر ۳۴ جنوبی کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں سے آٹھویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں منٹگمری (اب ساہیوال) بھیج دیا گیا۔ انھوں نے نویں جماعت کا امتحان ساہیوال سے پاس کیا اور اس کے بعد میٹرک کے لیے وہ پھر سرگودھا آ گئے۔ سرگودھا میں آ کر انھوں نے گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اور انٹر میڈیٹ کے لیے انھوں نے پھر سرگودھا سے باہر کا سفر اختیار کیا۔ اس غرض کے لیے وہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل ہوئے۔ انٹر میں وزیر آغا اپنے کالج میں اول آئے۔ اور گریجویشن کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کا رُخ کیا جہاں سے ۱۹۴۳ء میں انھوں نے اکنامکس (معاشیات) میں ایم اے کیا۔ ایم اے کے بعد وزیر آغا کی تعلیمی زندگی میں ایک طویل وقفہ ہے۔ ایم اے سے فراغت کے بعد وہ زرعی معروفیات میں الجھ گئے اور اس کے ایک طویل عرصہ بعد انھیں پی ایچ ڈی کا خیال آیا۔ ایم اے میں وزیر آغا کا مضمون معاشیات تھا لیکن پی ایچ ڈی کے لیے انھوں نے اردو ادب کا انتخاب کیا۔ یہ قریباً ۱۹۵۱ـ۵۲ء کی بات ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ان کے مقالہ کے لیے ڈاکٹر عبادت بریلوی کو نگران مقرر کیا۔ وزیر آغا نے ان کی نگرانی میں کم اپنے مطالعہ اور وقار عظیم اور مولانا صلاح الدین احمد کی رہنمائی میں زیادہ کام کیا اور بالآخر انھیں ۱۹۵۶ء میں "اردو ادب میں طنز و مزاح" پر مقالہ لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

مولانا صلاح الدین احمد سے ملاقات:

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم پرانی وضع کے ان بزرگوں میں سے تھے جو جوہر شناسی کی اہلیت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا ادب اور ادیب کے معاملے میں حد درجہ بالغ نظر اور نکتہ رس واقع ہوئے تھے۔ وزیر آغا کی مولانا صلاح الدین احمد سے ملاقات ان کے بھانجے شمس آغا کے توسط سے ہوئی جو "ادبی دنیا" کے ایک نوعمر افسانہ نگار تھے، وزیر آغا نے مولانا سے اپنی ملاقات کو اپنی ادبی زندگی کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے اور ان کا یہ کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ اس ملاقات کے بعد ہی مولانا صلاح الدین احمد نے وزیر آغا کو مضمون نگاری کی طرف راغب کیا اور آغا صاحب نے اپنے پسندیدہ موضوع "مسرت" پر مضامین لکھنے شروع کیے۔ "مسرت" ان کا پسندیدہ موضوع ہے، اس مخصوص ذہنی پس منظر میں گورنمنٹ کالج لاہور کی طالب علمی کے دور میں انھیں مختلف فکری مراحل اور مدارج سے اس طور گزرنا پڑا کہ ایک طرف تو وہ تشکیک کی لہر کی زد میں تھے، دوسری طرف ان کا رجحان تصوف کے مطالعہ کی طرف بھی تھا۔ چنانچہ اس ذہنی الجھاؤ نے انھیں "مسرت" کی ماہیت کو سمجھنے کی تحریک دی اور اس

موضوع پر مطالعہ کرنے کے بعد وزیر آغا نے اولاً جب مضمون نگاری کا آغاز کیا تو مسرت ہی کے عنوان سے کیا۔ ادبی دنیا میں چھپنے والے یہ مضامین ۱۹۵۴ء میں "مسرت کی تلاش" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے اور یہی وزیر آغا کی پہلی کتاب تھی۔

درمیانی دور:

۱۹۴۹ء میں وزیر آغا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۵۹ء تک کا عرصہ جب وہ گاؤں سے سرگودھا آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کی زندگی کا درمیانی دور کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ اس عرصہ میں جہاں ان کی پہلی کتاب "مسرت کی تلاش" شائع ہوئی۔ (۱۹۵۴ء) وہاں ان کی زندگی کے بعض اور اہم واقعات جنھوں نے آگے چل کر خاص رُخ اختیار کیے اس دہائی میں عمل میں آئے۔ مثلاً پی۔ ایچ۔ ڈی میں کامیابی (۱۹۵۶ء) سلیم آغا کی ولادت (۱۹۵۶) پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ اردو ادب میں طنز و مزاح کی اشاعت (۱۹۵۸ء) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا صلاح الدین احمد سے دوستی۔ تمام واقعات اس دہائی یعنی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک کے عرصے میں رونما ہوئے۔

صحافتی زندگی:

وزیر آغا کی صحافیانہ زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے مولانا صلاح الدین احمد کے ایما سے ادبی دنیا کے شریک مدیر کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ ہر چند کہ وہ اس سے پہلے تسیم شاکل پوری کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ جاری کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور انور گوئندی کے "کامران" میں قلمی معاونت بھی کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان دو کوششوں کو وزیر آغا کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی صحافیانہ زندگی اصلاً "ادبی دنیا" کے شریک مدیر کے طور پر شروع ہوتی ہے جس میں انھوں نے اردو ادب کے میدان میں نت نئے تجربوں اور نئے تناظر کو پھیلانے کی سعی کی اور "ادبی دنیا" کی زندگی کے اس دور یعنی دور پنجم کو بعض حوالوں سے یادگار بنا دیا۔

مولانا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" کو کلاسیکیت اور جدیدیت دونوں نقطہ ہائے نظر کا علمبردار بنائے رکھا اور قدیم سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر جدید کی طرف پیش قدمی کرتے رہے۔ اس نئے دور میں مولانا کے نوجوان رفقا منصور احمد، میراجی اور وزیر آغا نے ان کی روایتوں کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ بعض نئے اور جاندار تجربوں کے ساتھ آگے بھی بڑھایا۔

"ادبی دنیا" کے ساتھ وزیر آغا کا رشتہ ادارت تقریباً پانچ برسوں پر محیط ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جب مولانا صلاح الدین احمد انتقال کر گئے تو وزیر آغا بوجوہ "ادبی دنیا" سے اپنا انسلاک برقرار نہ رکھ سکے اور انھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک نیا ماہنامہ "اوراق" کے نام سے جاری کیا۔ جس کا پہلا شمارہ نئے سال کے طلوع کے ساتھ جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ وزیر آغا نے اس نئے رسالے کو مولانا صلاح الدین احمد کے مسلک ادب کے مطابق چلانے کا اعلان کیا۔ جب "ادبی دنیا" کا سلسلۂ اشاعت منقطع ہو گیا تو انھوں نے "اوراق" کی پیشانی کو "مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں" کے الفاظ سے مزین کر دیا، جو آج بھی "اوراق" کے ہر شمارے پر چمکتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو اب وزیر آغا کو صحافت کے میدان کی کوچہ گردی میں رُبع صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

سیاست میں:

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ صدر ایوب مرحوم کے دور حکومت میں وزیر آغا کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا جب وہ عملاً حکومت کے ایک نیم سیاسی ادارے کے رکن نامزد ہوئے، صدر ایوب نے بنیادی جمہوریتوں کا جو نظام قائم کیا تھا اس میں نچلی سطح پر انتخابات اور بالائی سطح پر نامزدگی کا اصول اپنایا گیا تھا۔ اس وقت وحدتِ پاکستان دو صوبوں مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل تھی اور مغربی پاکستان کے لیے بیس بائیس ارکان پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی نامزد کرنا تھی جس میں دیگر ارکان کے علاوہ وزیر آغا کو بھی نامزد کیا گیا۔ اس کمیٹی کے اجلاس اسمبلی ہال لاہور میں گورنر مغربی پاکستان کی زیر صدارت منعقد ہوتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا دو تین برس تک اس مشاورتی کونسل کے رکن رہے اس عرصے میں انھوں نے اس کونسل کی جن کارروائیوں میں حصہ لیا ان میں دیہاتی مدرسوں میں زرعی تعلیم کو لازمی قرار دلوانے کی کوشش کی۔ وزیر آغا کی یہ تجویز اس وقت مان لی گئی تھی لیکن بعد میں اَن بوجھی مصلحتوں کے تحت اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔ احباب کا خیال تھا کہ وزیر آغا اس کونسل کے زینے سے سیاست کے بُرج کی طرف نکل جائیں گے لیکن وزیر آغا اپنی افتادِ طبع کے باعث دو تین برس بعد اس کونسل سے ایسے لوٹے کہ پھر کبھی "سیاست کی روحِ اکبری کا رخ نہ کیا۔"

لاہور میں :

وزیر آغا اصلاً سرگودھا کے رہائشی ہیں لیکن ادبی ذوق اور اس کوچے کی پیائش کے شوق نے ۱۹۷۳ء میں انھیں مجبور کر دیا کہ وہ سرگودھا کو خیر باد کہیں اور لاہور جا کر قیام پذیر ہوں۔ چنانچہ وہ لاہور چلے آئے اور یہاں ایک مکان کرائے پر لے کر رہائش اختیار کر لی۔ اس طرح لاہور کے ادبا و شعراء سے وزیر آغا کے تعلقات کی تجدید ہوئی لیکن اس کے باوجود سرگودھا جیسے چھوٹے شہر اور علی الخصوص وزیر کوٹ ایسے علاقے کے عادی وزیر آغا کو لاہور کی وضع قطع راس نہ آئی اور وہ ۱۹۷۵ء میں اپنے گاؤں واپس لوٹ آئے۔ ان کی یہ مراجعت شاید اس لیے بھی تھی کہ خود وزیر آغا کے بقول: "دیہات ان کی روح کے اندر گھاس کی طرح اُگا ہوا ہے" اور ظاہر ہے دیہات کا ماحول شہروں اور پھر لاہور ایسے بڑے شہر میں میسر نہیں آتا۔

اب وزیر آغا سرگودھا میں بلکہ وزیر کوٹ میں ہیں ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ سرگودھا آتے ہیں اور شام تک ۵۸۔ سول لائنز میں قیام کرتے ہیں۔ اب ان کے بقول شام کی آمد آمد ہے اور وہ بہت کم سفر کرتے ہیں لیکن بدستور حالتِ سفر میں ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی ایک تازہ کتاب میں اپنی موجودہ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "جب سورج ڈھلتا ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے دُور کھیتوں میں نکل جاتا ہوں۔ جب مَیں گاؤں سے نکل رہا ہوتا ہوں تو عین اس وقت پرندے ڈھور ڈنگر اور کسان رات گزارنے کے لیے گاؤں کی طرف آ رہے ہوتے ہیں راستے میں ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے لیے رات سکون و آرام اور نیند کا دوسرا نام ہے۔ میرے لیے رات سفر کا ایک استعارہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شام بظاہر دن کی روشنی کا آخری نقطہ ہے مگر یہ رات کی روشنی کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور میں ایک طویل مسافت کے بعد اب کہیں اس نقطے پر پہنچا ہوں۔ جب میں دن کے نقطۂ آغاز پر کھڑا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ارد گرد کا ہوش تک نہیں تھا مگر آج کہ رات کے نقطۂ آغاز پر پہنچا ہوں تو دیکھ سکتا ہوں اور یوں اس گہرے اسرار کو جو معانی کا گہوارہ اور امکانات کا منبع ہے نہ صرف سُن سکتا ہوں بلکہ اسے مَس بھی کر سکتا ہوں۔ مَیں جب اسے دیکھتا ہوں تو اس کے اندر ویسا ہی دھماکہ ہوتا ہے جیسا نا موجود کے اندر ہوا تھا اور پھر سارا آسمان ستاروں سے اٹ جاتا ہے، اور مَیں ان ستاروں کو اپنے پھیلے ہوئے دامن میں اس طور سمیٹنے لگتا ہوں جیسے گاؤں کی لڑکیاں کپاس چُنتی ہیں۔"

حرفِ آخر:

میں نے آغاز میں وزیر آغا کی زندگی کو انشائیے سے تشبیہ دی تھی اس مختلف النوع کیفیات کی حامل زندگی کو اس لیے بھی انشائیہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا کی زندگی کی طرح ان کی تصانیف میں بھی فکری عمل کے ارتقاء اور تسلسل نے انھیں بیک وقت تنوع اور وحدت عطا کی ہے کہ ان کی تمام کتابیں "مسرت کی تلاش" سے لے کر "شام کی منڈیر سے" تک موضوعاتی تنوع کے باوصف اپنے اندر ایک طرح کی وحدت بھی لیے ہوتی ہیں کہ وزیر آغا کی تصانیف "اردو شاعری کا مزاج"، "تخلیقی عمل"، "تنقید اور مجلسی تنقید"، "تنقید اور احتساب"، "نئے تناظر"، "نظم جدید کی کروٹیں"، "نئے مقالات"، "تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں"، "دائرے اور لکیریں"، "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک"، "دوسرا

کنارا" شعری مجموعے اور بعض دیگر تالیفات ان تمام میں مصنف کے فکر کی ایک ارتقائی اور تدریجی کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک ایسا مصنف جس نے اپنے ماحول اور اپنے مطالعے سے بڑے پیمانے پر کسب فیض کیا ہے اور جو اپنے خیالات کو قاری تک پہنچانے کا فن جانتا ہے۔

وزیر آغا کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے ادب میں ایک خاص مقام تک پہنچ جانے کے باوجود اپنی طالب علمانہ حیثیت کو برقرار رکھا ہے اور انھوں نے اپنے مطالعے کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تدریج و ارتقا کے مراحل سے آج بھی اسی طرح گزر رہے ہیں جس طرح کوئی نوجوان اپنی شعوری زندگی کے وسطی دور میں گزرا کرتا ہے۔

آخر میں یہ جاننے کے لیے کہ وزیر آغا عمر بھر کے تجربات اور مطالعہ کے بعد اب فکر کی کس منزل پر ہیں، ان کی خودنوشت کا یہ پیراگراف ہمیں خاصی مدد فراہم کرتا ہے۔

"ادب کے حوالے سے دیکھوں تو میرا نام اور کام بیسویں صدی کی چند دہائیوں تک محدود ہے۔ پوری صدی کے تناظر میں میری حیثیت بالکل معمولی ہے۔ دس صدیوں کے تناظر میں بالکل معدوم ہو جائے گی۔ بات مجھ ہی تک محدود نہیں موہوم ہو جانا انسان کا نوشتہ تقدیر ہے۔ ایک صدی کے تناظر میں غالب ایک عظیم شاعر ہے۔ ایک ہزار برس کے تناظر میں بھی وہ کسی نہ کسی حد تک عظمت کا حامل رہے گا ایک لاکھ برس کے تناظر میں غالب کہاں ہوگا اور پھر کیا دس لاکھ برس کے تناظر میں اس کا کوئی نام و نشان باقی رہے گا؟ اس وقت تک تو آج کی بولی جانے والی زبانیں اور اس کے گرد لپٹے ہوئے کلچر اور ان کلچروں کو اپنے ہالے میں لیے ہوئے آج کی تہذیب بھی کی ختم ہو چکی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی نام و نمود کے جملہ مظاہر بھی خاک ہو چکے ہوں گے۔ ہم سب اپنی اپنی صدیوں کے مرقدوں میں قید ہیں اگر اس قید سے رہا بھی ہوں تو ایک نسبتاً بڑے مرقد میں قید ہو جائیں گے، مگر قید و بند کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کی کہانی میں بلکہ ہر کرۂ ارض کی کہانی میں ایک ایسا مقام ضرور آتا ہے جب وہ اپنے مرقد کو عبور نہیں کر پاتا اور نیست ہو جاتا ہے۔ میں جب نیست ہو جانے کے اس المیے کو دیکھتا ہوں تو زندگی اور اس کے مقاصد کی بے معنویت مجھ پر آشکار ہو جاتی ہے اور مجھے اپنا نام اور کام محض راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری نظر آتا ہے اور تب مجھے وہ مسکراہٹ عطا ہوتی ہے جو بے معنویت کے احساس ہی سے پھوٹ سکتی ہے۔"

(شام کی منڈیر سے"۔ وزیر آغا۔ ص ۳۸۴)

(یہ مضمون ۱۹۸۸ء میں لکھا گیا)

❖OOO❖

وزیر آغا کے لیے منظوم خراج تحسین

ہے اس کی ذات اک ایسا حسین گلدستہ
ہر ایک بزم میں جس کی ہیں نکہتیں رقصاں
قلم کی عظمت و عزت کا یہ محافظ ہے
اسی لیے تو ہر اک لفظ اس کا ہے تاباں

روشن ادب کو سمجھتا ہے یہ اسی باعث
جدا ہے اہل سخن سے ہر ایک بات اس کی
یہ بات حق ہے کہ اس عہد کے اندھیرے میں
ہیں شب چراغ کی صورت نگارشات اس کی

یہ تاجدار سخن سرگروہ اہل سخن
جہانِ لفظ و معانی کی منفرد آواز
یہ شاہ باز ہے ایسا کہ جس کی نظروں میں
ہر ایک سرحد رفعت ہے نکتہ آغاز

یہ جدتوں کا ہے موجود روایتوں کا فروغ
عروس فکر کو ملبوس نو دیا جس نے
جدید سانچے میں ذہنوں کو ڈھالنے کے لیے
ادب کی دنیا کو انشائیہ دیا اس نے

یہ بات حق ہے شب و روز کی ریاضت سے
مثال شمع ہے ضوپاش زندگی اس کی
پتہ یہ لگتا ہے اوراق کو اگر دیکھیں
ادب کی نشر و اشاعت ہے بندگی اس کی

یہ دوستی کا تقدس یہ مجلسوں کا نکھار
ہر ایک سر فصاحت کو کھولنے والا
یہ اپنے دانش وجدان کے ترازو میں
سخنوروں کی بصیرت کو تولنے والا

علامہ رشک ترابی

مجید امجد کی زمین میں آغا جان
کے حضور عقیدت کے پھول

پروفیسر عبدالقیوم رانا

تھے ترے شعروں میں آغا، نہاں گلاب کے پھول
ذہن سے جھڑتے تھے وقتِ بیاں گلاب کے پھول

ترے فراق میں جو ہے چمن کا حال نہ پوچھ
ہیں تیری یاد میں سب نوحہ خواں گلاب کے پھول

سر نیاز جھکائے بہار تیرے حضور
"تری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول"

چمن چمن میں ہے تیرے خیال کی خوشبو
سنا رہے ہیں تری داستاں گلاب کے پھول

ہو تیری قبر پہ ہر وقت رحمتوں کا نزول
نثار کرتا رہے آسماں گلاب کے پھول

دل حزیں سے نکلتی ہے یہ دعا پیہم
چڑھائے قبر پہ حور جناں گلاب کے پھول

بہار روٹھ کے مجھ سے چلی گئی قیوم
نگاہ میں ہے خزاں اب کہاں گلاب کے پھول

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات

ڈاکٹر انور سدید

مکتبہ فکر و خیال، 172 سٹیج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

اب یاد کرتا ہوں تو ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات جولائی ۱۹۶۱ء کی گرم دوپہر کو سرگودھا میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ملاقات میں میرے راہنما سجاد نقوی تھے۔ میں اپنے ملازمتی مرکز بیدیاں (ضلع لاہور) سے چار دن کی چھٹی پر سرگودھا میں ایک شادی کی تقریب میں آیا تھا۔ اور اپنے معمول کے مطابق "کامران" کے مدیر انور گوبندی سے ملنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا تھا۔ گوبندی صاحب نے دفتر میں موجود ایک دبلے پتلے نستعلیق سے شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:

"آپ سجاد نقوی صاحب سے ملیے .... یہ "کامران" کی ترتیب و تدوین میں میری معاونت کرتے ہیں اور خود بھی افسانہ نگار ہیں۔"

تعارف کرانے کے بعد انھوں نے نقوی صاحب سے پوچھا "آج وزیر آغا صاحب نے شہر آنا تھا...... ان کی آمد کی کوئی خبر ملی ہے" نقوی صاحب اس وقت رسالہ کامران کے لیے کتابوں پر تبصرے لکھ رہے تھے۔ سامنے شمس آغا کے افسانوں کی کتاب "اندھیرے میں جگنو" پڑی تھی۔ نقوی صاحب مصافحہ کر کے خالی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ انور گوبندی نے روئے سوال میری طرف کر دیا۔

"آپ وزیر آغا سے کبھی ملے ہیں؟"

میں ان دنوں وارسک ڈیم پشاور سے تبدیل ہو کر لاہور کے قریب بی آر بی نہر پر بطور سب انجینئر متعین تھا اور ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا۔ اس نہر کی پہلی آب روانی ہونے والی تھی۔ بھارت نے نہری پانی بند کرنے کی دھمکی دے رکھی تھی۔ لیکن بی آر بی کی صورت یہ تھی کہ تکمیل کے بعد عرصہ تک اس میں پانی نہیں چلایا گیا تھا۔ حالاں کہ متبادل انتظامات کے تحت مرالہ ہیڈ ورکس سے نکلنے والی بڑی نہر سے ایک اور شاخ بمباں والا سے تعمیر کی گئی تھی جو دریائے راوی کے پل کے نیچے سے ایک بڑے سائفن کی صورت میں مغربی سے مشرقی کنارے تک پہنچتی اور پھر قصور کے نزدیک گنڈا سنگھ والا ہیڈ ورکس پر دیپالپور نہر کو پانی سپلائی کرتی تھی۔ دیر تک نہ چلائے جانے کی وجہ سے بی آر ڈی نہر جگہ جگہ سے شکستہ ہو گئی تھی۔ خار پشتوں نے اس کی مٹی کے کناروں میں اپنے مستقل ٹھکانے بنا لیے تھے۔ قصور کے نزدیک روہی نالے کا سائفن سیلاب کی نذر ہو چکا تھا اور اس کی تعمیر تو ضروری تھی۔ بر کی سے لے کر گنڈا سنگھ والا تک اس نہر کی مرمت کا کام مجھے تفویض کیا گیا تھا۔ اس لیے سرگودھا جانے کا اتفاق کم کم ہوتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں وزیر آغا کے نام اور ان کے کام سے آشنا نہیں تھا۔ سماجی لحاظ سے وہ ہمارے شہر کی ایک ممتاز ترین شخصیت آغا وسعت علی خان کے فرزند تھے۔ سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن کے پاس ان کی ایک وسیع و عریض حویلی تھی۔ جس کے بڑے دروازے سے ہاتھی بھی اندر جا سکتا تھا۔ بڑے آغا صاحب اپنے گاؤں ۵۶ جنوبی (جو وزیر کوٹ موسوم ہوتا تھا) سے شہر آتے تو لوگ ان کے کروفر اور جلال و جمال سے بہت متاثر ہوتے۔ جمال ان کی خوبصورت زرق برق ریشمی بگھی سے ظاہر ہوتا جس کے آگے ایک صحت مند آراستہ پیراستہ گھوڑا جتا ہوتا۔ آغا وسعت علی خان بالعموم "برجس" میں ہوتے اور ان کی سیاہ لمبی مونچھیں بڑی رعب دار اور جلالی محسوس ہوتیں۔ میں نے اس قسم کی بگھی سرگودھا کے امراء میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھی۔ بڑے آغا صاحب کا نام تو لوگوں کو شاید معلوم نہیں تھا لیکن سب انہیں "بگھی والے خان بہادر" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ اس بگھی کا انجر پنجر میں نے ایک لمبے عرصے تک آغا صاحب کی حویلی کے باہر پڑا ہوا دیکھا تھا۔

میرے لیے وزیر آغا کا تعارف دوسری نوعیت کا تھا۔ میں نے ان کے ادبی مضامین، انشائیے اور نظمیں مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ "ادبی دنیا" میں پڑھی تھیں۔ مسرت کے موضوع پر ان کی فلسفیانہ نوعیت کے مضامین اس رسالے میں چھپتے تو ان کا مطالعہ گہری دلچسپی سے کرتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد "ادبی دنیا" میں مضامین کا تعارف اس خوبصورت انداز میں کراتے تھے کہ مضامین کا داخل لو دینے لگتا اور قاری ان مضامین کی طرف سب سے پہلے راغب ہوتا۔ انور گوبندی نے پوچھا تو میں نے جواب دیا:

"مجھے آغا صاحب سے ملنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن میں ان کے بہت سے مضامین پڑھ چکا ہوں اب انور گوبندی نے سجاد نقوی کی طرف اور سجاد نقوی نے انور گوبندی کی طرف حیرت سے دیکھا .... حیرت کی اس دھند میں انور گوبندی نے کہا:

"شاہ جی! انور سدید سرگودھا میں لمبے وقفوں سے آتا ہے۔ وزیر آغا صاحب سے ان کی ملاقات آج ہی ہونی چاہیے .... یہ کہہ کر اس نے اپنے ساختہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس کے کڑوے کسیلے دھوئیں کو دیر تک باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ اس ایک کش میں ہی انور گوبندی نے آدھا سگریٹ پھونک ڈالا تھا اور اب اس کی پلنگ پر لٹکے ہوئے گل کو اپنی خماریں آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عاشق صادق وصال کے بعد اپنے محبوب کو دیکھتا ہے۔ سجاد نقوی نے پوچھا "گوبندی صاحب کیا آپ بھی چلیں گے؟"

اس وقت ایک مدقوق سا لڑکا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا انور گوبندی کو پکڑا دی اور ایک دونی لے کر تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس پڑیا کے ملتے ہی انور گوبندی کی نشأ ور آنکھوں میں انوکھی چمک سی پیدا ہو گئی۔ وہ بولا:

"آپ انہیں لے کر چلیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔ اس وقت محمد حسین شوق آنے والے ہیں لڑکا ان کی آمد کی اطلاع دے گیا ہے۔"

یہ کہہ کر انور گوبندی نے میز کے دراز سے لیمپ کا سگریٹ نکالا۔ تمبا کو ہتھیلی پر الٹا اور پڑیا کا بند قبا کھولنے لگا۔ سجاد نقوی نے "کامران" کے تبصروں کے کاغذ سمیٹے اور بولے:

"آیئے انور سدید صاحب، قبل اس کے کہ انور گوبندی کے سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو ہم نکل چلیں"۔ نیچے انور ریستوران پر سجاد نقوی کی سائیکل پڑی تھی، یہ وہی سائیکل تھی جس پر نقوی صاحب گھر سے کالج تک اور کالج سے دفتر کامران تک سفر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ سائیکل تانگے سے ٹکرا گئی تو نقوی صاحب کا کولھا اتر گیا۔ یہ خستہ حال سائیکل دیکھ کر مجھے افسانہ نگار اعظم کریوی کی سائیکل یاد آ گئی جس کا عبرت ناک نقشہ ضمیر جعفری صاحب نے ان کے خاکے میں پیش کیا تھا۔ میں نے سائیکل کی حالت دیکھ کر کہا:

"نقوی صاحب کیا یہ ہم دونوں کا بوجھ برداشت کرے گی۔ کہیں حشر کے دن بے رحمی کے جرم میں ہم دونوں کا دامن نہ پکڑ لے؟"

نقوی صاحب بولے "یہ ریلے کی اصلی مضبوط سائیکل ہے۔ میں نے ٹائر ٹیوب نئے ڈالے ہیں آپ بالکل نہ گھبرائیں اور یہ بتائیں آپ آگے بیٹھیں گے آرام دہ ڈنڈے پر یا پچھلے کیریر پر......؟"

سجاد نقوی انکساری کی رو میں تھے وہ سنگل پسلی

کے جوان تھے۔ میرا جسم مگسا آبپاشی کے بنگلوں میں دودھ، مکھن اور اپنی پولٹری کے مرغے کھا کھا کر فربہ ہو گیا تھا۔ نقوی صاحب کا وزن سو پاؤنڈ تھا تو میرا یقیناً اڑھائی سو پاؤنڈ ہوگا۔ میں نے کہا" نقوی صاحب آپ کا سائیکل میں چلاؤں گا۔ آپ" کامران" کے مدیر ہیں اور میں آپ کا معمولی سا قلمکار...... سائیکل چلانا اور مدیر کو کھینچنا میرا فرض بنتا ہے۔ محکمہ نہر میں مجھے سائیکل چلانے کی بڑی پریکٹس ہو گئی ہے"

نقوی صاحب نے ایک معنی خیز، جانی بوجھتی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہا" اچھا تو یوں کرتے ہیں آدھے فاصلے میں سائیکل میں چلاؤں گا۔ آدھا فاصلہ آپ چلائیں۔ نصف اول میرے ذمے!

یہ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہو گئے۔ مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ میں نے کہا" جہاں نصف فاصلہ ختم ہو جائے مجھے بتا دیجئے گا۔ نقوی صاحب کے دھان پان جسم میں بلا کی پھرتی تھی۔ سائیکل پر بیٹھتے ہی پہیے تیزی سے گھومنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرگودھا کی سڑکوں پر تانگے بھی اکا دکا ہی نظر آتے تھے۔ پیدل چلنے والوں کی بھیڑ بھی نہیں تھی۔ کمپنی باغ سے آگے شہر ختم ہو جاتا تھا۔ ریلوے لائن عبور کرتے ہی سول لائن میں داخل ہو جاتے تھے لیکن آغا صاحب کی حویلی ایک دور افتادہ میدان اور خاموش سے مقام پر تھی۔ بعد میں یہ حویلی اسی مقام پر ایک خوشنما" کوٹھی" میں تبدیل ہو گئی لیکن شہر کی حدیں پھیلنے لگیں۔ آغا صاحب کے بنگلے کے سامنے ایک سینما بن گیا اور اس نئی تعمیر کے بعد آغا صاحب کا گھر شہر کے وسط میں آ گیا۔

ایک مقام پر پہنچ کر نقوی صاحب نے سائیکل کو بریک لگائی، اپنے قدم زمین پر جمائے تو میں نے باقی نصف حصے کا سفر کرنے کے لیے سائیکل چلانے اور اپنی باری بھگتانے کی تیاری کر لیں لیکن نقوی صاحب نے یہ کہہ کر حیرت زدہ کر دیا کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ سامنے ایک حویلی تھی بالکل قلعہ نما.............. اس حویلی کے بڑے چوبی دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو ایک ملازم نے بتایا کہ وزیر آغا صاحب بائیں طرف کے کمرے میں ہیں۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آغا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے گرد بہت سی کتابیں پڑی تھیں۔ پاس ہی ان معروف فیلٹ پڑی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے ہمیں دیکھ کر وہ کھڑے ہوئے۔ یہ کمرہ طویل و عریض تھا لیکن بالکل ویران سا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کمرے کی سب سے قیمتی چیز وزیر آغا ہیں۔ نقوی صاحب سے ہاتھ ملا کر بولے" میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے وزیر آغا کے سراپا میں بڑے آغا صاحب کا جلال تلاش کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہ مجھے بے حد دھیمے مزاج کے انسان اور سمندر کی طرح شانت نظر آئے۔ سجاد نقوی نے میرا تعارف کرایا۔" یہ انور سدید ہیں" محکمہ نہر میں سب انجینئر ہیں۔" ماہ نو"۔" ہمایوں" اور نیرنگ خیال" میں افسانے لکھتے رہے ہیں لیکن آج کل صرف نوکری کر رہے ہیں۔" ادبی دنیا" باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کے مضامین اور نظمیں بھی انھوں نے پڑھ رکھی ہیں"۔

وزیر آغا بولے" میں نے ان کے افسانے" کامران" میں پڑھے ہیں۔ سالنامہ" کامران" میں انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب" نقد میر"" پر جو تبصرہ لکھا تھا اسے سید صاحب نے بہت پسند کیا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے کاغذات سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا خط نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے پوچھا:" انور سدید صاحب آپ نے افسانہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔"

میں نے مؤدبانہ کہا" دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو انجینئرنگ کا پیشہ مجھ پر غالب آ گیا ہے یا پھر افسانے نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسری وجہ درست ہے"

آغا صاحب سن کر بولے" کبھی کبھی لکھنے والے پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب تخلیق کی دیوی فنکار کے حسب خواہش اس پر مہربان نہیں ہوتی۔ اس وقت اپنے اظہار کی صنف تبدیل کر لینی چاہیے۔" پھر انھوں نے کہا کہ جب نظم مجھ پر وارد نہیں ہوتی تو میں کسی تنقیدی مضمون کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں یا انشائیہ لکھتا ہوں" یہ کہہ کر انھوں نے شمس آغا کے افسانوں کا مجموعہ" اندھیرے کے جگنو" مجھے دیا اور کہا" اس کتاب پر ایک تنقیدی مضمون لکھ دیجئے۔ نقوی صاحب اسے کامران میں چھاپیں گے۔"

شمس آغا اس وقت دنیا سے روپوش ہو چکا تھا۔ اس نے آٹھ دس افسانے لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ کرشن چندر جیسے بڑے افسانہ نگار نے بھی شمس آغا کی تعریف کی تھی۔ میں نے" ادبی دنیا" میں اس کے سب افسانے پڑھے تھے۔ مزید آغا صاحب کے مضمون" ٹوٹا ہوا تارا...... شمس آغا" نے ایک عجیب سی جذباتی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اگرچہ سجاد نقوی اس کتاب پر" کامران" کے لیے تبصرہ لکھ رہے تھے لیکن آغا صاحب نے بطور خاص مجھے بھی لکھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ اب چائے کی ٹرالی آ چکی تھی۔ آغا صاحب چائے بنانے لگے۔ اتنے میں صدر دروازے سے غلام جیلانی اصغر آتے دکھائی دیے۔ شام ڈھلنے تک مسعود الرؤف ڈپٹی کمشنر سرگودھا، پروفیسر خورشید رضوی، ایس پی فضل حق، فخر الدین بلے، اور ایم ڈی شاد آ گئے۔ اور شام دوستاں آباد ہو گئی۔ لمحہ بے کراں وسعت اختیار کر رہا تھا۔ یہ پہلی ملاقات دنوں، مہینوں اور برسوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ تاآنکہ وہ وقت آ گیا جب وزیر آغا صاحب سفید چادر میں لپٹے ہوئے خاموش تھے اور ہم انھیں لحد میں اتار رہے تھے۔

" دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا"

لیکن یہ سفر ایک اور جہاں کی طرف تھا۔

نئے جہانوں سے شناسا کرنے والا

شاعر، انشائیہ نگار و نقاد ڈاکٹر وزیر آغا

پروفیسر یوسف خالد 16 مدینہ ٹاؤن سرگودھا

یہ میری خوش قسمتی ہے اور میں اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک طویل عرصہ تک ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کی دلچسپ اور دانشمندانہ باتیں سننے کا موقع میسر رہا۔ ان دونوں بزرگوں کی گفتگو کے بہت سے ذائقے، اُن کی آواز اور لہجے کی دلکشی آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ مختلف موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز میں انتہائی گہری باتیں، مزاج کی شگفتگی اور زندگی کے تمام رنگوں سے لطف اندوز ہونے اور ایک برتر احساس کے جلو میں اپنی حیات کو حیات جاوداں بنانے والی یہ ہستیاں آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ بیتا ہوا وقت آنکھوں کے سامنے ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔ ان کا بے پناہ خلوص، علم و ادب کے ساتھ گہری وابستگی اور ہنر بانٹنے کا جذبہ اس قدر توانا تھا کہ اس نے ایک پورے عہد کو نیا علمی و ادبی وقار عطا کیا۔ اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا کہ اسے نئے جہانوں سے آشنا کرنے والے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی آخری سانس تک اس کی آبیاری کی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک، ایک تسلسل کے ساتھ ادب کی خدمت کرنے والی یہ شخصیت رفعت و عظمت کی ایک ایسی مثال ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات موضوعاتی اعتبار سے بہت متنوع ہیں۔ ان تمام موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ وہ اپنے قارئین کے لیے مشکل سے مشکل صورت حال کو انتہائی قابل فہم اور دلکش بنا دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کی کتب کا مطالعہ کیا ہے مجھ سے اتفاق کریں گے کہ انتہائی دقیق اور پیچیدہ علمی و ادبی موضوعات ڈاکٹر صاحب کے قلم سے مس ہو کر سہل اور عام فہم ہو گئے ہیں۔ "تخلیقی عمل"، "ساختیات اور سائنس"، "معنی اور تناظر"، "تنقید اور مجلسی تنقید"، "انشائیے کے خدوخال"، "دستک اس دروازے پر" اور "امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر" یہ تمام کتب ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جسے ادب فہمی کے لیے انتہائی لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔ جدید تر ادبی رویوں اور نظریات کو قارئین ادب تک پہنچانے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے انتہائی محنت اور ہنرمندی سے بہت سے علوم کو بطور Instrument استعمال کیا ہے۔ جس سے بعض مغالطوں کا خاتمہ ہوا ہے اور ایک نئی فکری اساس مہیا ہوئی ہے۔ اردو ادب پر ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو بین الاقوامی ادب کی صف میں شامل کر دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی بہت سی تصنیفات کا کم و بیش ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ان کے کام کے حوالے سے غیر ملکی ادباء اور دانشوروں کی انتہائی قابل قدر آراء نہ صرف آغا صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف ہیں بلکہ اردو ادب کی بین الاقوامی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

خدا گواہ ہے کہ کانٹوں پہ رقص کرتے تھے
چمن چمن کا مقدر نکھارنے والے
دلوں کو بخش گئے ہیں قرار کی دولت
تمام عمر تڑپ کر گزارنے والے

ڈاکٹر وزیر آغا نے جس خلوص، تڑپ اور جذبے سے علم و ادب کی خدمت کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔ ان کی گراں قدر تخلیقات سے نوجوانوں کو روشناس کرائیں۔ تعلیمی اداروں میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے اقدامات کریں تا کہ یہ انتہائی قیمتی متاع نہ صرف محفوظ رہے بلکہ ہمارے اذہان کو سوچ اور فکر کی غذا فراہم کرتی رہی۔ اور ہمارا معاشرہ جو فکری انتشار، بے راہ روی اور توڑ پھوڑ کا شکار ہے منضبط ہو سکے۔ تہذیب و تمدن کو پروان چڑھا سکے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا دامن خالی نہیں ہے، ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ یہ خزانہ جو ہمارے پاس موجود ہے اسے استعمال میں لانے کے لیے ہم اپنی نسل کو لفظ، خیال اور سوچ کی بے پناہ قوتوں سے آشنا کریں۔ نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا کیا جائے، انھیں ان ذائقوں سے وابستہ کریں جو ادب سے وابستہ ہو کر ہی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی دھرتی سے گہری وابستگی ہی ہماری منتشر خیالی کو کوئی راستہ دکھا سکتی ہے۔

بصورت دیگر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم مفلوک الحال رہیں گے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ:

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
تجھے اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

وزیر آغا کی خدمات کا احاطہ کرنا مرے بس کی بات نہیں ایک پورا عہد ان کی تخلیقات سے فیض یاب ہوا ہے۔ اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک انشائیہ "آگ تاپنا" میں یہ چند سطریں لکھ کر ہمیں واضح پیغام دے دیا ہے اور ہمارا رخ متعین کر دیا ہے:

"لکڑی کے جلنے اور زندگی کے گزارنے میں کس قدر مماثلت ہے، لکڑی ایک طرف سے جلتی ہے اس کے ہونٹوں پر ایک سرخ سا شعلہ ناچتا ہے جو اپنے قد کے مطابق انگیٹھی کے نور میں اضافہ کرتا ہے اس طرح میں نے خود کو ایک طرف سے آگ لگا رکھی ہے اور ہولے ہولے جلتا محبت اور ہمدردی کا نور یا برائی، گناہ اور کثافت کا دھواں پھیلاتا، بجھتا چلا جا رہا ہوں اور ایک روز اس جلتی لکڑی کی طرح مجھے بھی راکھ اور کوئلے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جانا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ انگیٹھی کی بعض لکڑیاں بیک وقت دونوں اطراف سے جل رہی ہیں ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنی مختصر حیات کو مٹھیاں بھر بھر کر لٹاتے ہیں اور مختصر سے عرصے میں کسی شہاب ثاقب کی طرح جلتے اور دوڑتے ابدی تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں لیکن جن کی درخشندہ گزرگاہ عرصہ افلاک کو بڑی دیر تک منور رکھتی ہے۔"

آغا صاحب کی پوری زندگی اس احساس کی روشنی میں سفر کرتے گزری، انھوں نے ہر لمحے سے خراج وصول کیا۔ ان کی تحریریں ان کے نظریات کی حقیقی ترجمان ہیں۔ ان کی تحریروں میں فکر و معنی کا ایک پورا جہاں آباد ہے سوچ اور فکر کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ لفظوں کی کائنات آگہی کی خوشبو سے معطر ہے۔ آئیں اس دیار میں داخل ہوں اور خود کو تابناک کر لیں۔ کرن بانٹنے والا اپنی آخری سانس لے کر یہ کہہ رہا تھا کہ:

وہ جس نے کبھی
اپنی عمر یک رو کو مرکب بنا کر
فقط ایک جلتی ہوئی موم بتی کے گرد
ایک پتنگے کی صورت، ہوا کی طرح
تیز تر ہونا سیکھا تھا
تم نے جسے
ریزہ ریزہ زمانوں کے قدموں سے اڑتی ہوئی
دھول تک کہہ دیا تھا
وہ آج اک سبز سی روشنی بن کے
اپنے ہی پنجر کی
ٹوٹی سلاخوں سے باہر نکل کر
بجھی کور آنکھوں کے حجرے میں رکھے
دیئے
دھیرے دھیرے جلانے لگا ہے
زمانے کو رستہ دکھانے لگا ہے۔

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا اور میں

پروفیسر سید علی اعظم بخاری
روکھڑی میانوالی

روکھڑی کا علاقہ عام طور پر ادبی لحاظ سے بانجھ لوگوں کا خطہ تصور کیا جاتا ہے مگر یہ بات قطعی غلط ہے جبکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ یہاں فاروق روکھڑی، گلزار بخاری، ستار سید، انجم نیازی، خاکسار، طاہر بخاری، فیروز بخاری، اور صابر بھریوں جیسے شعراء نے جنم لیا۔ جن کی شاعرانہ عظمت پورے برصغیر پاک و ہند میں تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ تمام جدید غزل و نظم کے نمائندہ شاعر ہیں جنھوں نے شکیب جلالی اور مجید امجد کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ انجم نیازی نے شاعری کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری میں بھی اپنا مقام بنایا ہے اور ان کے انشائیے اوراق جیسے وقیع مجلے میں شائع ہو کر قارئین سے داد وصول کرتے رہے ہیں۔ انجم نیازی کی جنم بھومی بھی روکھڑی ہی ہے۔ گلزار بخاری، خاکسار، طاہر بخاری بھی اوراق میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ستار سید کا اپنا ایک تعارف ہے۔ اس لحاظ سے روکھڑی کو جناب وزیر آغا سے ایک عقیدت اور وابستگی ہے یہ بستی ادب سے مالا مال ہے۔

وزیر آغا ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے انشائیہ، طویل نظم، اور جدید تنقید خاص کر امتزاجی تنقید کی اردو ادب میں داغ بیل ڈالی۔ وہ عالمی ادب میں اپنا ایک تشخص رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات کہ بلکہ ستم ظریفی ہے کہ میں نے 1971ء سے اوراق میں چھپنا شروع کیا، کئی بار سرگودھا 58 سول لائنز آغا صاحب سے ملاقات کی حسرت لے کے گیا مگر قسمت میں جیسے ان سے ملاقات نہیں تھی۔ ملاقات آخری دم تک نہ ہو سکی۔ پس خطوں کے ذریعے آدھی ملاقات کا سرور کشید کرتا رہا۔ حالانکہ عزیزم طاہر بخاری مرحوم اور فیروز بخاری مرحوم، برادرم گلزار بخاری ان کی صحبتوں اور ملاقاتوں سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ نجانے میں کیوں محروم رہا؟ ایک حسرت دید تھی سو رہی۔ آج وہ جب ہم میں نہیں تو اس بات کا قلق اور بھی شدت سے ہوتا ہے۔

قریب رہ کے بھی ان سے نہ مل سکے اعظم
عجیب حسرت دیدار تھی سو اب تک ہے

ڈاکٹر وزیر آغا نے مثال سے اس عالم تمثال میں 18 مئی 1922ء کو تشریف لائے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی۔ ان کے جد امجد کا نام نامی وزیر خان تھا جن کے نام پر ان کا نام وزیر آغا رکھا گیا۔ ان کے والد محترم جناب وسعت علی خان نے ان کے دادا کی خریدی ہوئی زمین پر ایک بستی کی بنیاد رکھی جس کا نام ان کے دادا کے نام پر وزیر کوٹ رکھا۔ یہی وزیر کوٹ آغا صاحب کا مولود مسکن ٹھہرا۔ جسے انھوں نے چاند بنا کر چمکایا اور گلاب بنا کر مہکا دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد ایک صوفی منش نیک انسان تھے۔ ان کی محافل میں بڑی بڑی ادبی سطح پر قد آور شخصیتیں شرکت کرنا باعث فخر اور باعث اعزاز سمجھتی تھیں۔ جن میں ادبی دنیا کے مدیر جناب مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر حمید احمد خان خاص کر قابل ذکر ہیں۔ میٹرک کا امتحان سرگودھا سے پاس کرنے کے بعد آپ نے بی اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور نمایاں پوزیشن حاصل کی پھر اسی کالج سے ایم اے کا امتحان معاشیات میں پاس کیا۔ انھوں نے اپنا تخلیقی اور تعلیمی سفر جاری رکھا اور 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا نام تھا "اردو ادب میں طنز و مزاح"۔

۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء میں آپ کی شادی ہوگئی قدرت نے آپ کو ایک بیٹا عطا کیا جن کا اسم گرامی سلیم آغا ہے اور ایک بیٹی وقار النساء۔ بیٹی کے ساتھ آغا صاحب کو بڑی محبت تھی زندگی کے آخری ایام انھوں نے لاہور میں اپنی بیٹی کے پاس گزارے۔ وہیں ایک مرتبہ آغا صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ طبیعات اور مابعد الطبیعات پر اپنی کتاب مکمل کر رہے ہیں۔ اور انھوں نے مجھے دعوت دی کہ اس کا مطالعہ ضرور کرنا یہ میری خاص تخلیقی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی طور پر اپنی تخلیقات کو چھپوانے کے لیے نصرت آراء نصرت کا فرضی نام اختیار کیا۔ جلد ہی آپ صلاح الدین احمد کے ادبی مجلے ادبی دنیا میں اپنے نام وزیر آغا سے شائع ہونے لگے۔ یہیں سے ان کے جوہر زمانے پر حقیقی معنوں میں آشکار ہوئے۔ اور وہ ڈاکٹر وزیر آغا بن کر ابھرے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو حلیم، بردبار اور نہایت شفیق رفیق پایا ہے۔ مجھے انھوں نے ۱۹۷۱ء سے شائع کرنا شروع کیا اور مسلسل آخری اوراق کے شمارے تک شائع کرتے رہے۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے مگر میں نے اس بات کو کبھی اپنے لیے ٹائٹل اور حوالہ نہیں بننے دیا۔ میرے پہلے مجموعہ کلام "ابر گریزپا" کا پیش لفظ بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑے پیارے اور معیاری انداز میں تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمہ وقت جوہر اصل کی تلاش میں رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ آج ہم میں نہیں مگر ان کی عظمتیں نکھرتی چلی جاتی ہیں وہ دلوں میں بس گئے ہیں اور جو دلوں کی بستیوں میں آباد ہوتے ہیں وہ دوام حاصل کرنے والے ہوتے ہیں وہ لوگ جو ان کے زمانے میں مقابل ہونے کا دعوی کرتے تھے وہ معدوم ہو چکے ہیں۔ زمانہ ہمیشہ اہل صفا اور صاحبان ہنر اور علم والوں کا قدر دان رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات نہ ہونے کی وجہ ان کی فیاضانہ طبیعت اور سادگی بھی ہے میں نے اپنا مسودہ اٹھایا اور انہیں بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔ انھوں نے جلد ہی پیش لفظ لکھ کر مجھے حیران کر دیا۔ میں ان کے پاس جانے کے لیے پر تول ہی رہا تھا مگر ان کی کمال مہربانی نے میری ملاقات کے پروگرام کو ناکام بنا دیا۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے کافی خطوط ہیں جنہیں میں وقت آنے پر انشاء اللہ شائع کرانے کی تمنا رکھتا ہوں یہ حوالہ میری زندگی کا بڑا حوالہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب اداریے جو اوراق میں لکھتے تھے اور تحقیقی مضمون بڑے دلچسپ رنگین اور دل میں اتر جانے والے ہوتے تھے وہ بور سے بور موضوع کو شگفتہ اور دلپذیر بنا دیتے تھے کہ آدمی رومانوی غزل یا کسی افسانے کا سا لطف اور حظ اٹھاتا۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا ہے تقریباً ساٹھ کے قریب آپ کی تخلیقات بنتی ہیں جن میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

اردو ادب میں طنز و مزاح، نظم جدید کی کروٹیں، اردو شاعری کا مزاج، تنقید اور احتساب، تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں، نئے تناظر، تخلیقی عمل، تنقید اور مجلسی تنقید، دائرے اور لکیریں، تنقید اور جدید اردو تنقید، انشائیے کے خدوخال، مجید امجد کی داستان محبت، ساختیات اور سائنس، دستک اس دروازے پر، غالب کا ذوق تماشا، چوری سے یاری تک، دوسرا کنارا، سمندر اگر میرے اندر گرے، شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، غزلیں، نردبان، گھاس میں تتلیاں، ایک کتھا انوکھی، چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل، پنجابی شاعری میں تیج تاریاں دا، واجاں ہانجھ وچھوڑے، شام کی منڈیر سے ان کی خود نوشت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو رہے ہیں یہ ان کی عظمت کی ایک اور بڑی دلیل

ہے۔ ڈاکٹر صاحب کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے تمام پہلوؤں کو مجموعہ تحریر میں لانا بڑا مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب بیسویں صدی کے عظیم انسان تھے اگر عالمی پرائز سیاسی مصلحتوں کا شکار نہ ہو چکے ہوتے تو انہیں نوبل پرائز ادب کا مل چکا ہوتا۔ مگر لوگوں کے دلوں میں محبت کا جو انعام خالق نے انہیں دیا ہے اس کا مقابلہ کوئی عالمی پرائز نہیں کرسکتا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا ایک ادنیٰ قاری رہا ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن کو وسعت اور مرے جذبات واحساسات کو نکھار ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتب کا مطالعہ کرنے سے میں محسوس کرتا ہوں میری تنگ نظری وسعت نظری میں تبدیل ہوگئی وہ ادق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو آسان اور سہل کر دکھاتے ہیں۔

ادب کی بحث عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہے۔ کوئی اسے نفس کاملہ انسانی کے اس مطالعہ کا نام دیتا ہے جس سے نفس کے معائب اور محاسن سامنے آجاتے ہیں تو کوئی ادب کے حصول مسرت کا نام دیتا ہے اور کوئی جملہ علوم کی کتب کے مطالعہ کو ادب کہہ دیتا ہے جس نے جیسا سوچا ویسا ادب کے بارے میں اپنا نظریہ قائم کرلیا۔ مگر ادب کی جو مبسوط اور واضح صورت حال ڈاکٹر وزیر آغا نے ہمارے سامنے رکھی ہے شاید ہی ایسی ادب کی تصویر کسی نے دکھائی ہو۔ ان کے نزدیک ادب وہ عامل اور متحرک ہے جو چیزوں کا رخ متعین کرتا ہے۔ گویا ادب جہت نما ہے۔ ادب امام ہے ادب قبلہ نما ہے۔

ادب کا عمودی اور بلندی کی طرف رخ وہ صراط ہے جس کا ذکر جملہ الہامی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس طرح ادب ہمیں اعلیٰ اور بلند تر سطح پر خدا سے ملاتا ہے اور جو ہستی خدا سے ربط پیدا کرتی ہے وہی تو ادیب ہوتا ہے۔ ادب کا پستی کی طرف رخ اہلسیت کہلاتا ہے۔ یہ تشکیک، اوہام اور ظن وتخمین کے سوا اور کچھ نہیں جبکہ ادب عالیہ یقین ہے، ایمان ہے، ایقان ہے۔ اسی سے تو مولائے کائنات علی ابن ابی طالب کا فرمان ہے۔ مرجاؤ مگر جاؤ نہ پستی کی طرف۔ سورۃ الحمد میں بھی یہی ارشاد قدرت ہے "اے اللہ ہیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ نہ ان کا راستہ جو گمراہ اور مغضوب ہوئے۔ اعلیٰ سطح پر ادب ایک شفاف جھیل کی طرح ہے جبکہ پست ترین سطح پر ادب ایک گندے پانی کے جوہڑ کی شکل ہے۔

اسی طرح ثقافت کے بارے میں جناب ڈاکٹر وزیر آغا دوٹوک فیصلہ سناتے ہیں کوئی ابہام نہیں کوئی تشکیک نہیں۔ لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں مگر ثقافت کا رخ اور اس کی واضح تعریف نہ کرسکے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ثقافت کو یوں واضح کیا ہے کہ "ثقافت اقدار کے اظہار کا نام ہے جبکہ تہذیب ان اقدار کو عوام کی سطح پر قبول کرنے کا نام ہے تمدن انہی اقدار کے مطابق عملی طور پر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ اگر ثقافت کے اظہار کے پیمانوں اور ظروف کا ذکر کیا جائے تو اس پر کتابوں پر کتابیں رقم ہو سکتی ہیں۔ ثقافت کے اظہار اور ترسیل کے لیے شاعری، مصوری، نقاشی، خطاطی، مصوری، موسیقی وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مگر مذہب میں اس کے اظہار کے وسیلے اور ہیں جیسے مذہب اسلام میں ثقافت کی ترسیل واشاعت کے ذرائع، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، تلاوت کلام مجید اور خود قرآن مجید ثقافت کی ایک لامتناہی کو اپنے اندر سمیٹے اور سموئے ہوئے ہیں اسی طرح تہذیب اور تمدن، پھر مختلف فرقوں میں ثقافت کے اظہار کے معیار الگ الگ ہیں۔

گیت، غزل اور نظم کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے کوئی بے خبر نہیں لوگوں نے اپنے اپنے طور پر انہیں ڈیفائن Define کیا ہے۔ مگر جیسے وزیر آغا نے ان کی وضاحت کی ہے اور متعارف کرایا ہے کوئی بھی اس طرح تعارف نہیں کراسکا۔ آغا صاحب اپنی کتاب اردو شاعری کا مزاج میں گیت غزل اور نظم کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں۔

"گیت نسوانیت کے جذباتی اظہار کی ایک صورت ہے۔ اس کا گہرا تعلق زمین سے ہے جو زمین عورت ہے، گیت کا اصل مزاج فراق اور مفارقت کی آگ سے مرتب ہوتا ہے۔ کالیداس کی شکنتلا میں راجہ شکنتلا کو جنگل میں ملتا ہے اس سے بیاہ رچاتا ہے اور اس کے دل میں محبت اور اس کے رحم میں نطفہ چھوڑنے کے بعد واپس چلا جاتا ہے اور شکنتلا کو بھول جاتا ہے تو شکنتلا کے دل میں محبت کی کسک اور بیقراری جنم لیتی ہے وہی غزل کا اصل موضوع ہے۔ گیت عورت کی آزادی اور بے قراری سے جنم لیتا ہے۔ یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب زمین سے چمٹی ہوئی عورت شعور ذات کی پہلی کرن سے آگاہ ہوتی ہے۔ گیت خالصتاً جذبے کی پیداوار ہے۔"

آغا صاحب فرماتے ہیں کہ غزل جذبے اور تخیل کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ گیت اس وقت جنم لیتا ہے جب عورت کا دل محبت کے بیج کو قبول کر لیتا ہے۔ دوسری طرف غزل اس بیج کے بارور ہونے اور نئے پیکر کے وجود میں آنے کی داستان پیش کرتی ہے تاہم غزل اس نومولود کو بحیثیت کُل پیش نہیں کرتی۔ یہ کام نظم کا ہے۔ غزل تو ماں اور بچے کے ربط باہم کے ایک بالکل مختصر دور کی عکاسی تک محدود ہے۔ یہ صرف سورج کے طلوع ہونے کے منظر کو پیش کرتی ہے۔ ایک ایسا منظر جس میں سورج ابھی دھندلکوں سے برآمد نہیں ہوتا۔ تاہم اس نے رات کی تاریکی سے رہائی یقیناً حاصل کر لی ہے۔ غزل دن اور رات کے اسی سنگم پر پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے غزل میں جذبے کی زمین پر پہلی بار تخیل نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ غزل میں محبوب بظاہر ایک عورت ہے لیکن بنیادی طور پر عورت ماں ہی کا ایک روپ ہے اور بچے کے لیے ماں تذکیر وتانیث (مادری) سے ماروئی ہوتی ہے۔

گیت جنگل کی پیداوار تھا۔ اور جنگل میں لامسہ، سامعہ، اور شامہ متحرک ہوتی ہے مگر باصرہ پس منظر میں ہوتی ہے۔ لامسہ، سامعہ اور شامہ کی تنگ وتار کا عمل محدود ہوتا ہے۔ یہ گیت کی فضا ہے۔ دوسری طرف غزل جنگل کے کنارے کھڑے ہو کر باہر کی دنیا پر نظر ڈالتی ہے۔ سورج غزل کے عاشق اور چاند کی طرح ہے۔ غزل بیک وقت بت پرستی کی ایک صورت ہے اور اس سے اوپر اٹھنے کی ایک کاوش بھی...... اس میں انفرادیت کی جست بھی ہے اور لپٹنے کا رجحان بھی۔ یہی غزل کا مزاج ہے۔

ہر سو ترے وجود کی خوشبو تھی خیمہ زن
وہ دن کہ اپنا گھر بھی ترا گھر لگا مجھے

اردو نظم کے ضمن میں آغا صاحب فرماتے ہیں۔

گیت کل کے بدن میں جزو کے ابتدائی محرک کا غماز ہے۔ اور غزل جزو اور کل کے عارض فراق کی نشان دہی کرتی ہے لیکن نظم جزو کی اس حیثیت سے متعلق ہے۔ جب وہ نشوونما پا کر خود ایک کل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یوں کہنا غلط ہوگا کہ گیت بطن مادر میں زندگی کی ابتدائی اُتھل پتھل سے مماثل ہے۔ اور یہ انسانی زندگی کے اس دور کی پیداوار ہے جب بچہ ابھی ماں سے جدا نہیں لیکن ماں نے اس کی طبیعت میں ایک انقلاب ضرور پیدا کردیا ہے۔ چنانچہ اسے شعور کی پہلی کرن کا نام دینے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ دوسری طرف غزل بچے کے بطن مادر سے جدا ہوجانے کے عمل سے مشابہ ہے مگر فراق کی صورت عارضی حیثیت سے مختلف نہیں۔ کیونکہ دوسرے لمحے بچہ شیر مادر کے لیے دوبارہ ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ جوانی کو پہنچ کر بچہ ایک انفرادی کل کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ چنانچہ نظم زندگی میں انفرادیت کے بھرپور اظہار کی ایک صورت ہے"

ڈاکٹر وزیر آغا نے، چاہے تنقید ہو، ادب ہو، شاعری ہو یا انشائیہ ہر میدان میں اردو ادب کو وہ کچھ عطا کیا ہے کہ جو کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ اردو زبان اتنی زرخیز اور اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ اب اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ عالمی ادب کے سامنے سرفخر سے اٹھا کر چل سکتی ہے۔ اس عظمت اور عالمی ادب میں اس کی قبولیت کا سہرا ڈاکٹر وزیر آغا کے سر ہے۔ وہ اب ہم میں وجودی طور پر نہیں ہیں مگر معنوی اور روحانی طور پر اپنے لفظ لفظ میں مستنیر اور منور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل...... آمین ثم آمین

❖OOO❖

سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کی یادگار تقریبات

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
319 وائی علامہ اقبال کالونی سرگودھا

ڈاکٹر وزیر آغا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے بارے میں میرا کچھ لکھنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کے سامنے چراغ ۔۔۔۔ بعض ادبی شخصیات پوری زندگی کسی ایک صنف میں نام پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے کسی ایک صنف میں نہیں لکھا بلکہ انھوں نے نظم، غزل، انشائیہ، سفرنامہ، تنقید، اداریہ، خطوط، سوانح عمری، دیباچہ نویسی میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ عالمی سطح پر تنقید اور شاعری میں ان کی شہرت لازوال ہے۔ ان کی ذاتی تخلیق کا ایک اک ورق در حقیقت اوراق کی صورت ادبی دنیا میں ہمیشہ انھیں اور ان کی خدمات کو زندہ رکھے گا۔ پاکستان اور دنیا کے بیشتر ممالک میں ان کی تخلیقات آج حوالہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں اردو زبان راج کر رہی ہے وہاں وہاں ڈاکٹر وزیر آغا، وزیر نہیں بلکہ آغا کے طور پر مسند اعزاز پر متمکن ہیں۔ بھارت میں ان کا تخلیقی سفر ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کی سطح کی کئی ڈگریوں کی بلندیاں حاصل کر چکا ہے۔ وہ اس اعتبار سے بہت خوش بخت ہیں کہ انھیں ان کی زندگی میں ہی عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا قلم انھیں قاری کے ذہن سے لے کر پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا تک لے گیا۔ انھیں میڈیا نے اُس پذیرائی سے نہیں نوازا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی ایک وجہ ان کا سرگودھا سے تعلق ہے۔ صوبائی اور مرکزی سطح پر شہرت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ناساعد حالات کے باوجود انھوں نے بادِ مخالف کے تھپیڑوں کا نہ صرف منہ توڑ جواب دیا بلکہ اپنا تخلیقی سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھا ان کے وصال 7 ستمبر 2010ء کے بعد کئی وہ چہرے بے نقاب ہوئے جنھیں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھنا سکھایا اور وہ ان کے انتقال پر فاتحہ کے لیے بھی نہ جا سکے۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے ذہن کی سکرین پر کئی ایسی یادگار تقریبات آج بھی چلتی پھرتی تصویروں صورت موجود ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کسی نہ کسی حوالہ سے شرکت کی۔ یہ چند سطور ان مفصل تقریبات کا احاطہ تو نہیں کر سکتیں لیکن نو آموز لکھنے والوں کے لیے نشان منزل ثابت ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے پاکستان بالخصوص سرگودھا کا نام پوری ادبی دنیا میں متعارف کروایا ہے ۔ وہ پاکستان اور کئی ممالک کی ادبی تقریبات میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ سرگودھا چونکہ ان کا آبائی شہر تھا جہاں انھوں نے سکونت بھی اختیار کی اسی لیے وہ جہاں کہیں بھی جاتے اپنی مٹی کو ہمیشہ یاد رکھتے۔ انھوں نے سرگودھا کو ادبی لحاظ سے اپنی زمین کی طرح زرخیز کیا جس کے نتیجہ میں سرگودھا کا شمار ادبی دنیا میں ایک معتبر حوالے کے طور پر لیا جانے لگا ہے۔

○○ ڈاکٹر وزیر آغا سے راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کا تعلق 1970 سے ہے۔ ان سے ملاقات کا اعزاز 1970ء میں سرگودھا میں منعقدہ اردو کانفرنس کے موقع پر حاصل ہوا۔ یہ کانفرنس انجمن ترقی اردو سرگودھا کے زیر اہتمام الحاج محمد شریف اختر سرحدی کی سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ قائد اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر وزیر آغا سمیت متعدد خادمان اردو شریک ہوئے۔ پہلی بار ان کی موجودگی میں مقالہ پڑھنے کا اور ان سے دوسری بار ملاقات بزم ادب گورنمنٹ کالج سرگودھا میں یوم اقبال کی تقریب میں ہوئی، جو 7 مئی 1971ء بروز جمعۃ المبارک گورنمنٹ کالج ہال میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت چیئرمین بورڈ ڈاکٹر صفدر حسین نے کی جبکہ پرنسپل کیپٹن ایم آر علوی اس کے منتظم تھے۔ اس تقریب میں اقبال کے حوالے سے اظہار خیال کا موقع پا کر مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت میرے سینئرز میں سیف السلام طاہر، نذیر خالد (محکمہ تعلقات عامہ)، سعید احمد خان (سابق کمشنر سرگودھا) اور خواجہ ظفر اقبال (کیسٹ اینڈ ڈائجسٹ)، شامل تھے۔ بعد ازاں 17 ستمبر 1971ء کو گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ایڈیٹوریم میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ کی کمپیئرنگ کے دوران ان سے قربت کا شرف حاصل ہوا۔ اس یادگار مشاعرے کی صدارت جواں جنگی ترانوں کے بوڑھے ہیرو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے کی۔ اس مشاعرہ میں بہت سے نامور شعراء کرام نے کلام پیش کیا۔ کچھ ایسے بزرگ شعراء کرام بھی شامل تھے جو آج ہم میں موجود نہیں ہیں اور جن کی حسیں یادیں سرگودھا کی ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان میں خاص طور پر سید الطاف مشہدی، مولانا اختر سرحدی، پروفیسر قیوم شاکر، علامہ رشک ترابی، حافظ یوسف آزاد، میر عبدالرشید اشک، پروفیسر اقبال جعفری، شوکت راز، پروانہ شاہ پوری، تاجدار دہلوی، مرزا ماسول انور، انور حیدری، صوفی فقیر محمد، نصرت چودھری، بشیر راجن ادیب، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، جوہر نظامی، پروفیسر خلیل بدایونی، افضال ناز گنگوہی، سیف زبیری، علی حسنین شیفتہ، غلام حسین قیصر، وزیر حسین شیرازی، حاتم علی حاتم اور سائیں نذیر محمد قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، شاکر نظامی، پرویز بزمی، ریاض احمد شاد، سعید پراچہ، سرور کامران، خالد اقبال یاسر، ناصر عباس، بیدار سرمدی، ممتاز عارف، اور دیگر شعراء کرام نے بھی اس مشاعرہ میں اپنا کلام پیش کیا۔

○○ 15 اپریل 1977ء، جشن بہار (میلہ منڈی مویشیاں) سرگودھا کے موقع پر جناح ہال سرگودھا میں محفل مشاعرہ زیر صدارت جناب سردار باقر علی خان قائم مقام ڈپٹی کمشنر منعقد ہوئی۔ جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا مہمان خصوصی تھے اور مشتاق اسلام آبادی نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ عبدالکریم قدسی، ممتاز عاجز، پروانہ شاہ پوری، راغب شکیب، جمیل یوسف، محمود اسیر، مس رضیہ ناہید چوہدری، ظہیر الدین ظہیر، تنویر صہبائی، سعید علوی، صوفی فقیر محمد، وزیر حسین شیرازی، غلام حسین گل، قمر لدھیانوی، اجمل تنویر ہاشمی، پرویز بزمی، انجم نیازی، محسن تابش، شاکر نظامی، مصدق حسین خالد، نصرت چوہدری ریاض احمد شاد، مسرور بدایونی، رشک ترابی، میر عبدالرشید اشک، اور خورشید رضوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

○○ 4 جولائی 1978 کو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام سکوارڈن لیڈر این اے صوفی کے اعزاز میں محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ کلام پیش کرنے والوں میں مولانا اختر سرحدی، بشیر راجن ادیب، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، پرویز بزمی، محمد شریف باسط شامل تھے۔

○○ 7 اپریل 1979ء کو حلقہ ارباب ذوق سرگودھا کی ایک نشست مرتضیٰ برلاس کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی ساقی فاروقی تھے۔ نظامت کے فرائض راغب شکیب تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر خورشید رضوی نے اپنی نظم تنقید کے لیے پیش کی۔ نظم پر غلام جیلانی اصغر، ساقی فاروقی، مرتضیٰ برلاس، ڈاکٹر وزیر آغا، سیر حاصل گفتگو کی۔ اجلاس میں پرویز بزمی، فخر الدین بلے، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، تنویر صہبائی اور نذیر احمد خالد نے شرکت کی۔ اجلاس کے اختتام پر ساقی فاروقی نے سامعین کے سوالات کے جوابات دیئے۔

○○ سرگودھا اکادمی نے زیر اہتمام معروف شاعر وادیب پروفیسر فیروز شاہ کے اعزاز میں ایک تقریب ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اظہار خیال کرنے والوں میں یوسف خالد، ممتاز عارف، نجمہ منصور، ذوالفقار سندھو (ذوالفقار احسن)، عابد سیال، صفدر رضا صفی، نذیر شیرزادہ، صوفی

نقیر محمد، راقم الحروف، ظہیر الدین ظہیر، سجاد نقوی، پرویز زیدی، سید وصی حسین قاسمی اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر شامل تھے۔ مقررین نے کہا کہ فیروز شاہ زندگی کے لطیف جذبوں کا عکاس ہے اس کی شاعری اس کے وسیع تجربے کی آئینہ دار ہے وہ تحمل کی ثقافت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کا قرینہ جانتے ہیں۔ نوجوان ادیب منظور رضا صفی نے انشائیہ "مٹی" پیش کیا جسے ایک کامیاب تخلیقی کاوش قرار دیا گیا۔ فیروز شاہ نے کہا کہ سرگودھا میں ادبی تقریبات کا فروغ یہاں کے ادباء و شعراء کے اتحاد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

OO 2 اپریل 1980ء کو معروف بزرگ شاعر و خوش نویس وزیر شیرازی کی یاد میں تعزیتی تقریب کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے شرکت کی۔

OO 2 اپریل 1980ء کو انجمن ترقی اردو سرگودھا نے انجمن کے بانی رکن تاج الدین حقیقت، وزیر علی شیرازی، حافظ یوسف آزاد کی وفات پر تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔

OO 26 فروری 1980ء کو حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام حافظ یوسف آزاد اور وزیر حسین شیرازی کی یاد میں ایک تعزیتی تقریب ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی یونس ارشاد اور سید قلب عباس تھے۔ نظامت کے فرائض راغب شکیب نے انجام دیئے۔ مقررین میں پرویز بزمی، عبداللہ وفا، راغب شکیب، انگر سرحدی، سجاد نقوی، پروفیسر ارشاد، قلب عباس، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور یونس ارشاد نے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ مقررین نے اپنے مضامین میں کہا کہ مرحومین غیر معمولی اوصاف کے مالک تھے اُن کی شخصیتیں خلوص اور محبت کا محور تھیں وہ خوش اخلاقی، بے نفسی اور حق گوئی کو اپنی زندگی کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ بعض شعراء نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ان میں امتیاز علی بخاری، محمد عمر عاصم، شبلی پانی پتی، پرویز بزمی، صوفی نقیر محمد، مرزا نقیر محمد سعید، کامران رشید، عزیز انبالوی، ایم نصیر مغل، مولانا انگر سرحدی، اقبال منظر اور محمد یونس ارشاد کے نام شامل ہیں۔ بعد ازاں مرحومین کے ایصالِ ثواب کی دعا کی گئی۔

OO کیم مارچ 1981ء کو سماجی رہنما الحاج میاں محمد انور کی رہائش گاہ پر ایک شاندار محفل شعر و سخن منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر علی حسنین شیفتہ نے کی جبکہ برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر و ادیب اور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا مہمان خصوصی تھے۔ اس محفل مشاعرہ کے لیے طرح مصرع دیا گیا تھا "چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" جس پر تمام شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اس محفل میں جناب کامران رشید، محمد اقبال منظر، شبلی پانی پتی، راقم الحروف، ڈاکٹر مسعود بخاری، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، صوفی نقیر محمد، مجید تمنا، حسن عباس زیدی، میاں محمد انور، انجم نیازی، رشک ترابی، غلام جیلانی اصغر، علی حسنین شیفتہ اور ڈاکٹر وزیر آغا نے کلام سنایا۔

OO 27 مارچ 1981ء کو انجمن ترقی اردو سرگودھا کے زیر اہتمام اردو کے معروف شاعر جناب نعیم اظہر کے شعری مجموعہ "چہرہ بہ چہرہ" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت دنیائے ادب کے معروف نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی ملک کے معروف شاعر مرتضیٰ برلاس تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ تقریب میں پروفیسر شیخ محمد اقبال، صوفی نقیر محمد، راقم الحروف، کامران رشید، مس روبینہ مقصود، حمیدہ شاہین زیدی، مس کوثر شاہین، نے نعیم اظہر کی شاعری پر مقالات پڑھے۔ عثمان عرفان نے ان کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لیا، جان کاشمیری نے خاکہ پڑھ کر سنایا، انوار قمر نے نعیم اظہر کی شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے اس ادبی روش پر کڑی تنقید کی جس کے تحت ادبی جاگیردارانہ ذرائع ابلاغ کے ارباب اقتدار باصلاحیت فنکاروں کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس تقریب میں اقبال منظر اور محترمہ طاہر پروین نے چہرہ بہ چہرہ کے خالق کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

OO کیم مارچ 1981ء کو ایک محفل سخن سماجی رہنما میاں محمد انور کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت پروفیسر علی حسنین شیفتہ نے کی ڈاکٹر وزیر آغا اس کے مہمان خصوصی تھے۔

OO 2 جون 1981ء کو معروف شاعر منیر نیازی کے اعزاز میں آفیسر کلب سرگودھا میں "شام غزل" کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ فیاض تحسین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ پروفیسر ریاض احمد شاد۔ فیاض تحسین، پرویز بزمی، اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے دور میں گلوکار امیر علی نے ساز و آواز کے ساتھ منیر نیازی کی چند غزلیں گائیں۔ تقریب کا تیسرا دور مشاعرے پر مشتمل تھا جس میں محمود اسیر، ممتاز عارف، صوفی نقیر محمد، پروانہ شاہ پوری، راغب شکیب، حسن عباس زیدی، ظہیر الدین ظہیر، شفیع صابر، کوثر علی۔ شیخ محمد اقبال، کامران رشید، رجبہ مظفر حسن منصور، این اے صوفی، مجید تمنا، شوکت راز، ریاض احمد شاد، انجم نیازی، میاں محمد انور، شان احمد شان، پرویز بزمی، خورشید رضوی، رشک ترابی، وزیر آغا اور منیر نیازی نے اپنا تازہ کلام پیش کیا۔

OO 28 اکتوبر 1983ء کو سرگودھا کی ایک یادگار تقریب لالہ اردو مولانا انگر سرحدی کے اعزاز میں پریس کلب سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ اس یادگار تقریب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر محمد منور مرزا، قمر انبالوی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر ایوب صابر، علی احمد پراچہ کوہاٹی، علامہ رشک ترابی، میاں محمد انور، مظفر منصور، اقبال منظر، منظور دھریموی، صوفی نقیر محمد، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، محسن نظامی، پروفیسر اجمل ہاشمی، محمود اسیر، حبیب تائب صحرائی، حسرت کوہاٹی، شاکر عروجی، بشیر راجن ادیب، خواجہ شمیم بھیروی، جوہر نظامی، شعیب شاہد، میاں محمد اکرم بھٹی اور عبدالعزیز خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا انگر سرحدی کو بابائے سرگودھا کے خطاب سے نوازا۔

OO 3 نومبر 1983ء کو مولانا انگر سرحدی کے اعزاز میں شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی۔ انگر سرحدی کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر منور مرزا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خورشید رضوی، ایوب صابر، احمد پراچہ، پروفیسر اجمل ہاشمی، راقم الحروف، میاں محمد انور، اور میاں محمد اکرم بھٹی نے اظہار خیال کیا۔ جبکہ محسن تابش، عبدالعزیز خالد، اور محمد شعیب نے منظوم ہدیہ تحسین پیش کیا جبکہ، خاطر غزنوی، قارع بخاری، ڈاکٹر سہیل بخاری، میر عبدالصمد خان، رضا ہمدانی، مولانا فضل محبوب، حافظ لدھیانوی، سید ملطوف شفیق، محمود شوکت اور خواجہ شمیم بھیروی کے ارسال کردہ مقالات میں سے اقتباسات پیش کیے گئے۔

OO 18 جنوری 1985ء کو پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے اولین شعری مجموعہ "میں اور میں" کی تقریب رونمائی گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کی صدارت نامور نقاد و شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی جبکہ تعلیمی بورڈ سرگودھا کے چیئرمین ڈاکٹر انور چودھری مہمان خصوصی تھے۔ مقررین میں ڈاکٹر خورشید رضوی، نذیر خالد، پروفیسر ریاض احمد شاد، پروفیسر افضل ملک، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل تھے۔

OO 21 اپریل 1986ء کو گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں یوم اقبال کے موقع پر ایک تقریب منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ مہمان خصوصی علامہ انگر سرحدی تھے۔ ڈاکٹر خورشید الحسن رضوی نے علامہ اقبال کی شاعری میں امید کو موضوع سخن بنایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے "عشق و خرد اقبال کی نظر" کے اقتباسات پیش کیے۔ مولانا انگر سرحدی نے افکار اقبال کے علاوہ منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ راقم الحروف کو اس تقریب کی نظامت کا اعزاز حاصل ہوا۔

OO 22 اپریل 1985ء کو بزم ادب گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا کے زیر اہتمام ملک کے معروف صاحب اُسلوب آفریں شاعر مجید امجد کی گیارہویں برسی کے موقع پر پروقار تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت دنیائے ادب کے معروف نقاد، انشائیہ نگار و شاعر، ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی مولانا انگر سرحدی تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ مقررین میں ڈاکٹر وزیر آغا، راقم الحروف، پروفیسر ریاض احمد شاد، جمیل یوسف، پروفیسر افضل ملک، ڈاکٹر خورشید رضوی نے مقالات پیش کیے جبکہ امتیاز علی

اور محمد طفیل ثاقب نے کلام مجید امجد ترنم کے ساتھ پیش کر کے خوب داد وصول کی۔ آصف راز، ظہیر الدین ظہیر، اخلاق عاطف، اور مولانا انگر سرحدی نے مجید امجد کے حضور منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ادارہ کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد رضوی کی کاوشوں سے یہ تقریب بہت کامیاب رہی۔

○○ 25 مئی 1985ء انجمن ترقی اردو اور سرگودھا آرٹس کونسل کے زیر اہتمام معروف شاعر جمیل یوسف کے شعری مجموعہ "غزل" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے حصہ میں آئی۔ گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول سرگودھا کی پرنسپل مس بلقیس شاد مہمان خصوصی تھیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، صوفی نقیر محمد، راقم الحروف، پروفیسر مس گلنار، اور مولانا انگر سرحدی نے جمیل یوسف کی شاعری پر تبصرہ کیا۔

○○ 9 نومبر 1986ء کو گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں 10 بجے دن تقریب بیاد اقبال ناظم تعلیمات کالجز سرگودھا ڈویژن سعید ناصر کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ انگر سرحدی، خورشید رضوی، عصمت ملک، عبید اللہ سیال، عبدالعزیز، ملک محمد اختر، شیخ آصف اور دیگر مقررین نے فکر اقبال کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔

○○ 9 نومبر 1986ء کی شام پروفیسر ریاض احمد شاد کی مرتب کردہ کتاب "کلیات لالی" کی تقریب رونمائی گورنمنٹ کالج سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ نظامت کے فرائض صاحبزادہ سلیم الرسول نے ادا کیے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے سپاسنامہ پیش کیا۔ مقررین میں ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر میاں شان احمد، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اور وزیر آغا شامل تھے۔ پروفیسر ریاض احمد شاد نے مقررین اور منتظمین تقریب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی تازہ غزلیں پیش کیں۔ پروانہ شاہ پوری، ممتاز عارف، شبلی پانی پتی، ظہیر الدین ظہیر، پروفیسر شیخ محمد اقبال، اور دیگر شعراء کرام نے پروفیسر ریاض احمد شاد کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں نظمیں پڑھیں تقریب میں اہل علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

○○ 1986ء ایک عظیم الشان تقریب بیاد اقبال، بزم ادب اور انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال اور شاہین کے حوالے سے گفتگو کی۔ چیئرمین بورڈ ڈاکٹر انور چودھری بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

○○ 30 دسمبر 1988ء کو سرگودھا آرٹس کونسل کے زیر اہتمام شاندار محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر وزیر آغا، جاوید قریشی، عطاء الحق قاسمی، تسنیم گلزار، حسن رضوی، امجد اسلام امجد، شہزاد احمد، بسمل صابری، مجیر ابوذری، حافظ لدھیانوی، قتیل شفائی، طفیل ہوشیارپوری، سید ضمیر جعفری، غلام جیلانی اصغر، نائلہ رفیع، سید مسعود شاہ، یونس خیال، یوسف خالد، راقم الحروف، ممتاز عارف، صوفی نقیر محمد، شیخ محمد اقبال، شاکر نظامی، ظہیر الدین ظہیر، رشک ترابی اور انگر سرحدی نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔

○○ 2 فروری 1989ء کو آرٹس کونسل نے نیشنل سنٹر سرگودھا میں معروف آرٹسٹ نذیر شیرزادہ کی تصنیف "فن مصوری" کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت صدر شریک ہوئے شبنم جاوید، بدرالزماں، ایم اے لطیف، اور راقم الحروف نے اظہار خیال کیا۔

○○ 23 دسمبر 1989ء کو سرگودھا اکادمی نے فیاض تحسین کی نظموں کے مجموعہ "رزق ہوا" کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پروفیسر افضل ملک، پروفیسر ریاض احمد شاد، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر اجمل ہاشمی، افسر ساجد، حافظ محمد یوسف، صوفی نقیر محمد، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ اور شہزادہ کبیر نے مقالات پڑھے۔

○○ قائد اردو ڈاکٹر سید عبداللہ نے نفاذ اُردو کی تحریک شروع کی تو ڈاکٹر وزیر آغا ان کے ہم قدم رہے۔ انوار الدین محکمہ نہار سرگودھا تشریف لائے تو جس شخصیت نے انھیں ڈاکٹر انور سدید بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہ ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ ڈاکٹر انور سدید سیمابی شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے مشن کی تکمیل کے لیے سرسید احمد خان کی طرح سرگرمی سے کام کیا۔ ادبی مجلہ "اوراق" لاہور کو جہاں عارف عبدالمتین، سجاد نقوی، اور وزیر آغا نے جدوجہد کی وہاں انور سدید کی کوششوں نے اسے بام عروج بخشا۔ سرگودھا میں شاہین ریڈیو سروس شروع ہوئی تو ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے ہوا کے دوش پر علم و ادب گھر گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔ پی اے ایف کالج سرگودھا کے پرنسپل رحمٰن قریشی اور ان کے معاون ڈاکٹر سہیل بخاری نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی خدمات سے بہت استفادہ کیا۔ رحمٰن قریشی کے دور میں کئی مشاعرے پی اے ایف کی عسکری تاریخ میں کامیاب ہوئے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ اسلم بلوچ، لیئق احمد، گروپ کیپٹن این اے صوفی، تقوی صاحب، اور دیگر صاحبان ذوق نے بھی پی اے ایف کالونی میں کئی ادبی نشستوں کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک تحریک کی صورت کام کرتے رہے۔ یہ امر باعث فخر ہے کہ کمشنر نذیر احمد چودھری (16 ستمبر 1988ء تا 10 ستمبر 1991ء) کمشنر راؤ عبدالرشید (15 ستمبر 1991ء تا 20 فروری 1994ء) جبکہ سید تجمل عباس (21 فروری 1994ء تا 5 اگست 1996ء) تک سرگودھا میں علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان افسران کو ادب کی طرف مائل کیا۔ ان تینوں کمشنروں کے ادوار میں کل پاکستان مشاعرے منعقد ہوئے جن میں ملک بھر سے شعراء کرام شرکت کرتے رہے۔ ان کے اسمائے گرامی کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان 9 کل پاکستان مشاعروں کے علاوہ جشن سرگودھا کے مشاعرے بھی یادگار رہے۔ ڈپٹی کمشنر مظہر علی خاں، حامد علی خان، راجہ گل نواز، غضنفر علی ضیاء، چودھری طاہر علی، صابر علی، اور دیگر افسران کے تعاون سے بڑی تقریبات انعقاد پذیر ہوتی رہیں۔ ان مشاعروں کی نقابت راقم الحروف کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن فخر الدین بلے، ایڈیشنل کمشنر مرتضیٰ برلاس، ڈپٹی ڈائریکٹر مشتاق اسلام آبادی، ڈائریکٹر فوڈ رفعت سلطان، ڈائریکٹر فوڈ میاں خدا بخش، چیف آفیسر مجید تمنا، سٹی مجسٹریٹ فیاض تحسین، ایڈیشنل کمشنر فاروق سید، کنٹرولمنٹ ایگزیکٹو جمیل یوسف، اور ایسے ہی کئی صاحب ذوق افسران نے سرگودھا کی ادبی فضا کو معطر رکھا۔

○○ 10 جون 1990ء کو بزم ترقی علم و ادب سرگودھا کے زیر اہتمام معروف شاعر علامہ رشک ترابی کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب میری ان ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، کمشنر سرگودھا ڈویژن نذیر احمد چودھری، میاں خدا بخش، میاں شان احمد، پروفیسر مظفر مرزا، صاحبزادہ عبدالرسول، راجہ محمد شریف، راقم الحروف، صوفی نقیر محمد، یونس خیال، یوسف خالد، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، شاکر نظامی، واحد حسین نشان، اخلاق عاطف اور محمود اسیر نے خطاب کیا۔

○○ 1990ء میں قرارداد پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر راقم الحروف کی ایک ہی وقت میں چار کتب "کرچیاں"، "نذر پاکستان"، "قرارداد سے قیام پاکستان تک"، "قرارداد پاکستان کوئز" منظر عام پر آئیں تو پروفیسر یوسف خالد اور یونس خیال کی شفقت سے ایک تقریب سرسید ہاسٹل کلب روڈ سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر وزیر آغا صدر تقریب تھے۔ یوسف خالد، یونس خیال، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، امجد الہٰی، سجاد نقوی، شاکر نظامی، معین نظامی، نے بھی اظہار خیال کیا۔

○○ ڈاکٹر انور سدید کو جب پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سرفراز کیا گیا تو ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان ادبی تقریب حلقہ ارباب ذوق سرگودھا کے زیر اہتمام دلکشا ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ جن مشاہیر ادب نے ڈاکٹر انور سدید کے مقالہ "اردو ادب کی تحریکیں" کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، پرویز بزمی، ڈاکٹر خورشید رضوی، راغب شکیب، مشتاق اسلام آبادی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور دیگر دانش ور شامل تھے۔

○○ بزم ترقی علم و ادب اور سرگودھا پریس کلب کے زیر اہتمام مئی 1991ء کو ممتاز عارف کے پنجابی مجموعہ کلام "چپ دی بکل" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمانان خصوصی ڈپٹی کمشنر سرگودھا میاں

توقیر احمد فائق اور کرنل مسعود الحق تھے۔ اعزازی نشستوں پر بزم ترقی علم و ادب کے سرپرست اعلیٰ الحاج میاں محمد انور پریس کلب کے صدر ایم ایچ ظفر اور جنرل سیکرٹری سجاد عباس نیازی ایڈووکیٹ موجود تھے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، صاحبزادہ عبدالرسول، علامہ رشک ترابی، ملک محمد معظم، یوسف خالد، یونس خیال، محترمہ طیبہ ضمیر قریشی، اور صوفی فقیر محمد نے اظہار خیال کیا۔

○○ 21 جولائی 1991ء کو بزم ترقی علم و ادبی سرگودھا رائٹرز کلب سرگودھا، سرگودھا اکیڈمی کے زیر اہتمام یوسف خالد کے شعری مجموعہ "زرد موسم کا عذاب" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر مہمان خصوصی تھے۔ این اے صوفی، علامہ رشک ترابی، پروفیسر سجاد نقوی، پروفیسر صابر پرویز، راقم الحروف، ممتاز عارف، یونس خیال، اور ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے اظہار خیال کیا۔

○○ کیم جنوری 1991ء کو آرٹس کونسل سرگودھا اور مجلس تعمیر ادب رجسٹرڈ کے اشتراک سے پروفیسر رشید گوریجہ کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی ڈائریکٹر کالجز ڈاکٹر بشیر احمد قریشی تھے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، پروفیسر اجمل ہاشمی، اعجاز حسین بلوچ، عمران واقف، پروفیسر انور رفیق اختر، پروفیسر شبیر احمد قادری، ندیم عادل، راقم الحروف شامل تھے جبکہ آصف راز، شاکر نظامی، اور منظور عباس اظہر نے منظوم ہدیہ تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ رشید گوریجہ نے ادب کو جز وقتی کام سمجھنے کی بجائے کل وقتی کام سمجھ کر کیا ہے۔ ان کے ہاں فنی پختگی کا احساس ملتا ہے اردو ادب و تنقید میں ان کے لیے خاصی گنجائش موجود ہے۔

○○ 26 جولائی 1991ء بزم ترقی علم و ادب اور سرگودھا رائٹرز کلب اور سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام پروفیسر یوسف خالد کے شعری مجموعے "زرد موسم کا عذاب" کی تقریب رونمائی فیصل ہال میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر مہمان خصوصی تھے اظہار خیال کرنے والوں میں رشک ترابی، این اے صوفی، پروفیسر سجاد نقوی، پروفیسر صابر پرویز، راقم الحروف، ممتاز عارف، یونس خیال اور ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ شعری رویے نئے رنگ و آہنگ سے مزین ہیں۔ یوسف خالد نے اپنا مدعا پیش کرنے کے لیے بھرپور فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے انھوں نے مزید کہا کہ اس کی شاعری تجربات و مشاہدات کی آئینہ دار ہے اور وہ انسان، انسانیت، سزا و جزا اور معاشرے کا نباض ہے۔

○○ 5 فروری 1992ء سرگودھا اکادمی نے کشمیری بھائیوں کی حق خود ارادیت کو ہدیہ تحسین پیش کرنے کے لیے تقریب کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی تقریب میں پروفیسر یوسف خالد، راقم الحروف، عامر رانا، صفدر رضا صفی، صوفی فقیر محمد، نذیر شیرزادہ، ندیم انجم، سلیم آغا اور دیگر احباب نے کشمیر کے حوالے سے گفتگو کی اور کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ کشمیری حریت پسند ایک دن اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے حق خود ارادیت کے حصول کی جدوجہد کشمیریوں کا حق ہے۔ شہیدوں کا لہو ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ پاکستانی عوام اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں۔

○○ 18 جولائی 1992ء کو ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ؛ یوسف خالد؛ سلیم حسن مرزا؛ پرویز بزمی؛ سجاد نقوی؛ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) اور یونس خیال شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ علم و ادب کے فروغ کے لیے ڈاکٹر انور سدید کی خدمات نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے ادب کے تمام گوشوں کو منور کر دیا ہے۔ اہل سرگودھا کو ان کی خدمات پر ناز ہے۔

○○ 26 ستمبر 1992ء کو پاسبان ادب کی سالانہ محفل مشاعرہ ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت ڈاکٹر لیاقت علی خان سابق ڈپٹی کمشنر سرگودھا کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ جبکہ مہمان خصوصی میاں محمد آصف (ایس پی) تھے۔ اعزازی مہمانوں میں پرویز بزمی اور فیض لدھیانوی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض عرفان اکبر اور سید جواد حسین جواد نے انجام دیے۔ تلاوت اور نعت کے بعد محمد عامر رانا پاسبان ادب کے صدر نے تنظیم کی گذشتہ سال کی کارروائی پر روشنی ڈالی۔ جن شعراء نے کلام پیش کیا ان میں محمد عامر رانا، تحسین نواز، طاہر عدیم، ذوالفقار سندھو (ذوالفقار احسن) شاہد محمود، عابد خورشید، اعجاز احمد اعجاز، خادم حسین مجاہد، عابد حسین صدف (عابد سیال) عرفان رشید، محمد اقبال، سید جواد حسن جواد، فراست علی فراست، نظر ملک، اخلاق عاطف، راقم الحروف، سلطان علوی، سید واحد حسین نشان، مسز فرخ ناز گیلانی، اقبال منظر، شبلی پانی پتی، یوسف خالد، صفدر خورشید، کامران رشید، صوفی فقیر محمد، پرویز بزمی، فیض لدھیانوی، اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل تھے۔

○○ کیم جولائی 1992ء کو علمی و ادبی شخصیت پیر سراج شاہ نے جھنگ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے اعزاز میں ایک یادگار تقریب کا اہتمام کیا جس میں صفدر سلیم سیال، صاحبزادہ رفعت سلطان، پروفیسر سمیع اللہ قریشی، بیدل پانی پتی، حکمت ادیب، این اے صوفی، یوسف خالد، انیس انصاری، ظفر سعید، حنیف باوا، خیر الدین انصاری، سہیل شیخ، غلام شبیر رانا، حامد عبداللہ ایڈووکیٹ، ظفر عباس قریشی، بیرسٹر ممتاز حسین، شجاعت ترمذی، عارف جاوید، سید محمد اسحاق، پروفیسر ڈاکٹر سعید ایڈووکیٹ، علی کوثر جعفری، سید محمد اسحاق، پروفیسر حسن اقبال، ڈاکٹر حسین، میاں ظفر سیال، پروفیسر محمد یعقوب بٹ، شفیق احمد شفیق، احمد تنویر، عارف شاہد عارفی، پیر محمد سراج شاہ، ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی خدمات کو ہدیہ تحسین پیش کیا۔

○○ 27 فروری 1992ء کو گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ صدارت کمشنر سرگودھا عبدالرشید خاں نے کی جبکہ مقررین میں یوسف خالد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، ممتاز عارف، نجمہ منصور، راقم الحروف، ظہیر الدین ظہیر، اسحاق الٰہی، زاہد منیر عامر، صفدر رضا صفی، فیروز شاہ، منیر ساجد، پروفیسر نیاز احمد، این اے صوفی، اور محمد ادریس ناز شامل تھے۔ نظامت کے فرائض این اے صوفی نے بخوبی انجام دیے۔

○○ 8 اپریل 1992ء کو سرگودھا اکادمی، رائٹرز کلب اور بساط ادب کے زیر اہتمام عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ اظہار خیال اور کلام پڑھنے والوں میں نصیر احمد ناصر، علامہ رشک ترابی، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، یوسف خالد، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، جبار پرویز، انوار فطرت، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، این اے صوفی، فیصل جاوید اور رانا محمد اشفاق شامل تھے۔ معززین کی بڑی تعداد نے تقریب میں شرکت کی۔

○○ 7 جون 1992ء کو بزرگ ترین شاعر، ادیب اور دانشور مرزا ماسول انور کے اعزاز میں ادبی تقریب ندیم اکادمی کے سبزہ زار میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول مہمان خصوصی تھے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، پروفیسر یوسف خالد، راقم الحروف، پروفیسر ریاض احمد شاد، ضامن علی حیدری، سید مسعود زاہدی ایڈووکیٹ، اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر شامل تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) نے انجام دیے۔ تقریب میں ذوالفقار احسن اور عابد خورشید بھی موجود تھے۔

○○ 10 جولائی 1992ء کو ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر انور سدید کے اعزاز میں سرگودھا اکادمی نے ایک شام منائی۔ جس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پروفیسر سجاد نقوی، پرویز بزمی اور دیگر نے ڈاکٹر انور سدید کے فکر و فن پر مقالہ جات پڑھے۔

○○ 15 جولائی 1992ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام محفل مسالمہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت نامور شاعر اور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر مہمان خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے ادا کیے۔ سید الشہداء امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے والوں میں سید وصی احمد کاظمی (وصی شاہ)؛ محمد مشتاق؛ سجاد نقوی؛ پرویز بزمی؛ نذر گیلانوی پروفیسر بشیر احمد؛ یوسف خالد؛ راقم الحروف، ذوالفقار احسن، سلیم آغا، ممتاز عارف، صوفی فقیر محمد، سلطان علوی، نجمہ منصور، اور میاں محمد آصف شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ شہید

انسانیت حضرت امام حسینؓ کی قربانی تاریخ انسانی کا اہم حصہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی قربانی باعث تقلید ہے۔ انھوں نے حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے کے لیے اپنا سب کچھ راہِ حق میں قربان کر دیا۔

○○ 28 اپریل 1992ء کو سرگودھا اکادمی، بزم ترقی علم و ادب اور سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام تقریب بیاد علامہ اقبال منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ تقریب میں پرویز بزمی، سجاد نقوی، سلیم آغا، یوسف خالد، ممتاز عارف، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، شامل تھے۔

○○ مئی 1992ء کو پاسبان ادب نے ایک تقسیم انعامات کی تقریب پریس کلب سرگودھا میں منعقد کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تقریب کی صدارت کی۔ جواد حسن جواد، محمد عامر رانا، آصف راز، میاں اکرم بھٹی، اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔ محمد عامر رانا کی خدمات اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔

○○ مئی 1992ء کو گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سوسائٹی نے "چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل" کی اشاعت پر مبارک باد دینے کے لیے دنیائے ادب کے معروف نقاد، شاعر و ادیب ڈاکٹر وزیر آغا کے اعزاز میں ایک عظیم الشان تقریب کا اہتمام کیا۔ کمشنر سرگودھا عبدالرشید خان نے صدارت کی۔ این اے صوفی اور یوسف خالد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر افضل خان نیازی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ادبی ذوق رکھنے والے احباب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

○○ یکم اگست 1992ء کو ڈاکٹر وزیر آغا پر تحقیقی مقالات کے حوالے سے ایک ادبی بزم سجائی گئی۔ شرکاء کو بتایا گیا کہ پاکستان اور بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر کئی ایک تحقیقی مقالہ جات لکھے جا رہے ہیں۔ ادبی حلقوں نے اس امر پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔

○○ 11 دسمبر 1992ء کو سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام شاعر و ادیب پروفیسر محمد فیروز شاہ کے مجموعہ مضامین "تھل دریا" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں معروف شاعر جمیل یوسف، محمد اکبر خان شامل تھے۔ نظامت کے فرائض یوسف خالد اور ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں پرویز بزمی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، میاں محمد آصف، امجد الٰہی، راقم الحروف، عامر رانا، محمد سعید، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، حسن رضا جعفری، شفقت احمد، اور سلیم آغا شامل تھے۔ وزیر آغا نے کہا کہ فیروز شاہ کے مضامین اس کی ذات کا انعکاس ہیں اس کی شاعری اور نثر دونوں میں کھرے پن کا احساس ملتا ہے۔

○○ 10 اکتوبر 1992ء کو پاکستان لٹریری کونسل اور سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ بعنوان "ادب اور ثقافت" منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر مہمان خصوصی تھے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں عابد حسین عابد، محمد ریاض ساجد، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، ممتاز عارف، یوسف خالد، راقم الحروف، سلیم حسن مرزا، پروفیسر سجاد نقوی، اور یونس خیال شامل تھے۔ وزیر آغا نے کہا کہ ادب انسان کو فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ثقافت اور نیچر میں ادب ہی رابطہ پیدا کرتا ہے۔ فطرت کی رنگینوں کو ترتیب دینا ہی کلچر ہے اور یہ فریضہ ادب ادا کرتا ہے۔

○○ 18 دسمبر 1992ء کو سیرت اکادمی، بزم ترقی و علم و ادب اور سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام ملک کے معروف شاعر اور متعدد نعتیہ مجموعوں کے شاعر انجم نیازی کے اعزاز میں کی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی مہمان خصوصی پروفیسر غلام جیلانی اصغر تھے۔ نظامت کے فرائض میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیئے۔ راقم الحروف نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ممتاز عارف، یوسف خالد، پروفیسر سجاد نقوی، پرویز بزمی، سلیم آغا قزلباش، حسن سلیم مرزا اور دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا۔

○○ مسلم سکالر شجاعت علی ترمذی نے دسمبر 1992ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل محمود اختر نے صدارت کی۔ جبکہ کرنل فضل ماجد بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ یوسف خالد، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، راقم الحروف، عابد خورشید، منظور رضا صفی، ذوالفقار احسن، نجمہ منصور، سلیم آغا قزلباش، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے بطور خاص شرکت کی۔ بعد از تقریب عشائیے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

○○ 12 فروری 1993ء کو سرگودھا اکادمی نے معروف دانش ور اور اسسٹنٹ کمشنر سرگودھا چودھری شفاعت احمد کے مجموعہ مضامین "شگفتہ شگفتہ" کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ ڈپٹی کمشنر محمود اختر مہمان خصوصی تھے۔ میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، راقم الحروف، یونس خیال، یوسف خالد، سلیم حسن مرزا، اعجاز حسین بلوچ، سید مسعود زاہدی، میاں محمد آصف اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی طنز و مزاح پر سیر حاصل گفتگو کو بہت سراہا گیا انھوں نے طنز اور مزاح کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر ان کی تفہیم کی۔

○○ 12 مئی 1993ء کو بزم ترقی علم و ادب کے زیر اہتمام این اے صوفی کے ساتھ ایک شام منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ اظہار خیال کرنے والوں میں میں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، تنویر حسن، منصور اقبال، یوسف خالد، راقم الحروف، پرویز بزمی، سجاد نقوی، سلیم آغا، شجاعت علی ترمذی، ممتاز عارف، رانا محمد اشفاق اور محمد ادریس ناز شامل تھے ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ این اے صوفی کی شاعری اسلوب اور فکر کے اعتبار سے بہت پختہ ہے۔

○○ سرگودھا رائٹرز کلب کی تنقیدی نشستوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کی سیر حاصل تنقیدی گفتگو پر تو ایک کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ ممتاز عارف، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، اور راقم الحروف کی اپیل پر کمشنر تجمل عباس نے غالب لائبریری میں ڈاکٹر وزیر آغا کارنر کی منظوری دی۔ ان کے جان بحق ہونے کے بعد 14 اگست 1996ء کو جشن آزادی کی تقریب کے بعد ڈپٹی کمشنر مظہر علی خاں نے وزیر آغا کارنر کا افتتاح کیا۔ حامد علی خاں بھی اس موقع پر موجود تھے۔

○○ 16 جنوری 1993ء کو سرگودھا اکادمی، بزم ترقی علم و ادب اور سرگودھا رائٹرز کلب کا ایک تعزیتی اجلاس ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ اجلاس میں اردو کے معروف شاعر اور ادبی رسالہ محفل کے ایڈیٹر طفیل ہوشیار پوری کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی اجلاس میں مرحوم طفیل ہوشیار پوری کی ادبی خدمات کی تعریف کی گئی۔ اجلاس میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل محمد اختر، کرنل فضل ماجد، ظہیر الدین ظہیر، ممتاز عارف، راقم الحروف، یوسف خالد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، سلیم حسن مرزا، سلیم آغا قزلباش، امجد الٰہی، اور دیگر اہل قلم نے شرکت کی۔

○○ 16 مئی 1993ء کو معروف شاعر فیروز شاہ کی تیسری کتاب "تھل دریا" کی تعارفی تقریب سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی مہمان خصوصی معروف شاعر جمیل یوسف تھے۔ مقررین میں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، ظہیر الدین ظہیر، عامر رانا، میاں محمد آصف، امجد الٰہی، محمد سعید، ممتاز عارف، شفقت احمد، سلیم آغا قزلباش، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، پرویز بزمی، جمیل یوسف، اور وزیر آغا شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ تھل دریا کا ایک سامنے کا مفہوم تو یہ ہے کہ جس طرح ریگ رواں ہوتی ہے جس طرح آب رواں ہوتا ہے اسی طرح ریگستان ہے اور اس کی حیثیت ایک دریا کی سی ہے تھل سے مراد دریا ہے۔ دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ تھل جو ہے وہ ایک صحرا ہے اور اس میں سے فن کا ایک دریا پھوٹتا ہے بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ کتاب تھل دریا فطرت کے ہمراز تخلیق کار کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ فیروز شاہ کی شاعری اور نثر میں صداقت کا اظہار ملتا ہے۔ گاؤں کی بے ریا فضا کا عکس فیروز شاہ کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

○○ 29 مئی 1993ء کو سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمانان خصوصی ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر مظہر رشید اور ڈویژنل انجینئر ٹیلی فون ملک محمد اکبر شامل تھے۔ نظامت کے فرائض میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیئے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں چودھری فضل الٰہی ایڈووکیٹ،

پروفیسر غفور شاہ قاسم، پروفیسر یوسف خالد، سلیم آغا قزلباش، سلیم حسن مرزا، پروفیسر سجاد نقوی، ممتاز عارف، پروفیسر اسرار الٰہی ظہیر الدین ظہیر اور طارق محمود تبسم شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے جس محبت اور عزیز پروری کا ثبوت دیا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

○○ 6 جون 1993ء کو سرگودھا اکادمی اور سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام ظہیر الدین ظہیر کے دوسرے شعری مجموعہ "چاہتوں کے گلاب" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی کرنل فضل ماجد تھے۔ نظامت کے فرائض ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ اور راقم الحروف نے انجام دیئے۔ ظہیر الدین ظہیر کے فکر و فن پر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پروفیسر سجاد نقوی، پروفیسر غفور شاہ قاسم، پروفیسر یوسف خالد، ممتاز عارف، شوکت بلوچ، حافظ عبدالرحیم اور نائلہ رفیع شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ ظہیر الدین ظہیر کی شاعری قلم اور علم کا نچوڑ ہے اس کے شعری احساسات معاشرتی رنگوں کے نمونے ہیں وہ غربت اور امارت کا فرق سمجھتا ہے۔ سادہ کلچر کی نمائندگی ظہیر کا خاص انداز ہے۔ وہ انسان دوست ہے اس کا آئینہ دل شفاف ہے اور پیار اور خلوص کی بستی آباد کرنا چاہتا ہے وہ بنیادی طور پر معصوم جذبوں کا نمائندہ ہے۔ بعد از تقریب عصرانے کا اہتمام کیا گیا۔

○○ 6 ستمبر 1993ء ڈاکٹر سید عبداللہ نفاذ اردو کی تحریک میں ڈاکٹر وزیر آغا سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ صدر انجمن ترقی اردو مولانا اخگر سرحدی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کا گہرا تعلق تھا۔ تین چار اردو کانفرنسوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ سرگودھا تشریف لائے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کیا۔ 10، 11، 12 مارچ 1980ء کو لاہور میں تین روزہ اردو کانفرنس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، حکیم محمد سعید، پروفیسر محمد اسماعیل بھٹی، ڈاکٹر وحید اللہ خان، ڈاکٹر وزیر آغا، راجہ رشید محمود، ڈاکٹر سید عبداللہ، کرنل محمد ایوب خان، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم)، جسٹس شمیم حسین قادری، اور دیگر اردو کے نفاذ کے لیے مقالات پڑھے۔ معروف خطاط خورشید عالم گوہر قلم نے موصوف کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر وزیر آغا کو گولڈ میڈل پیش کیا۔

○○ 25 جولائی 1993ء کو سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام میاں محمد آصف (ایس پی) کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ نظامت کے فرائض میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیئے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے خطاب کیا اس موقع پر ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد بھی کیا گیا۔ جس میں نائلہ رفیع، سلیم آغا قزلباش، سلیم حسن مرزا، تنویر حسن زیدی، سجاد نقوی، الحاج میاں محمد انور، ممتاز عارف، راقم الحروف، یوسف خالد، عصمت ملک، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اور وزیر آغا نے اپنے اپنے کلام سے محفل کو گرمایا۔

○○ 28 جولائی 1993ء کو سرگودھا اکادمی اور سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام ایک تنقیدی نشست ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمانان خصوصی میں جنگ کے محمد حنیف باوا اور خیر الدین انصاری شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ایم ڈی شاد نے انجام دیئے۔ سلیم آغا قزلباش نے انشائیہ "کھال" پیش کیا۔ محمد حنیف باوا نے اپنا انشائیہ "میں" پیش کیا۔ یوسف خالد، ممتاز عارف، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم)، پرویز بزمی، ظہیر الدین ظہیر، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنا تازہ کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ ادب کے نکھار اور فروغ کے لیے ادبی نشستوں کا اہتمام اشد ضروری ہے۔ تنقیدی مراحل سے گزر کر تحریریں کندن بنتی ہیں۔ انھوں نے جنگ کے ادیبوں اور شاعروں کو ہدیہ تحسین پیش کیا جن کی کاوشوں سے جنگ میں ادبی سرگرمیاں جاری وساری رہتی ہیں۔

○○ پریس کلب سرگودھا نے 14 اگست 1993ء کو ایک عظیم الشان محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا اس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی کمشنر سرگودھا راؤ عبدالرشید خان تھے۔

پریس کلب کے اراکین کے علاوہ سرگودھا کے ممتاز شعراء کرام بھی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف کے حصے میں آئے۔

○○ 18 دسمبر 1993ء کو پاکستان لٹریری کونسل سرگودھا کے زیر اہتمام نابینا انجمن سرگودھا کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ "سفید چھڑی" کے سالنامہ کی تعارفی تقریب گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی الحاج میاں محمد انور اور پروفیسر شیخ محمد اقبال شامل تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ جن ادباء و شعراء نے "سفید چھڑی" کی علمی و ادبی حیثیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ان میں محمد عثمان، عابد حسین عابد، محمد اعجاز، ڈاکٹر محمد اشفاق، میاں محمد اکرم بھٹی، محمد ریاض ساجد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، طاہر محمود، ندیم انجم، شاہد اسلام دانش، محمد اقبال منظر، ادریس احمد شبلی پانی پتی، آصف راز، یوسف خالد، ممتاز عارف، صوفی تقصیر محمد، اور راقم الحروف شامل تھے۔

○○ 20 دسمبر 1993ء کو سرگودھا اکادمی کا تنقیدی اجلاس ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ سٹی مجسٹریٹ مہر محمد سلطان اور مجسٹریٹ شیر بہادر مہمانان خصوصی تھے۔ ادبی نشست میں صفدر رضا صفی نے انشائیہ؛ سلیم آغا قزلباش نے طنز و مزاح پر مبنی مضمون اور عامر رانا نے ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ اظہار رائے کرنے والوں میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر: یوسف خالد: راقم الحروف: پرویز بزمی: صفدر خورشید: تنویر حسن زیدی: سجاد نقوی: مفتی محمد طفیل گوندل: رائے زمان اللہ خان: صوفی تقصیر محمد: ذوالفقار احسن: اور نذیر شیرزادہ شامل تھے۔ میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

○○ 4 مارچ 1994ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کی ایک تقریب حمید نظامی مرحوم کی یاد میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت دنیائے ادب کے معروف نقاد، انشائیہ نگار و شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، صفدر رضا صفی، سلیم آغا قزلباش، ظہیر الدین ظہیر، پرویز بزمی، عابد سیال، ذوالفقار احسن، وصی شاہ، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، پروفیسر یوسف خالد، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، یوسف خالد، پروفیسر سجاد نقوی، صوفی تقصیر محمد نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ حمید نظامی کی آواز ایک بازگشت ہے جو حق و صداقت کے حصول کے لیے ہر دور میں سنائی دیتی رہے گی۔

○○ 12 اپریل 1994ء کا مشاعرہ اس اعتبار سے ناقابل فراموش ہے کہ 54 شعراء کرام نے دو گھنٹے میں اپنے کلام کی گرمی سے طوفانی بارش کو شکست دے دی۔ کمشنر تجمل عباس مہمان خصوصی اور ڈاکٹر وزیر آغا مشاعرہ کے صدر تھے۔ یہ محفل مشاعرہ گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول سرگودھا کے خوبصورت ہال میں منعقد ہوئی۔ اس ضمن میں میڈم بلقیس اختر شاد، محترمہ طاہرہ عباسی، محترمہ امینہ جمیل، اور محترمہ فریدہ طفیل کے حسن انتظام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کلام پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، رشک ترابی، پرویز بزمی، نصرت چوہدری، شوکت راز، ظہیر الدین ظہیر، شاکر نظامی، صوفی تقصیر محمد، عزیز احمد ہاشمی (چیئرمین تعلیمی بورڈ سرگودھا)، شیخ بشیر احمد (ڈائریکٹر تعلیمات)، ریاض احمد شاد، پروانہ شاہ پوری، محمد شیر افضل، راجہ حق نواز، پروفیسر شیخ محمد اقبال، ممتاز عارف، یونس خیال، یوسف خالد، آصف راز، حنیف ساجد، محمود اسیر، قاسم شاہ، مولوی اسلم، اصغر شاہی، اقبال ندیم، اخلاق عاطف، راقم الحروف، صفدر خورشید، ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ، سلطان علوی، اعجاز سید، ارشد جبار پراچہ، صدیق اختر، ضیا بھٹی، عبدالمعیب خالد، عطا محمد عباسی، فدا حسین سوز، واحد حسین نشان، اجمل ہاشمی، الحاج میاں محمد انور، حسین گوہری، ارشاد صدیقی، ذوالفقار علی ذلفی، محمد یونس یاور، اقبال منظر، شبلی پانی پتی، طفیل ثاقب، صفدر رضا صفی، طارق محمود تبسم، عابد سیال، عابد خورشید، ذوالفقار احسن، میاں محمد اکرم بھٹی، محمد عامر رانا، بنیاد حسین بخاری، نائلہ رفیع، نجمہ منصور، رخسانہ یاسمین، مسرت جبیں، مسز طاہرہ افتخار، عمارہ مہرین، حافظ عبدالستار حقانی، جعفر اقبال، عابد حسین عابد، محمد ریاض ساجد، پارس چیمہ شامل تھے۔

○○ نجمہ منصور کی کتاب "میں سپنے اور آنکھیں" کی تقریب رونمائی 13 ستمبر 1991ء کو فیصل ہال سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی انور سلیم احمد ڈپٹی کمشنر سرگودھا (11-4-92 — 18-6-91) میاں محمد آصف، یوسف خالد، پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحبزادہ عبدالرسول، این اے

صوفی، ڈاکٹر سلیم آغا، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، محمد ریاض ساجد، عابد حسین عابد، راقم الحروف نے بھی گفتگو کی۔

○○ یکم جنوری 1994ء کو سرگودھا تعلیمی بورڈ کی سلور جوبلی مشاعرہ ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی مرتضیٰ برلاس تھے، چیئرمین بورڈ پروفیسر عزیز احمد ہاشمی اعزازی نشست پر جلوہ افروز تھے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض پروفیسر ریاض احمد شاد نے انجام دیئے۔ مشاعرہ میں طاہر تونسوی، غلام جیلانی اصغر، صوفی فقیر محمد، نصرت چودھری، اخلاق عاطف، کامران رشید، یوسف خالد، محمد اقبال منتظر، محمود اسیر، اعجاز حسین سید، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، رانا ارشاد علی صدیقی، عصمت غوری، شیر دل ساجد، راقم الحروف، عبدالقیوم رانا، ممتاز عارف، یونس خیال، آصف راز، پروانہ شاہ پوری، ظہیر الدین ظہیر، شیخ بشیر احمد اور مسز عشرت گیلانی نے کلام پیش کیا۔

○○ یکم ستمبر 1994ء سرگودھا آرٹس کونسل کے زیر اہتمام جشن میلاد النبی ﷺ کے سلسلہ میں ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا اعزازی نشست پر کمشنر سرگودھا ڈویژن سید تجمل عباس متمکن تھے نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، حفیظ تائب، مظفر وارثی، غلام جیلانی اصغر، جوہر نظامی، ڈاکٹر خورشید رضوی، صفدر سیال، افسر ساجد، رشک ترابی، پرویز بزمی، شاکر نظامی، ظہیر الدین ظہیر، مظفر حسن منصور، ریاض احمد شاد، گلزار بخاری، سید طاہر ناصر علی، صوفی فقیر محمد، پروانہ شاہ پوری، ممتاز عارف، آصف راز، یوسف خالد، فاروق لودھی، اخلاق عاطف، رانا ارشاد علی صدیقی، راقم الحروف اور صفدر خورشید شامل تھے۔ اس مشاعرے میں میجر جنرل زاہد احسان ائیر وائس مارشل شاہد ذوالفقار، ائیر کموڈور معصف میر، ڈپٹی کمشنر مظہر علی خان، ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ ملک شیر محمد، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل حامد علی خان، ڈویژنل و ڈسٹرکٹ افسران اور اہل علم و ادب کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

○○ 10 دسمبر 1994ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام ایک خصوصی شعری نشست منعقد ہوئی ۔ جس کی صدارت سرگودھا رائٹرز کلب کے سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ نشست میں ظہیر الدین ظہیر، یوسف خالد، صفدر رضا صفی، ذوالفقار احسن، عابد سیال، سلیم آغا قزلباش، ممتاز عارف نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے عابد سیال اور صفدر رضا صفی کی فرمائش پر اپنی معروف پنجابی نظم "گھوڑا" سنائی۔ علاوہ ازیں انھوں نے کہا کہ ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب کے نعرے بے مقصد ہیں۔ ادب ادب ہوتا ہے جو ادب قاری کو جمالیاتی حظ فراہم نہیں کرسکتا وہ ادب نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر نظریئے کا پرچار مقصود ہو تو وہ ادب کے ذریعے بلکہ ادب کے تابع ہو نہ کہ وہ ادب پر حاوی ہوجائے۔ وزیر آغا نے کہا کہ حقیقی ادب میں نعرہ بازی کی کوئی گنجائش نہیں نعرہ بازی کی شاعری سیاسی سٹیٹمنٹ تو ہوسکتی ہے ادب نہیں کہلاسکتی۔

○○ 12 دسمبر 1994ء کو سرگودھا اکادمی کا تعزیتی اجلاس ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں تکبیر کے مدیر مولانا صلاح الدین کے قتل کی شدید مذمت کی گئی اور ان کے قتل کو صحافتی اور قومی حلقوں کے لیے نقصان عظیم قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین سے اپنی ایک خاص ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا صلاح الدین ایک مخلص اور شفیق انسان تھے۔ صحافتی دنیا میں ایک عظیم مقام حاصل تھا۔ اجلاس میں راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) پروفیسر یوسف خالد، سلیم آغا، عابد سیال اور صفدر رضا صفی نے شرکت کی۔ اجلاس میں مرحوم صلاح الدین کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

○○ 15 جنوری 1995ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کی تقریب حلف برداری ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر مظہر علی خان مہمان خصوصی تھی۔ تقریب سے ڈاکٹر وزیر آغا، راقم الحروف، مظہر علی خان، ظہیر الدین ظہیر، ممتاز عارف اور پروانہ شاہ پوری نے خطاب کیا۔

○○ 15 فروری 1995ء، راقم الحروف کی طرف ممتاز عارف کی شاعری کے پچیس سال مکمل ہونے پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں ممتاز عارف کی تاج پوشی کی گئی۔ بزم علم و فن کی طرف سے ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں ایک خصوصی ایوارڈ پیش کیا۔ ڈپٹی کمشنر مظہر علی خان نے انہیں تحفہ دیا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے ممتاز عارف کی دستار بندی کی۔ ان کی شاعری کی سلور جوبلی ان کی سالگرہ کے موقع پر منائی گئی۔ ظہیر الدین ظہیر، آصف راز، شاکر نظامی، اخلاق عاطف، رشک ترابی، ملک محمد معظم، رانا سلیم اختر، ملک عبدالقیوم، ملک محمد زمان اور دیگر احباب نے بھی ممتاز عارف کو شاعری کی سلور جوبلی پر مبارک باد دی۔

○○ 7 اپریل 1995ء کو سرگودھا اکادمی اور سرگودھا رائٹرز کلب کے زیر اہتمام اے ٹی او پاکستان ریلویز حمید رازی کی رہائش گاہ پر پنجابی کے معروف افسانہ نگار آغا علی مدثر کی کتاب "چٹے لیڑے میلے لوگ" کے حوالے سے ان کے اعزاز میں خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمانان خصوصی صاحبزادہ عبدالرسول اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر تھے۔ میزبان حمید رازی نے تعارفی کلمات کہے اور آغا علی مدثر کا تفصیلاً تعارف کروایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ پنجابی ادب کے فروغ کے لیے پنجابی نثر کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ تقریب سے ریاض احمد شاد، مشتاق کنول، سلیم آغا قزلباش، یوسف خالد، ظہیر الدین ظہیر، ظفر اقبال ڈوگر، صفدر رضا صفی، راقم الحروف، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، عابد سیال اور دیگر اہل قلم نے بھی اظہار خیال کیا۔ مدثر علی آغا نے کتاب سے ایک افسانہ "گلاس کیس" پڑھ کر سنایا۔

○○ 8 اپریل 1995ء کو جشن سرگودھا کا شاندار مشاعرہ ضلع کونسل کے زیر اہتمام گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی کمشنر سرگودھا سید تجمل عباس تھے۔ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، عزیز احمد ہاشمی، شیخ بشیر احمد، میاں مناظر علی رانجھا، اور ڈپٹی کمشنر مظہر علی خان بھی سٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) نے انجام دیئے۔ جن شعراء نے کلام پیش کیا ان میں طارق محمود تبسم، مقصود راہی، عابد حسین عابد، ریاض ساجد، مس عمارہ مہرین، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، عابد سیال، صفدر رضا صفی، اقبال منتظر، شیر دل ساجد، مسز طاہرہ افکار، طفیل ثاقب، عصمت اللہ غوری، ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ، اقبال ندیم، حنیف ساجد، اقبال ندیم، عبدالمعیب خالد، رانا ارشاد علی صدیقی، اظہر زیدی، واحد حسین نشان، صدیق اختر، الحاج میاں محمد انور، اجمل حسین ہاشمی، سلطان علوی، حمید رازی، صفدر خورشید، نائیلہ رفیع، مولوی محمد اسلم، قاسم شاہ، آصف راز، یوسف خالد، شیخ محمد اقبال، پروانہ شاہ پوری، بنیاد حسین بخاری، پروفیسر عزیز احمد ہاشمی، صوفی فقیر محمد، راقم الحروف، ریاض احمد شاد، ممتاز عارف، شاکر نظامی، ظہیر الدین ظہیر، شوکت راز، پرویز بزمی، علامہ رشک ترابی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل تھے۔

○○ 15 مئی 1995ء بزم علم و فن کے زیر اہتمام کشمیر مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مشاعرہ میں جن شعراء و ادباء نے حصہ لیا انہیں محمد طفیل ثاقب، اظہر زیدی، ابن کلیم طارق محمود، ریاض ساجد، یوسف خالد، ممتاز عارف، راقم الحروف، ناصر گمسن، محمد اعظم ڈوگر، ظفر اقبال شیخ، فیصل جاوید، محمد اقبال منتظر، صفدر رضا صفی، فیصل سلہری، اخلاق عاطف، صفدر خورشید، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، نجمہ منصور، پرویز بزمی، ظہیر الدین ظہیر، سجاد نقوی، محمد اسلم اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ صرف سیاسی نہیں بلکہ انسانی ضمیر کا مسئلہ بھی ہے۔ اور بھارتی طاغوتی قوت نے تمام انسانی و اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال کر انصاف اور تہذیب کا مذاق اڑایا ہے۔

○○ 15 فروری 1995ء کو دو ہفتے سویڈن گزارنے کے بعد جب ڈاکٹر وزیر آغا واپس پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں سرگودھا رائٹرز کلب نے کو ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ صدارت مظہر علی خان ڈپٹی کمشنر سرگودھا نے کی جبکہ مہمان خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ اعزازی نشستوں پر غلام جیلانی اصغر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل حامد علی خان، رانا سلیم اختر، اور ممتاز عارف جلوہ افروز تھے۔ علامہ رشک ترابی، ظہیر الدین ظہیر، پروانہ شاہ پوری، آصف راز، یوسف خالد، ممتاز عارف، راقم الحروف اور دیگر دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے تقریب سے خطاب کرتے

ہوئے کہا کہ "سویڈن میں مجھے جو عزت اور پذیرائی ملی میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، سویڈش رائٹرز یونین نے ساٹھ سال کے بعد جنوبی ایشیاء سے کسی ادیب کو بطور خاص مدعو کیا تھا میرے اعزاز میں کئی تقاریب منعقد ہوئیں۔ میرے سویڈن پہنچنے سے قبل ہی ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے میرے بارے میں پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو چکے تھے اور مضامین شائع کیے گئے تھے۔ سٹاک ہوم یونیورسٹی میں اور پاکستانی سفارت خانے میں بھی میرے اعزاز میں تقریبات منعقد ہوئیں۔ رائٹرز کلب کی طرف وزیر آغا کو یادگاری شیلڈ پیش کی گئی۔ معروف شاعر اور آرٹسٹ ظہیر الدین ظہیر نے ڈاکٹر وزیر آغا کو خوبصورت پینٹنگ اور انجمن شہریان کے سرپرست اعلیٰ رانا سلیم اختر اور صدر ملک عبدالقیوم نے شیلڈ پیش کیں۔ تقریب کے اختتام پر رائٹرز کلب کے عہدیداروں نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا وزیر آغا نے حلف لیا۔ چونکہ 15 فروری ممتاز شاعر و ادیب ممتاز عارف کی سالگرہ ہے اس لیے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی دستار بندی کی گئی۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ یہ تقریب فیصل ہال سرگودھا میں منعقد ہوئی۔

○○ 16 اکتوبر 1995ء کو سید تجمل عباس کی ذاتی دلچسپی اور ڈپٹی کمشنر مظہر علی خان، ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ ملک شیر محمد، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل حامد علی خان، ڈائریکٹر آرٹس کونسل انجم معین بلے، افسر آبادی سید محمد شفیق شاہ، اشرف مخدوم اور ملک محمد حیات کی خصوصی معاونت سے آرٹس کونسل کے زیر اہتمام کل پاکستان رحمت اللعالمین نعتیہ مشاعرہ کمشنر ہاؤس سرگودھا میں منعقد ہوا۔ کل پاکستان نعتیہ محفل مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی وفاقی وزیر سماجی بہبود و خصوصی تعلیم ڈاکٹر شیر افگن تھے۔ کمشنر سرگودھا سید تجمل عباس بھی سٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خورشید رضوی اور راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) نے انجام دیئے۔ جن شعرائے کرام نے کلام پیش کیا ان میں ڈاکٹر خورشید رضوی، راقم الحروف، جمشید چشتی، تنویر صہبائی، سید طاہر علی ناصر، حمیدہ شیر خان، نائلہ رفیع، ارشاد علی صدیقی، حافظ لدھیانوی، ، صفدر خورشید، اخلاق عاطف، آصف راز، شیخ اقبال، یوسف خالد، پروانہ شاہ پوری، ممتاز عارف، شاکر نظامی ،صوفی فقیر محمد، ظہیر الدین ظہیر، انجم جعفری، علی رضا، صفدر اسلم سیال، راجہ رشید محمود، رشک ترابی، ناصر شہزاد، مظفر وارثی، حفیظ تائب، غلام جیلانی اصغر، اور وزیر آغا شامل تھے۔

○○ 10 جون 1995ء کو سرگودھا اکادمی اور رائٹرز کلب اور بزم علم و فن کے زیر اہتمام معروف شاعر و ادیب راغب شکیب اور مسز سیما شکیب کے اعزاز میں ایک تقریب ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ جن احباب نے خیالات کا اظہار کیا اور اپنے کلام سے نوازا ان میں پرویز بزمی، غلام جیلانی اصغر، ظہیر الدین ظہیر، یوسف خالد، عامر اعوان، نجمہ منصور، نسرین بی بی، ممتاز عارف، عابد سیال، عابد خورشید، راقم الحروف ، زاہد منیر عامر، اظہر زیدی، سجاد نقوی، ذوالفقار سندھو (ذوالفقار احسن)، عبدالحمید رازی، بلال احمد قریشی (امر بلال)، تنویر زیدی، صفدر خورشید، نور بادشاہ، ناصر محسن، اعظم ڈوگر، محمد صفدر، سلیم آغا قزلباش، اخلاق عاطف، عرفان رشید، اور دیگر شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نوجوان لکھنے والوں پر زور دیا کہ وہ مطالعہ کی عادت اپنائیں اور اپنی تخلیقات کو ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔ نظامت کے فرائض میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیئے۔

○○ 15 مئی 1995ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر سجاد نقوی نے کی۔ مہمان خصوصی ظہیر الدین ظہیر تھے۔ اجلاس میں فیصل سلہری نے اپنا افسانہ تنقید کے لیے پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے افسانے پر سیر حاصل گفتگو کی اور کہا کہ فیصل سلہری اس لحاظ سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے افسانہ نگاری میں قدم رکھا ہے۔ انھوں نے افسانے کے بعض نقائص کی طرف نشاندہی کروائی۔ وزیر آغا نے کہا کہ اچھا افسانہ نگار بننے کے لیے ضروری ہے کہ افسانے کی بنت کاری پر توجہ دیں اور غیر ضروری طوالت سے گریز کریں۔ اجلاس میں میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، فیصل جاوید، محمد اسلم جاوید، اعظم ڈوگر ایڈووکیٹ ،ممتاز عارف، راقم الحروف، اور دیگر نے شرکت کی۔

○○ 15 جون 1995ء کو سرگودھا رائٹرز کلب کا تنقیدی اجلاس پریس کلب سرگودھا میں منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے کی جبکہ مہمان خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ اجلاس میں شہداء کربلا کی یاد کے حوالے سے اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کے موضوع پر گفتگو ہوئی جبکہ حاضر شعراء نے امام عالی مقام کے حضور خراج عقیدت پیش کیا۔ جن شعرا کرام نے محفل مسالمہ میں حصہ لیا ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ظہیر الدین ظہیر، پروانہ شاہ پوری، ممتاز عارف، یوسف خالد، آصف راز، اخلاق عاطف، خورشید شاہ پوری، صفدر رضا صفی، عابد سیال، عابد خورشید، ذوالفقار احسن، طفیل ثاقب، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) حسن تنویر زیدی، فیصل سلہری، طارق محمود تبسم، اور دیگر شعرا کرام شامل تھے۔

○○ 28 مارچ 1996ء بروز جمعرات رات 8 بجے گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول میں ضلع کونسل سرگودھا کے زیر اہتمام ایک شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت برصغیر کے نامور نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی کمشنر سرگودھا ڈویژن سید تجمل عباس تھے۔ تقریب کے میزبان اعلیٰ ڈپٹی کمشنر سرگودھا مظہر علی خاں تھے۔ مشاعرہ کے منتظمین میں اے ڈی سی جی حامد علی خاں، چیف آفیسر ضلع کونسل سرفراز احمد ناز پراچہ، راقم الحروف، اور سرگودھا رائٹرز کلب کے صدر ممتاز شامل تھے۔ جن شعراء نے کلام پیش کیا ان میں امر بلال، فخر عباس، طارق محمود تبسم، ریاض ساجد، عابد حسین عابد، شیر دل ساجد، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، صفدر رضا صفی، عمر افتخار کاہلوں، محمد اقبال منظر، شبلی پانی پتی، صفدر خورشید، واحد حسین نشان، فراست علی فراست، شمیم گوہری، میاں محمد انور، طفیل ثاقب، اظہر زیدی، ارشد ملک، عبدالشعیب خالد، سلطان علوی، صدیق اختر، محسن عباس محسن، ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ، قاسم شاہ، محمد حیات بھٹی، صابر سودائی، اقبال ندیم، اخلاق عاطف، راقم الحروف، محمود اسیر، آصف راز، یوسف خالد، رخسانہ یاسمین، فرخ قیوم، نائیلہ رفیع، طاہرہ افتخار، ممتاز عارف، پروانہ شاہ پوری، صوفی فقیر محمد، بنیاد حسین بخاری، ظہیر الدین ظہیر، ڈاکٹر محبوب عالم، پرویز بزمی، علامہ رشک ترابی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل تھے۔

○○ 6 مارچ 1996ء کو سرگودھا اکادمی کا ایک تعزیتی اجلاس ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں نسیم حجازی کی وفات پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس میں کہا گیا کہ نسیم حجازی کی وفات سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم نے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مقررین میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، صوفی فقیر محمد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، یوسف خالد، پروفیسر سجاد نقوی شامل تھے۔

○○ 12 اپریل 1996ء کو ایس ایس پی سرگودھا شاہد اقبال نے مقامی سول جج اور معروف ادیب سید شجاعت علی ترمذی عارفی کی کتاب "خود سے کہا" کی تعارفی تقریب کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ تقریب سے ایس ایس پی شاہد اقبال، راقم الحروف، پروفیسر سجاد نقوی، صفدر اقبال گوندل ڈپٹی انکم ٹیکس کمشنر، یوسف خالد، ظہیر الدین ظہیر، ممتاز عارف اور ایم ڈی شاد نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے خطاب کرتے شجاعت علی ترمذی کی "خود سے کہا" خلیل جبران اور ٹیگور کی طرز پر لکھی گئی کتاب ہے۔ اس کتاب میں لہجے کی انفرادیت اسلوب اظہار کی دلکشی اور رومان و دانش کی بہار یہ فضا پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب علم و دانش کا ایک خزانہ ہے اور اس کے جملے دانش کے کیپسول کہے جا سکتے ہیں۔"

○○ 21 اپریل 1996ء اتوار شام پانچ بجے گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول میں ایک عظیم الشان تقریب یاد اقبال منعقد ہوئی جس میں ڈویژن بھر سے ہزاروں طلباء وطالبات نے شرکت کی کمشنر تجمل عباس نے صدارت کی جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر شوکت واسطی اور اے ڈی سی جی حامد علی خان مہمانان خصوصی تھے۔ راقم الحروف کے علاوہ علی یاسر، یوسف خالد، صوفی فقیر محمد، رانا ارشاد علی صدیقی، بلال احمد قریشی، پروفیسر امجد حسین ملک، طارق محمود تبسم نے اقبال اور نوجوان کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ مامون الرشید، اور امیر طالب نے کلام اقبال پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کی اردو اور فارسی شاعری پر گفتگو کی۔ کمشنر تجمل عباس نے تقریباً ایک گھنٹہ خطاب

کیا۔ اقبال کے مختلف اشعار کی تشریح سے نوجوانوں کو عمل کی دعوت دی۔ کئی اساتذہ کرام کو بھی شیلڈوں سے نوازا گیا۔

○○ 22 اپریل 1996ء کو بزم علم و فن سرگودھا کے زیر اہتمام یوم اقبال کی شاندار تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ مہمان خصوصی سید تجمل عباس، اور پروفیسر شوکت واسطی تھے۔ سید تجمل عباس، وزیر آغا، راقم الحروف، مسز امینہ جمیل، مسز طاہرہ افتخار، عاصمہ ناہید، سرور صدیق چودھری اور پروفیسر امجد حسین ملک نے بھی اظہار خیال کیا۔ علی یاسر، رانا ارشاد علی صدیقی، یوسف خالد، صوفی فقیر محمد، شوکت واسطی، اور دیگر احباب نے اقبال کے حضور منظوم ہدیہ تحسین پیش کیا جب کہ مس نازش، امیر طالب، مامون الرشید، بلال احمد قریشی، طارق محمود تبسم، اور دیگر طلبا و طالبات نے کلام اقبال ترنم سے پیش کیا۔ تقریب کے اختتام پر کمشنر سرگودھا سید تجمل عباس، ڈپٹی کمشنر مظہر علی خاں، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل حامد علی خان، چیف آفیسر سرفراز ناز پراچہ، عبدالمجید امجد، علی یاسر، شیخ امیر احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، شوکت واسطی اور ممتاز عارف کو خصوصی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جبکہ صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پروفیسر عبدالحمید چودھری، پروفیسر عبدالمجید دائیں، پروفیسر محمد طفیل، ڈاکٹر یوسف ملک، محمد منیر قریشی، سعید ناصر، طالب حسین وڑائچ، ملک محمد بخش، بشیر الزماں، میڈم بلقیس، اختر شاد، بیگم فرحت شاہین اکرم، میڈم اختر چودھری، مسز امینہ جمیل، میڈم ذکریا صوفی نقوی، منور صادق، ڈاکٹر انور چودھری، اور چودھری منظور احمد کو تعلیمی ایوارڈ دیے گئے۔

○○ 20 اکتوبر 1996ء کو گورنمنٹ جامع گرلز ہائی سکول سرگودھا کے ہال میں معروف شاعر فرحت عباس شاہ کے اعزاز میں نجمہ منصور نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی جبکہ لاہور سے شفیق احمد، اعجاز توکل اور دیگر احباب بھی شریک ہوئے۔ نجمہ منصور، راقم الحروف، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اعجاز توکل، شفیق احمد، نائلہ رفیع، عبدالستار، ممتاز عارف، محترمہ طاہرہ افتخار، عاصمہ ناہید، رانا ارشاد علی صدیقی، وقار النساء اور کئی دیگر احباب نے مقالہ جات پڑھے فرحت عباس شاہ نے آزاد اردو غزل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔

○○ 18 جنوری 1997ء کو سول جج شجاعت علی ترمذی نے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کو ڈاکٹریٹ مکمل کرنے کی خوشی میں ایک شاندار ظہرانہ ڈنر کا اہتمام کیا۔ تقریب میں ڈاکٹر وزیر آغا، میاں محمد انور، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، راقم الحروف، محمد طفیل گوندی، ناصر جاوید گھمن، اعجاز اقبال ملک، غلام عباس گوندی، ممتاز عارف، سہیل شاہد، صفدر رضا صفی، عابد خورشید، آصف راز، رانا ارشاد علی صدیقی، اخلاق عاطف، پروانہ شاہ پوری، شاہد قریشی، اور صفدر اقبال نے شرکت کی۔ شجاعت علی ترمذی نے کہا کہ ڈاکٹر سلیم آغا کی تخلیقی صلاحیتیں قابل تحسین ہیں۔ افسانہ اور انشائیہ کے میدان میں ان کے تجربات گراں مایہ اضافہ ہیں۔ انھوں نے موضوعات اپنی گرفت میں لے کر قاری کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ تقریب میں سلیم آغا نے اپنا تازہ انشائیہ "شرافت" پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ علاوہ ازیں انشائیہ کے بارے میں سوال و جواب کا طویل سلسلہ جاری رہا۔

○○ 15 فروری 1997ء کو سرگودھا رائٹرز کلب نے ممتاز عارف کی سالگرہ کے موقع پر ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے صدارت کی۔ تقریب میں پروفیسر سجاد نقوی، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، نعیم حسن مرزا، یوسف خالد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، صوفی فقیر محمد، آصف راز، صفدر رضا صفی، عابد خورشید، اسلم جاوید، اخلاق عاطف، شیر دل ساجد، سلیم آغا، ظہیر الدین ظہیر، رانا ارشاد علی صدیقی، شاکر نظامی، پروانہ شاہ پوری، اویس احمد شبلی پانی پتی، اقبال مظہر، اور دیگر شاعروں ادیبوں نے ممتاز عارف کو سالگرہ کی مبارک باد دی۔ ممتاز عارف کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔ بعد ازاں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔

○○ 23 مارچ 1997ء سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام معروف دانشور سول جج سید شجاعت علی ترمذی کی کتاب "اسلامی جماعت کا واحد مسئلہ" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے صدارت کی۔ بار ایسوسی ایشن کے صدر امتیاز بلوچ مہمان خصوصی تھے اظہار خیال کرنے والوں میں جلال الدین ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف پروفیسر ملک بشیر حسین، پروفیسر یوسف خالد، ممتاز عارف، صفدر رضا صفی، مفتی طفیل گوندی، اور میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے خطبہ صدارت میں کہا کہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو معاشی فکر سے روشناس کرایا جب کہ علامہ اقبال نے انھیں روحانی قوت سے مالا مال ہونے کی دعوت دی۔ تقریب میں ڈاکٹر سلیم آغا، مظہر اللہ ایڈووکیٹ، رانا شوکت علی، نجمہ منصور، ملک اقبال سول جج اور دیگر احباب نے بھی شرکت کی۔

○○ 15 اپریل 1997ء کو سرگودھا رائٹرز کلب نے شعراء ساہیوال کے اعزاز میں تقریب منعقد ہوئی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، راقم الحروف، ممتاز عارف، نے خطاب کیا۔ ساہیوال کے جن شعراء کو راؤ محمد عبداللہ کے تعاون سے کپ دیئے گئے ان میں عمران دانش، مسعود تجاہ، اظہر عباس ارشد، رسول انجم، اللہ دتہ آسی، ممتاز حسین، ممتاز عثمانی شیروانی، ظہیر الدین ظہیر، مقبل حیدر، شاہد محمود احسن عدیم، کلیم اللہ روحیل، خواجہ انور عدیم اسد عباس اسد خان، طارق محمود، خان فراست علی، اقبال بلال، خواجہ عمر فاروق، راؤ اسلم فراز اور ارشد شاکر شامل تھے۔ بعد ازاں عصرانے کا اہتمام کیا۔ ارشد شاکر نے اس منفرد نوعیت کی تقریب کے انعقاد پر رائٹرز کلب کے اراکین کا شکریہ ادا کیا ہے۔

○○ 15 مئی 1998ء میں اردو ماہیے کا پاکستان میں پہلا مشاعرہ جناح ہال میں ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس کا اہتمام حلقہ تخلیق ادب پاکستان کے صدر ذوالفقار احسن نے کیا تھا۔ اس میں ممتاز عارف، آصف راز، متین گوہری، اویس احمد شبلی پانی پتی، ناصر محمود ناصر، خالد یوسفی، ذوالفقار احسن، اور دیگر نے اردو ماہیے پیش کیے ذوالفقار احسن نے اردو ماہیا نگاری میں ہونے والے کام سے آگاہ کیا۔ ذوالفقار احسن نے حیدر قریشی کا اس ضمن میں خاص ذکر کیا۔ جنہوں نے اس تحریک کو ایک مشن سمجھ کر چلایا اور دنیا بھر میں ماہیا نگاروں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ ممتاز عارف نے اپنا وہ تاریخی خط بھی پڑھ کر سنایا جو اوراق میں چھپا اور اس کے بعد اردو ماہیے نگاری کی تحریک نے جنم لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ میں نے خود تو ماہیے نہیں کہے لیکن اردو ماہیے کے فروغ میں اوراق نے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔

○○ 18 مئی 1997ء کو شیعہ سنی اتحاد کمیٹی کے زیر اہتمام امن کانفرنس اور محفل مسالمہ ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض مرزا رفیق احمد نے انجام دیئے۔ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، اور سید مسعود زاہدی ایڈووکیٹ مہمانان خصوصی تھے حافظ محمد سعید نے تلاوت کی سعادت حاصل کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، شیعہ سنی اتحاد کمیٹی کے صدر مفتی محمد طفیل گوندی ایڈووکیٹ، عمران گوندی، اسد گوندی نے فلسفہ شہادت پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ امن انسانی اقدار کو اجاگر کرتا ہے امن کے قیام کے لیے ہمیں ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرنا چاہیے۔ محفل مسالمہ میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، علامہ رشک ترابی، ظہیر الدین ظہیر، ریاض احمد شاد، ممتاز عارف، راقم الحروف صفدر رضا صفی، اور دیگر شعراء کرام نے شہید انسانیت کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کے اختتام پر عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔

○○ جولائی 1998ء کو معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے سفرنامے "دیسی ان ولایت" کی تقریب رونمائی عالمی شہرت یافتہ نقاد و شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی راجہ رسالو تھے۔ مہمان اعزاز پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، اور میاں ظفر حیات ریزیڈنٹ ڈائریکٹر آرٹس کونسل سرگودھا تھے۔ مقررین میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر، آصف نوازش علی، ارشد ملک، پروفیسر اجمل سعید پراچہ، پروانہ شاہ پوری، ڈاکٹر انیس احمد اور بریرہ مریم شامل تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ریاض احمد شاد نے بخوبی انجام دیئے۔ اس تقریب کا اہتمام سرگودھا آرٹس کونسل اور سرگودھا رائٹرز کلب کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں عابد سیال، صفدر رضا صفی، ذوالفقار احسن، اور عابد خورشید بھی شریک ہوئے۔ یہ تقریب فیصل ہال میں منعقد ہوئی۔

OO جون 1996ء کو معروف شاعر پروفیسر یونس خیال کے شعری مجموعہ "کالی رات سفر اور میں" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے حصہ میں آئی۔ اس تقریب میں پروفیسر یوسف خالد، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، صفدر رضا صفی، امجد الٰہی، راقم الحروف، ممتاز عارف اور دیگر مقررین نے یونس خیال کے فکر و فن پر گفتگو کی۔

OO جون 1996ء، سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام معروف شاعر ڈرامہ نگار اور ادیب عدیم ہاشمی کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ نظامت کے فرائض ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے انجام دیئے۔ پروفیسر ریاض احمد شاد، آصف راز، منصور سندھو، ذوالفقار احسن صفدر رضا صفی، مفتی طفیل گوندی، ممتاز عارف، یوسف خالد، پرویز بزمی، راقم الحروف، عبدالحمید رازی، پروفیسر سجاد نقوی، سلیم آغا قزلباش، چوہدری صفدر گوندل، عطا محمد بلوچ، صوفی فقیر محمد، نذیر شیرزادہ، اختر عثمان، حسن زیدی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور دیگر اہل علم و دانش نہ صرف مقالہ جات پڑھے بلکہ عدیم ہاشمی سے مختلف سوالات کیے۔ تقریب کے اختتام پر عدیم ہاشمی نے اپنا تازہ کلام پیش کیا جسے حاضرین نے بے حد سراہا۔

OO 23مارچ1996ء کو سرگودھا تعلیمی بورڈ کے تحت یوم پاکستان کے موقع پر محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ صدارت سابق چیف سیکرٹری پنجاب جاوید احمد قریشی نے کی جبکہ مہمان خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ فخر الدین بلے، غلام جیلانی اصغر، جمیل یوسف، انوار فیروز، احسان اکبر، جلیل عالی، خالد اقبال یاسر، نجمی صدیقی پرویز بزمی، ڈاکٹر محبوب عالم، صوفی فقیر محمد، ظہیر الدین ظہیر، صفدر خورشید، پروانہ شاہ پوری، شاکر نظامی، یوسف خالد، آصف راز، ممتاز عارف، اخلاق عاطف، راقم الحروف ، رانا ارشاد علی صدیقی، محمود اسیر، کامران رشید، ریاض احمد شاد شامل تھے۔

OO 18اپریل1996ء کو سرگودھا رائٹرز کلب اور سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام جاش ہوٹل میں معروف ادبی داؤد طاہر انکم ٹیکس کمشنر کی کتاب "شوق ہمسفر میرا" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی مہمان خصوصی ملک محمد بشیر اعوان مشیر وزیر اعلیٰ پنجاب اور کمشنر سرگودھا سید تجمل عباس تھے۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ ممتاز عارف نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا ڈاکٹر وزیر آغا نے خطبہ صدارت میں کہا کہ "شوق ہمسفر میرا" سفرنامہ نگاری کی دنیا میں ایک منفرد مقام کی حامل کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف داؤد طاہر نے مسافرت کی بجائے سیاحت کی ہے مسافر تیز خرام اور سیاح آہستہ خرام ہوتا ہے اور وہ راستہ کی ہر چیز کو بڑے انہماک سے اور ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے۔ انھوں نے امریکہ کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ دریافت کیا ہے۔ ملک محمد بشیر اعوان، غلام جیلانی اصغر، پروفیسر سجاد نقوی، سلیم آغا قزلباش، یوسف خالد، نائیلہ رفیع، صفدر رضا صفی، ظہیر الدین ظہیر، پروانہ شاہ پوری اور ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ نے بھی اظہار خیال کیا۔

OO ڈاکٹر وزیر آغا تمام تقریبات میں جس عجز و انکساری اور ادبی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر شریک ہوتے رہے وہ لمحات آنکھوں سے کیسے اوجھل ہو سکتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کو ہدیہ تحسین پیش کرنے کے لیے کئی ایک تقریبات کا اہتمام کیا گیا جن میں راغب شکیب، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سیما شکیب، انور سدید، سجاد نقوی، پرویز بزمی اظہار خیال کرتے رہے۔ ادبی تقریبات کے علاوہ وہ ملی و قومی تقریبات میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ یوم پاکستان کی ایک عظیم الشان تقریب جس کا اہتمام اکرم قریشی نے کیا تھا، ڈاکٹر وزیر آغا اور مولانا افگر سرحدی نے شاعروں اور ادیبوں کی تحریک پاکستان میں خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ سید الطاف مشہدی 1980ء میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے چہلم پر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان کے جنازہ میں مرتضیٰ برلاس، ڈاکٹر وزیر آغا، بشیر راجن ادیب، شاکر نظامی، مولانا افگر سرحدی، اور راقم الحروف کے علاوہ کسی شاعر ادیب نے شرکت نہ کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک نجی ملاقات پر بتایا تھا کہ یہی حشر شکیب جلالی کے جنازے پر دیکھنے کو ملا۔ سیشن جج سید اعجاز حسین گیلانی، میجر باقر حسین اور ممتاز حسین گیلانی نے بزم الطاف مشہدی تشکیل دے کر کئی سال تک بڑی تقریبات کا اہتمام کیا۔ احمد ندیم قاسمی، عطاالحق قاسمی، ظفر اقبال، ڈاکٹر انور چوہدری، صاحبزادہ عبدالرسول، شاکر نظامی، مولانا افگر سرحدی، ڈاکٹر خورشید رضوی، غلام جیلانی اصغر، اور علامہ رشک ترابی، ان تقریبات کو کامیاب بناتے رہے۔ کرنل مسعود الحق نے بزم شوق بڑے شوق سے شروع کی اور اپنے والد حضرت مولانا محمد حسین شوق کی یاد میں متعدد تقریبات کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تقریباً سبھی تقریبات میں اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔ حضرت مولانا محمد حسین شوق 24 دسمبر 1904ء کو پیدا ہوئے اور 17 مئی 1971ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مفتی محمد طفیل گوندی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے محمد حسین شوق کو شوق پرواز بخشی۔ انجمن ترقی اردو، حلقہ ارباب ذوق، بزم علم و فن، سرگودھا اکادمی، اور رائٹرز کلب کی تقریبات ڈاکٹر وزیر آغا دم قدم سے ہی پر دم رہتی تھیں۔

OO ایک یادگار شام غزل کیپٹل ریسٹ میں منعقد ہوئی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ مہمان خصوصی منیر نیازی تھے۔ جس میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، مولانا افگر سرحدی، خاور رضوی، خورشید رضوی، ریاض احمد شاد، محبوب احمد، میاں شان احمد، میاں محمد انور، علامہ رشک ترابی، انجم نیازی، این اے صوفی، راجہ مظفر حسین منصور، شفیع صابر، سیف زبیری، شوکت راز، شیخ محمد اقبال، سلیم کوثر، ظہیر الدین ظہیر، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) مجید تمنا، ممتاز عارف، پروانہ شاہ پوری، اصغر شامی، حسن عباس زیدی، محمود اسیر، اخلاق عاطف، یونس ارشاد، راغب شکیب، صوفی فقیر محمد، اور فیاض تحسین نے اپنا کلام پیش کیا۔

OO 3 مئی کو سرگودھا آرٹس کونسل کے زیر اہتمام پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے اعزاز میں ایک تقریب بعنوان "جگ جگ جیو جیلانی جی" انعقاد پذیر ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر ریاض احمد شاد، راقم الحروف، حافظ محمد سعید ایڈووکیٹ، صاحبزادہ عبدالرسول نے اظہار خیال کیا۔ آرٹس کونسل کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر شکیل احمد نے سپاسنامہ پیش کیا۔ ظہیر الدین ظہیر اور مولانا افگر سرحدی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ امیر حسین نے ساز و آواز کے ساتھ جیلانی صاحب کی چند غزلیں پیش کیں۔ ایڈیشنل کمشنر سید ظاہر علی شاہ بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

OO 11 ستمبر 2001ء کو معروف آرٹسٹ ظفر خالق کے فن پاروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر وزیر آغا مہمان خصوصی تھے۔ تقریب میں سرگودھا کے فن کاروں اور آرٹسٹوں نے بھی شرکت کی۔ قاسم علی، رفیق انجم، ارشد ملک، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، شاہد نذیر خان، ایم اے لطیف، ظہیر الدین ظہیر، راقم الحروف، ممتاز عارف، میاں محمد انور اور دیگر معززین نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنی اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ معروف فنکار قاسم علی نے اس تقریب کا اہتمام بڑے ذوق و شوق سے کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی روز امریکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوا۔ تقریب میں شامل احباب اس حملے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی برسی کے سلسلہ میں فاتحہ خوانی بھی کی گئی۔

OO اکتوبر 2001ء کو نجمہ منصور کی رہائش گاہ مقام حیات پر ان کی کتاب "برکھا بھیگے خوابوں کی" وزیر آغا کی رومانوی نظموں پر گفتگو رکھی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی جبکہ مہمانان خصوصی میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پرویز بزمی، اور سجاد نقوی شامل تھے۔ مقررین میں یوسف خالد ارشد ملک، عابد خورشید، ذوالفقار احسن اور دیگر شامل تھے۔

OO اپریل 2002ء کو ادبی کونسل اور سرگودھا رائٹرز کلب کے اشتراک سے ایک شاندار محفل مشاعرہ چک 105 جنوبی میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت معروف نقاد، انشائیہ اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی جبکہ مہمانان خصوصی میں ارشد ملک، قاسم شاہ اور سلطان علوی تھے نظامت کے فرائض ذوالفقار احسن نے انجام دیئے۔ اس مشاعرہ کے منتظم سید اعجاز حسین تھے۔

OO سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام حق نواز اختر کے شعری مجموعہ "اعلان جنوں" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی۔ پروفیسر ریاض احمد شاد، سید مسعود احمد شاہ، عصمت ملیک، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سلیم آغا، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، اور ڈپٹی کمشنر میاں محمد جمیل

نے خطاب کیا۔

OO 15 جولائی 2003ء کو رائٹرز کلب کا ایک تنقیدی اجلاس پروفیسر ریاض احمد شاد کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور پروفیسر ولی محمد انجم تھے۔ اجلاس میں کمشنر انکم ٹیکس جاوید اطہر کے مضمون "پنجاب کی رومانی داستانیں" پیش کیا گیا۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، سلیم آغا، ریاض احمد شاد، شاکر کنڈان، عابد خورشید، یوسف خالد، میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، ذوالفقار قیس، سید اعجاز حسین اور ولی محمد انجم شامل تھے۔

OO 15 ستمبر 2003ء کو رائٹرز کلب سرگودھا کا تنقیدی اجلاس پروفیسر سجاد نقوی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اور نجمہ منصور تھے۔ اجلاس میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی کتاب "جدید اردو افسانے کے رجحانات" پر گفتگو ہوئی۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر ریاض احمد شاد، پروفیسر یوسف خالد، ارشد ملک، طارق حبیب، شاکر کنڈان، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، ذوالفقار قیس، نسیم اقبال بھٹی، محمد ندیم چوہان وقاص قریشی، اور اعجاز نادر شامل تھے۔ نظامت کے فرائض طارق حبیب نے انجام دیئے۔

OO 17 اپریل 2004ء کو بج فورم کے زیرِ اہتمام ارشد ملک کے اعزاز میں شاندار تقریب منظیم ہال سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں پردہ سکرین پر مختلف اہلِ دانش، ادباء و شعراء کی آراء جو انھوں نے ارشد ملک کے لیے ریکارڈ کروائی تھی، دکھائی اور سنائی گئی۔ اس ڈاکومنٹری فلم میں سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے دکھائی گئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ممتاز عارف، یوسف خالد، صفدر رضا صفی، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) اور دیگر شامل تھے۔ اس تقریب میں مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ملک شعیب اعوان، چودھری محمد ابراہیم گجر ایڈووکیٹ، خواجہ ظفر اقبال اور ملک محمد اشرف اعوان تھے۔ خصوصی نشست پر چودھری طارق محمود حسکن تھے۔ حتمی شرکت میں گلزار اے شیخ اور قاسم علی تھے۔ اس تقریب کے لیے تیار کی گئی ویڈیو فلم کے ویڈیو گرافکس اینڈ ڈائریکٹر محمد ظفر خالق/محمد رفیق انجم تھے۔ اس تقریب کی کمپیئرنگ پروفیسر ریاض احمد شاد نے کی۔

OO 21 اپریل 2005ء کو شاعر، ادیب، دانش ور، پروفیسر غلام جیلانی اصغر (تمغہ امتیاز) کے اعزاز میں بج فورم کے زیرِ اہتمام ایک شاندار تقریب منظیم ہال سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی عبید ربانی قریشی (ڈی سی او سرگودھا)، مہمانانِ خصوصی عمر فاروق جوئیہ، گلزار اے شیخ، اور خواجہ ظفر اقبال تھے۔ جبکہ مقررین میں صاحبزادہ عبدالرسول، پرویز بزمی، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، پروفیسر یوسف خالد، ارشد ملک اور عابد خورشید تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ریاض احمد شاد نے انجام دیئے۔ حتمی شرکت میں عاصم محمد کلیار اور قاسم علی تھے۔

OO 22 ستمبر 2006ء بروز جمعہ رات سات بجے عابد خورشید کے شعری مجموعہ "لمس" کی تقریب رونمائی بج فورم کے زیرِ اہتمام قائداعظم لاء کالج سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ جس کے منتظم پرویز اکبر لودھی (ڈی آئی جی سرگودھا) تھے جبکہ جس کے مہمانانِ خصوصی سید وصی شاہ، چودھری مشتاق گل تھے۔ اعزازی نشستوں پر سجاد عباس نیازی، خالد اقبال، نصیر احمد چیمہ، محمد عادل، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر عبدالقادر خاں اور صاحبزادہ عبدالرسول تھے۔ مقررین میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، سجاد عباس نیازی، خالد اقبال، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ارشد ملک، ذوالفقار احسن، پروفیسر ریاض احمد شاد، راقم الحروف، نجمہ منصور، اور قاسم علی شامل تھے۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض بھی نجمہ منصور اور قرۃ العین نے انجام دیئے حتمی شرکت میں ارشد ملک، احمد علی، قاسم علی تھے جبکہ چشم براہ میں حسن محمود خان ایڈووکیٹ، عاصم محمد کلیار، سید شاہد بخاری، اور آصف حنیف تھے۔

OO کمشنر نذیر احمد چودھری 16-9-1988 تا 10-9-1991 اور کمشنر راؤ عبدالرشید خاں 15-9-1991 تا 20-2-1994ء) کے ادوار میں تین تین کل پاکستان محافل مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔ ان مشاعروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کی مشاورت شامل رہی۔

OO کمشنر تجمل عباس 21-2-1994 تا 5-8-1996 کا عہد اس لحاظ سے بھی یادگار ہے کہ انھوں نے 95-1994ء اور 1996ء میں کل پاکستان محفل نعت کا بھی اہتمام کیا۔ کمشنر ہاؤس میں نہ صرف ایک افطار ڈنر کا اہتمام کیا جاتا بلکہ محفل نعت بھی منعقد ہوتی۔ تجمل عباس گہرا ادبی ذوق رکھتے تھے اکثر محفلوں میں جوش اور اقبال کے اشعار سناتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے انھیں خاص عقیدت تھی۔ سید تجمل عباس نے اپنے سرگودھا تعیناتی میں تین کل پاکستان محافل نعت، اور تین کل پاکستان محافل مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ ان تمام محافل میں ڈاکٹر وزیر آغا کو خاص اہمیت دی گئی۔ سید تجمل عباس کمشنر، مظہر علی خاں ڈپٹی کمشنر، حامد علی خان ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر اور غضنفر ضیاء، راجہ گل نواز بطور اسسٹنٹ کمشنر ایک ایسی ٹیم میں شامل تھے، جس نے سرگودھا کے عوام کے دلوں پر حکمرانی کی۔ پولیس کی ٹیم، احمد نسیم ڈی آئی جی، ایس ایس پی، میجر فتح شیر جوئیہ، ایس پی میاں محمد آصف، ایس پی نثار احمد سرویا، پر مشتمل تھی۔ سرگودھا کی تاریخ میں ان احباب نے انسانی خدمت کے وہ یادگار نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

OO راقم الحروف نے "اقبال بحیثیت ادبی نقاد" تحقیقی مقالہ تحریر کر کے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اس موضوع کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کی خواہش تھی کہ "اقبال کو بحیثیت نقادِ حیات" پی ایچ ڈی کے مقالہ میں پیش کیا جائے لیکن اسلامیہ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے یہ خواب پورا نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا ان ادبی محافل کے حوالے سے اپنی سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" میں لکھتے ہیں:

> "جب میں 1959ء میں وزیر کوٹ سے سرگودھے پہنچا تھا تو پہنچتے ہی متحرک ہو گیا تھا اور میری زندگی کئی دائروں میں گردش کرنے لگی تھی ...... ایک مسلسل سفر کی سی کیفیت تھی۔ سرگودھا شہر میں ہوتا تو صبح شام مختلف جلسوں اور تنقیدی محفلوں میں شرکت کرتا۔ گھر پر آنے والوں کا بھی تانتا سا بندھ جاتا۔ مقدمات کے سلسلے میں بھی کچہریوں اور تھانوں کا طواف کرنا پڑتا۔ مگر ساتھ ہی حصولِ رزق کے لیے ہر دوسرے روز گاؤں جانا بھی ضروری قرار پایا تھا۔ پھر گورنر کی مشاورتی کونسل کا ممبر ہونے کے باعث، میں نہ صرف بار بار لاہور اور اسلام آباد جاتا بلکہ مجھے سیاست میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے بھی رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت پڑتی سرگودھے میں وفاقی وزراء میں سے کوئی شخص یا گورنر صاحب آتے تو ان سے گفتگو کرنے کا پہلا حق مجھے دیا جاتا اور مجھے اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان سے رسمی باتیں کرنا پڑتیں۔"

المختصر ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا کی عظیم الشان تقریبات کی شان تھے۔ پاکستان نیشنل سنٹر اور سرگودھا آرٹس کونسل کے قیام کی ابتدائی کارروائیوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام صفِ اول میں تھا۔ سید رضا جعفری، کشور ناہید، راقم الحروف، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر وزیر آغا نیشنل سنٹر کی اولین میٹنگ کے ممبران تھے۔ جس چیئرمین ڈپٹی کمشنر سرگودھا تھے۔ اسی طرح آرٹس کونسل کے قیام کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کی کاوشیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ میاں اکرم بھٹی کی رہائش گاہ ہو یا پولی ٹیکنیک کا ہاسٹل ہو یا، حلقہ اربابِ ذوق کی تقریب ہو یا انجمن ترقی اردو کا اجلاس، بار روم ہو، یا بزمِ حالی، نیشنل سنٹر ہو یا آرٹس کونسل کی تقریبات سرگودھا اکادمی ہو یا رائٹرز کلب کے اجلاس ہو یا حلقہ تخلیق ادب ہو یا مجلس تعمیر ادب کی تقریب، ایڈیٹرز کونسل میں صحافیوں کا اجتماع ہو یا سرگودھا پریس کلب کی کوئی تقریب، ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگرام ہوں یا کالجوں کی سالانہ ادبی تقریبات، محسنِ ادب سرگودھا ڈاکٹر وزیر آغا کے بغیر ان ادبی مراکز کی تقریبات نامکمل تصور کی جاتیں۔ جن تقریبات کا احوال لکھا گیا ہے ان میں راقم الحروف نے شرکت کی ہے علاوہ ازیں متعدد تقریبات ایسی ہیں جو ضابطہ تحریر میں موجود نہیں ہیں۔

❖OOO❖
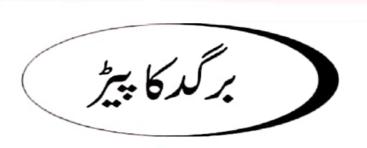
صدیوں پہلے کی بات ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس ریاست کے راجہ کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ جسے کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔انہیں میں سے ایک نام "ساکھیامنی" بھی تھا۔ راج کمار کی عمر سولہ سال تھی کہ اس کی شادی کرادی گئی۔ایک بچے نے بھی جنم لے لیا لیکن راج کمار کو کسی پل چین میسر نہیں تھا۔نجانے وہ کس شے کی کمی محسوس کرتا اور پھر......ایک دن وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ ہولیا۔ اس بن باس میں ٦ سال تک وہ دربدر، جنگل جنگل سکون کی تلاش میں پھرتا رہا۔حتیٰ کہ اروبلا کے مقام پر جا پہنچا۔ وہاں اسے ایک درخت نظر آیا۔ جس کی جڑیں ہی نہیں بلکہ شاخیں بھی جڑوں کے ساتھ زمین میں اتر کر درخت کی مضبوطی کا احساس دلا رہی تھیں۔ راج کمار نے جب اس کے پھیلاؤ اور سائے کو دیکھا تو اس کی ٹھنڈی چھایا نے اس کا دل موہ لیا۔ اسے ایک گونہ سکون محسوس ہوا اور وہ اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی برسوں کی تھکن میں کمی کا احساس ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے مراقبے، گیان اور غور وفکر کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دراصل اسے حق کی تلاش میں کامیابی کا سندیسہ مل چکا تھا۔ یہی سندیسہ اس کے لیے نروان تھا۔ اس نروان اور عرفان کے حصول کے بعد لوگ اسے بدھ کہنے لگے اور وہ چھتنار درخت جس کے تلے اسے عرفان وانکشاف کا سندیسہ ملا تھا۔ وہ بدھی یعنی عرفان وانکشاف والا شجر کہلایا۔ جسے ہمارے ہاں بڑ کا درخت کہا جاتا ہے۔ وہ بدھ یعنی عرفان پانے والا شخص ایک نئے مذہب کا بانی ٹھہرا اور اپنی تعلیمات کے باعث مہاتما قرار پایا۔ اور وہ درخت اس مذہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس اور لائق عبادت ٹھہرا۔

تقریباً اڑھائی ہزار سال بعد اروبلا کے اس برگد کے درخت سے ہزاروں میل دور اسی طرح ایک گیانی ایک برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر رادھے شیام کے نام کچھ تحریریں لکھتا ہے اور ویدانت اور تصوف پر گفتگو کرتا ہے تو اس کا جواں سال بیٹا بڑی توجہ سے ان باتوں کو سنتا اور تحریروں کو پڑھ کر اس کا رس اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دھرتی پر پورا اعتماد سے کھڑا، فضاؤں میں اپنے پتوں اور شاخوں سے دھوپ کی شدت کے آگے رکاوٹ بنا اور تھکاوٹ دور کر دینے والا یہ درخت اس کے دل ودماغ پر بھی حاوی ہوتا جا رہا ہے تب وہ کہتا ہے۔

"دھوپ

کبڑے عصا کو ٹیکتے

برگد کے سائے میں چلی آئی

معاً تھکی

تھک کر رک گئی

بولی

ارے تم ہو

چلو ہم بھی یہاں رک کر

تمہارا ساتھ دیتے ہیں

سمادھی اوڑھ لیتے ہیں

چلو ہم بھی اترتے ہیں

خود اپنی تہ کے اندر

اور خود کو ڈھونڈتے ہیں۔"

یہ الفاظ صرف ادا کرنے کی حد تک نہیں تھے بلکہ وہ جوان خود بھی اس برگد کو اپنے اندر ایک احساس کی صورت اترتا محسوس کرتا ہے۔ اسے جب سکون کی ضرورت یا عرفان کی طلب ہوتی ہے تو وہ نظریں کاڑ کر اس درخت کو دیکھنے لگتا ہے، اس کے اندر نئے نئے خیالات جنم لینے لگتے ہیں اور وہ شعرونثر کی صورت اپنی شاخیں اپنے تنے کی طرف موڑ کر زمین سے اپنی جڑت اس پیڑ کی طرح مضبوط کرنے لگتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ یہ درخت ہزاروں سال تک اپنی جگہ پر مستحکم رہتا ہے۔ اس کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ اس سے سورج کی شدت چھن کر زمین تک آتی ہے۔ اس کی شاخیں اس حد تک اس کا ساتھ دیتی ہیں کہ اس کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑی ہوتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اکیلا درخت ایک گھنا جنگل بن جاتا ہے۔ دھوپ اور بارش سے ستائے ہوئے پرندے اس پر آ کر بیٹھتے اور سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ تھکے ہارے مسافر اس کے سائے میں پہنچ کر امان محسوس کرتے ہیں۔ یہ خود ہی اگتا ہے اور پھر صدیاں گزر جاتی ہیں یہ اپنے آپ کو پھیلاتا رہتا ہے اس کے نیچے کوئی اور درخت سر نہیں نکال سکتا تو یہ تمام خصوصیات اس گیانی میں در آتی ہیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ ایک چھتنار برگد بننے لگتا ہے۔ پھر اسے عرفان مل جاتا ہے اس کی جڑت دھرتی سے اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ وہ ادب کی دھرتی پر ایک برگد بن جاتا ہے۔ اسے سورج کی شعاعیں سونے کی طرح نظر آتی ہیں۔ اسے شاخوں کا پھیلاؤ اپنی پوری عظمت کے ساتھ دکھتا ہے۔ اسے پرندوں کی خوشیوں سے بھری چہچہاہٹ سنائی دیتی ہے اور وہ ایسے منظر کو دیکھ کر جہاں اپنے ہونے کا عرفان ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"مرا اس سے

کوئی تعارف نہیں ہے

مجھے تو فقط

اپنے ہونے کا عرفان ہے۔"

وہاں وہ اس حیثیت کا بھی اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"دیکھا کہ ہر اک جانب

زرتاری کرنوں کا

اک زرد سمندر کا

اور زرد سمندر میں

چاندی کی پہاڑی پر

میں پیڑ تھا سونے کا

شاخوں میں مری ہر سو

جھنکار تھی پتوں کی

اڑتی ہوئی چڑیوں کی

یا آک کی ڈلیوں کی

اک ڈار سی آئی تھی

اور مجھ میں سمائی تھی

جب آنکھ کھلی میری۔"

یہ کوئی خواب نہیں تھا بلکہ وہ شخص واقعی ادب کے میدان میں ایک پیڑ کی صورت کھڑا تھا۔ اس کی اپنی لکھتیں شاخوں کی مانند اس کا سہارا تھیں اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنا رہی تھیں۔ ادب کے دلدادہ آتے اور اس برگد کے سائے میں سکون محسوس کرتے۔ یہاں سے خنکی کا احساس پاتے۔ اور پھر تازہ دم ہو کر نئے عزم کے ساتھ اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے وہ برگد کا پیڑ جسے لوگ وزیر آغا کے نام سے جانتے ہیں۔ اگرچہ اب ہماری نظروں کے سامنے نہیں رہا لیکن محسوسات پر اس کا سایہ ہر لحہ موجود ہے۔ وہ اپنے فیض سے آج بھی تشنگان ادب کو مستفید کر رہا ہے اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہے گا۔

میں تھوڑی سی تبدیلی کی معذرت کے ساتھ ان کے چند مصرعوں پر اپنی کہانی ختم کروں گا۔

وہ برگد کا اک پیڑ تھا

جس کی مانوس گہری، خنک چھاؤں میں

ہم نے عمریں بتائیں

وہ مخمل کا اک نرم چھتنار تھا

جس کے پتوں میں چھپ کر

مہکتی ہوئی دودھیا شاخ کا تھام کر

ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا

وہ پتوں کے پنکھے سے

شاخوں کی لوری سے ہم کو سلاتا رہا مسکراتا رہا۔

❖OOO❖

ہمارے آغا جی!

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

"ہم نے تو اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا ہے کہ ہمارے لیے کیلشیم بھی کم آن پڑی تھی"۔.......... انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا" میں اور غلام جیلانی اصغر دونوں شام کو مل بیٹھتے ہیں تو اسی طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں اُن کی ہڈیاں بھی کمزور ہو گئی ہیں۔"

ہمیں یوں لگا کہ وہ اتنے کھلے ظرف کے مالک ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی تکلیف کو بھی انجوائے کر رہے ہیں اور شکوے کا انداز بھی ظریفانہ ہے۔ وہ کہنے لگے" دراصل ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ آپ کی ہڈی کا فریکچر کیلشیم کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

ہم دونوں جو ڈاکٹر وزیر آغا کو ٹانگ کے فریکچر اور بعدازاں آپریشن ہونے کی وجہ سے عیادت کرنے آئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ عام مریضوں کی طرح منہ بسور کے بیٹھے ہوں گے لیکن اُن کا مورال ہائی دیکھ کر خود ہمیں بھی حوصلہ ہوا کہ ان کی طرف سے خصوصی طور پر بنوائی ہوئی چائے مع لوازمات کے خوشی سے پی جا سکتی ہے۔ اوپر سے خوش قسمتی سے ہماری ملاقات ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش سے ہو گئی جنھوں نے ہماری کتابوں "الو کھا لاڈلا" اور" دیسی ان ولایت" کی کھلے دل سے تعریف کر ڈالی تو ہمارے تو جھنگ سے سرگودھا تک کے سفر کے پیسے پورے ہو گئے بلکہ ساری تھکان کافور ہو گئی۔

دراصل ہم نے جونہی ڈاکٹر وزیر آغا کے فریکچر اور آپریشن کا ناصر عباس نیّر کی زبانی سنا تو فوراً سرگودھا جا کر ان کی عیادت کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں تو یہ سفر سونے کی تلاش کا نسخۂ کیمیا ثابت ہوا۔ جھنگ سے سرگودھا اور واپسی پر ناصر عباس نیّر جیسے فطین نقاد اور انشائیہ نگار کی ہم سفری کی خوشی اور پھر ان سے گفتگو میں جہاں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں کے استاد (ہم تو استاد ہی کہیں گے) ڈاکٹر وزیر آغا کی دھیمے اور میٹھے لہجے میں اپنی بیماری سے لے کر عالمی ادب کے افق پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان پر سیر حاصل گفتگو سے یہ مزا دو آتشہ ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ جب ہم نے یہ سنا کہ ابھی بشریٰ اعجاز صاحبہ بھی عیادت کر کے گئی ہیں تو ان کی شخصیت کے تصور کی مہک نے اسے تین آتشہ کر دیا کیونکہ ان دنوں ہماری ان سے بھی ملاقات ہو چکی تھی اور وہ اردو اور پنجابی نثر و شاعری میں اپنے قلم کے زور پر مقام بنا چکی تھیں۔ پھر یہاں ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے اثر کے محض ہم ہی بیمار اور طلب گار نہیں تھے بلکہ سو (ہزاروں اور لاکھوں کہنا چاہیے) یا سینکڑوں لوگ ان سے محبت کرنے والے تھے اور رہیں گے۔

یقین مانیے ہمیں اپنی کم مائیگی کا احساس کسی ادیب، شاعر کے سامنے کبھی اتنا نہیں ہوا تھا جتنا ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی اور ادبی گفتگو سن کر ہوا (گو کہ حسیناؤں نازنیناؤں کے سامنے بھی ہماری یہی حالت ہوتی ہے لیکن وہ سماں اور ہوتا ہے اور یہ سماں اور تھا) ہمیں تو جتنی سمجھ تھی اس حساب سے ہوں ہاں کرتے رہے، البتہ ناصر عباس نیّر گفتگو کی تہہ تک پہنچ رہے تھے اور ہم اس بیاہی گئی لڑکی کی طرح ہاں میں سر ہلا رہے تھے جسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا دولہا شکل و صورت اور سیرت کا کیسا ہے لیکن پھر وہ تین بار ہاں میں سر ہلا دیتی ہے بلکہ اسے اگر ہاں میں سر ہلانے میں کوئی دشواری پیش آ رہی ہو تو گھر کا کوئی بڑا اس کا سر پکڑ کر ہاں میں ہلا دیتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے ہمارا رومانس اس وقت شروع ہوا جب ہم نے اپنی پہلی کتاب "الو کھا لاڈلا" آپ بیتی کی شکل میں لکھ ڈالی تھی اور ہم اس تلاش میں سرگرداں تھے کہ ادب کے بڑوں کی اس بارے رائے معلوم کی جائے اور پھر اسے شائع کروایا جائے۔ احمد ندیم قاسمی سے تو ہماری ملاقات پنجاب میڈیکل کالج کے دورِ طالب علمی میں ہو چکی تھی جب وہ ہمارے کالج کے ایک فنکشن میں تشریف لائے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کو وہ فنکشن اس لیے نہیں بھول سکتا تھا کہ اس میں مخالف گروپ نے فائرنگ بھی کی تھی۔ انہیں تو ہم نے اس "حسین واقع" کا حوالہ دے کے خط لکھ دیا لیکن آغا صاحب کے لیے ایسا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ قاسمی صاحب کے تاثرات ہمیں مل چکے تھے لیکن ہم ڈاکٹر وزیر آغا کے تبصرے کے منتظر تھے کہ ایک دن آخر وہ خوشگوار لمحات آ گئے کہ جب انھوں نے ہمیں یہ لکھ بھیجا "معاشرے کے ناسوروں کو کاٹ کر پھینکنے کے عمل میں ڈاکٹر محسن مگھیانہ جس صفائی، برجستگی اور مہارت کو بروئے کار لائے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس پر مستزاد ان کی حسِ مزاح ہے جس نے معاشرے کے لیے اکسیر یا کا کام کیا ہے۔" اتنی بڑی ادبی شخصیت کا ہم جیسے نئے لکھاری کو یوں خراجِ تحسین پیش کرنا بڑے پن کی نشانی تھی جس نے ہمیں ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اور یوں ہم نے جیسے ہی ان کی بیماری کا سنا سرگودھے کا قصد کیا اور" اوراق" کی صورت میں برسہا برس سے ادب کے میدان کی آبیاری کرنے والی اس عظیم شخصیت کے حضور پیش ہو گئے۔

"الو کھا لاڈلا" کے بعد ہم نے لاہندی پنجابی میں جب کہانیوں کی کتاب "بھنبھیری" لکھی تو اس کی پذیرائی اور ہمارے شوق و ارفتگی کو دیکھتے ہوئے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے ہمیں اپنا ممبر منتخب کر لیا بعد میں بھنبھیری کا اردو اور انگریزی زبان کا ترجمہ بھی ہوا۔ اسی بورڈ میں ہمارے ساتھ پروفیسر ریاض احمد شاد بھی شامل تھے۔ جن کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ جب ہماری اردو سفرنامہ کی کتاب" دیسی ان ولایت" شائع ہوئی تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کی رونمائی سرگودھا میں کروائی جائے اور ساتھ ہی لالچ کے طور پر ہمیں کہا کہ ہم ڈاکٹر وزیر آغا سے درخواست کریں گے کہ وہ اس تقریب کی صدارت کریں اور بھلا آغا صاحب کا نام ہی کافی تھا بلکہ یوں کہیے کہ ہمارے منہ میں فوراً پانی بھر آیا۔ ہماری خوش قسمتی بھی دیکھیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نہ صرف کہ اس تقریب کی صدارت کی بلکہ اپنا تاریخی صدارتی خطبہ بھی دیا جس کا ایک ایک لفظ ہم سینے سے آج تک لگائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"اپنے سفرنامے" دیسی ان ولایت" میں محسن مگھیانہ اپنے سرجن ہونے کی حیثیت سے دست بردار نہیں ہوئے کیونکہ انھوں نے سرجری کے آلات کو ترک کر کے ظرافت کے آلات کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے سامنے زمانہ آپریشن ٹیبل پر پڑا ہے اور وہ اس پر طنز و مزاح کے سارے حربے استعمال کر رہے ہیں"

وزیر آغا صاحب ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے تو فارسی اپنے والد صاحب کی وجہ سے آتی تھی کیونکہ ان کا تعلق قزلباش خاندان سے تھا جو افغانستان سے یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ جبکہ پنجابی صحیح معنوں میں ان کی "ماں بولی" تھی۔ اردو انھوں نے سکول میں اور انگریزی اپنے برطانوی دوستوں سے سیکھی۔ بی اے گورنمنٹ کالج جھنگ سے کیا اور پی ایچ ڈی ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اپنے مقالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" پر عنایت ہوئی۔ وہ پہلے" ادبی دنیا" لاہور کے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ شریک مدیر رہے بعد میں ۱۹۶۵ء سے ماہنامہ "اوراق" کے مدیر رہے جو کہ ان کی آخری سانسوں تک ادبی دنیا کو آکسیجن فراہم کرتا رہا۔ اتنی عظیم ہستی کے ساتھ ہم سرگودھا کے فیصل (ڈسٹرکٹ کونسل) ہال میں سٹیج پر بیٹھ کر خود پر

رشک کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ راجا رسالو بطور مہمان خصوصی سٹیج پر تشریف فرما تھے جب کہ صاحبزادہ عبدالرسول مہمان اعزاز تھے اور پروفیسر ریاض احمد شاد سٹیج کو خوب سنبھالے ہوئے تھے۔ راجا رسالو نے تو اپنے ایک مختصر سے سفرنامے کو سنا کر سامعین کو لوٹ پوٹ کر دیا جب ان کا کوئی دوست ایک لڑکی کو لے اڑا تو اس لڑکی کو والدین نے اس سازش میں ان کا نام بھی شامل کرتے ہوئے کہا کہ تمھیں تب معافی ملے گی جب لڑکی کو واپس لے آؤ سو اس گمشدہ لڑکی کی تلاش میں انھوں نے جو سفر کیا اسی سے سامعین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا بھی خوب محظوظ ہوئے اور ان کے اس پنجابی سفرنامے کی خوب تعریف کی۔ تقریب میں ناصر عباس نیئر، ارشد ملک، آصف راز، نوازش علی عاصم، پروفیسر اجمل سعید پراچہ، بریرہ مریم، پروانہ شاہ پوری، اور ڈاکٹر انیس احمد نے بھی اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔

ہمارے پاس آغا صاحب کا فون نمبر بھی تھا لیکن انہیں فون کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچنا پڑتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ رعب و دبدبہ ڈالتے تھے بلکہ اس لیے کہ جس معیار (اور پیار) کی وہ گفتگو کرتے تھے اس تک پہنچنا ہمارے بس کی بات نہیں لگتا تھا لیکن وہ اس قدر پیاری شخصیت تھے کہ ہم ان سے بات کیے بنا رہ نہ سکتے تھے۔ اور پھر فون پہ ہم "ہوں ہاں" تو کر ہی لیتے تھے۔ یوں ہمیں ان کی گفتگو سے بہت سی باتیں سیکھنے کو ملتیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی فون کر لیا کرتے تھے ان کی وہ کال تو ہمیں کبھی نہیں بھولتی جب ان کی پنجابی نظموں اور غزلوں کی کتاب ''واجا باجھ وچھوڑے'' پر ہمارا مضمون پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سہ ماہی ''تماہی ادب'' میں شائع ہوا تو انھوں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے کی تھی یہ تہذیب بھی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر بڑے ادیب اسے اپنا حق سمجھ کر شکریہ ادا کرنا بھی گوارا نہیں کرتے مگر آغا صاحب تو آغا صاحب ہی تھے نا.......... ہم نے یہ مضمون ڈرتے ڈرتے لکھا تھا کہ کہیں ڈاکٹر وزیر آغا کے معیار پر پورا نہ اترا تو کیا ہوگا۔ لیکن اس کی اس پیار بھری کال نے ہمارا خون سیروں بڑھا دیا۔ پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے اس گھر بھی تشریف لائے جو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال جھنگ میں بطور سرجن تعیناتی کی وجہ سے ہمیں سرکار نے دیا تھا۔ اس نشست کا وسیلہ تو ناصر عباس نیئر بنے جن کی انشائیوں کی کتاب ''چراغ آفریدم'' کی تعارفی تقریب کی صدارت کے لیے آپ جھنگ تشریف لائے تھے۔ وہیں سے ہماری درخواست پر آپ ہماری رہائش گاہ میں تشریف لائے جہاں ایک مختصر مگر پروقار اور تاریخی ادبی نشست بھی اپنے آپ ہی منعقد ہو گئی۔ کیونکہ جہاں ادبی دنیا کے اتنے بڑے ستارے جمع ہوں۔ وہاں کوئی ادبی بات نہ ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہے اس تاریخی ٹھہرانے میں جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے رفعت سلطان، معین تابش، بیدل پانی پتی، ناصر عباس نیئر، احمد تنویر، انیس انصاری، مظاہر ترمذی، حنیف باوا، شفیع ہمدم، ممتاز بلوچ، عامر عبداللہ، کمال مہربانی سے ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی نظمیں سنائیں جدیدیت اور مابعد جدیدیت پہ گفتگو ہوئی ہم طفل مکتب کی طرح زانوئے ادب تہہ کر کے ان کے قدموں میں بیٹھ کر حیرت سے ساری باتیں سنتے رہے کہ جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت انسان ہوں اور ہم اپنے گھر میں نہیں کسی اور طلسماتی دنیا میں بیٹھے ہوں۔ ہم نے بھی جرأت کر کے ایک نظم سنا ڈالی جو ان دنوں نصیر احمد ناصر کے تسطیر میں شائع ہوئی تھی اور جب آغا صاحب نے اس نظم کی تعریف کی تو ہمارے پاؤں زمیں پہ نہ ٹکتے تھے۔ ایک اور خوشی کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمت کے لیے ہماری بیگم صاحبہ نے خود کھانا تیار کیا تھا عموماً وہ مرچ مصالحہ کم رکھتی ہیں آغا صاحب نے کھانے کی خوب تعریف کی اور کہا مدتوں بعد اپنی من مرضی کا کھانا نصیب ہوا ہے۔ ہماری بیگم ویسے بھی کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں (جس کی وجہ سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا ہے شاید اس نے سن رکھا ہے کہ خاوند کا دل جیتنا ہے تو اس کا راستہ اس کے پیٹ سے جاتا ہے واس کا کوئی طبی جواز تو نہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ ویسے ہم کسی خوف کی وجہ سے بیگم کی کوکنگ کی تعریف نہیں کر رہے وہ حقیقت میں ہی ایسا لذیذ کھانا پکاتی ہیں) ہم نے اب آغا صاحب کے قریبی دوستوں کی تحریروں میں پڑھا کہ وہ مرچوں والی غذا پسند نہیں فرماتے تھے تو یقین ہو گیا کہ انہیں ہمارے گھر کا کھانا اتنا زیادہ کیسے پسند آیا۔ آغا صاحب سالن میں بھی زیادہ مرچ مصالحہ پسند نہیں کرتے تھے اور وہ لوگوں کو بھی مرچ مصالحہ لگانے کے قائل نہیں تھے۔ بس وہ باتیں سن کر مسکرا دیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ فیض احمد فیض میں بھی یہی خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

مرتضٰی برلاس اکثر شکایت کرتے تھے کہ وہ شاعروں میں جاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ افسر آ گیا ہے اور افسروں میں جاتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں وہ دیکھو شاعر آ گیا ہے ہم مرتضٰی برلاس کے اس مقام تک نہیں پہنچے البتہ یہ ضرور ہے کہ کہیں غلطی سے ایک محفل میں شاعر ادیب اور ڈاکٹرز اکٹھے ہو جائیں تو شاعر ادیب کہتے ہیں یہاں اپنی برادری میں آ جاؤ جب کہ ڈاکٹرز اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ہم ہیں کہ باری باری دونوں طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔ نجانے کیوں عام معاشرے میں شاعروں ادیبوں ایسا آپریشن ہے کہ مریضوں کو ہمارا شاعر ادیب ہونا مناسب نہیں لگتا۔ شاید انہیں لگتا ہے کہ ڈاکٹری کے دوران ہم پر کوئی شعری واردات ہو گئی تو ہم ذہنی طور پر بھٹک نہ جائیں اور کہیں کچھ الٹ پلٹ علاج کر دیں حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ بہرحال دوسری برادریوں کی طرح شاعروں اور ادیبوں کی بھی ایک برادری ہے اور اب تو خیر اس برادری نے اپنے آپ کو یوں منوا لیا ہے کہ آپس میں رشتے بھی کرنے لگ گئے ہیں دوسرے لفظوں میں اب انہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہونا بھی شروع ہو گیا ہے۔ پہلے تو یہ خصوصیت جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت میں ہوا کرتی تھی کہ آپس میں رشتے کر کے شیر و شکر ہوتے تھے تاہم ادب ادبی برادری نے بھی یہ چیز پکڑ لی ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ اور نہ سہی کم از کم ایک دوسرے کے دکھ درد میں تو ضرور شریک ہوں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ہمیں آغا صاحب کی بیگم کی کینسر کی وجہ سے وفات کا علم ہوا تو ہم نے ایک بار پھر ناصر عباس نیئر کے ساتھ وزیر کوٹ کا قصد کیا تا کہ ان کے دکھ میں شریک ہوا جائے۔ یہ ہمارا وزیر کوٹ کا پہلا سفر تھا۔ وہاں بھی آغا صاحب اس تپاک سے ملے کہ لگتا تھا ہم صدیوں کے دوست ہیں حالانکہ عمر میں اتنا فرق تھا کہ شاید جب انھوں نے پی ایچ ڈی کی تھی تب ہم پیدا ہوئے تھے ان کی پی ایچ ڈی ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر تھی۔ ہو سکتا ہے انھوں نے اپنے تھیسس میں اردو طنز و مزاح میں کوئی کمی محسوس کی ہو اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کر دیا ہو (ویسے تو ابھی اس دنیا میں بہت سی کمیاں ہیں تو بھلا یہ چھوٹی سی جان کون کون سی کمیاں پوری کرے..........)

ڈاکٹر وزیر آغا نے شاعری، انشائیہ نگاری، تنقید، سفرنامہ نگاری بلکہ یوں کہیے کہ ہر صنف میں ادب کے موتی بکھیرے۔ ان کی کسی ایک صنف کو دوسری صنف پر برتری دینا مشکل ہے کیونکہ انھوں نے ادب کے ہر رنگ میں فن کی بلندیوں کو چھوا۔ شاعری میں نظمیں زیادہ اور غزلیں نسبتاً کم کہیں مگر جو کہا کمال کہا۔ شاعری کی قریباً بیس کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے دو پنجابی کی ''چنج تاریاں دا'' اور ''واجاں باجھ وچھوڑے'' تھیں جنھیں پڑھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے آپ صرف پنجابی میں لکھتے ہیں۔ باقی سب اردو میں تھیں جن میں ''چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' میں 1991 تک کی نظمیں اور پھر غزلوں کے اسی عنوان سے ایڈیشن میں 1998ء تک کی غزلیات شامل تھیں گویا یہ نظموں اور غزلیات کی کلیات تھی۔ مگر بعد ازاں اظہار سنز لاہور نے ''چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' کے نام سے ان کی تمام غزلیات کو کلیات کی شکل دے دی۔ اسی طرح کے تمام انشائیے پگڈنڈی سے روڈ رولر تک'' میں شامل تھے جن کی پہلی جلد 1995 اور دوسری 2010 میں شائع ہوئی تنقید میں ان کی تحریر عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اور اس پر ان کی 17 کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہوئیں جب کہ اردو میں ان کی پانچ متفرق کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جن میں سفرنامہ ''تین سفر'' بھی شامل ہے۔ البتہ 1995ء میں The Symphony of Existence کے نام سے انگریزی میں جو کتاب شائع ہوئی اس نے اندرون و بیرون ملک بہت پذیرائی حاصل کی ان سب سے الگ ان کی سات تالیفات بھی تھیں۔

ان کی زندگی میں ہی مختلف رسائل نے ڈاکٹر وزیر آغا نمبر شائع کیے جن میں ''الزبیر'' ''آواز جرس'' ''سکائی لارک'' ''تخلیقی ادب'' ''طلوع افکار'' ''چہار سو'' ''تسطیر'' اور ''کاغذی پیرہن'' شامل ہیں۔ ان کے فن پر ڈاکٹر انور سدید، سجاد نقوی، حیدر قریشی، اور ناصر عباس نیئر نے جامع کتب تحریر کیں

جبکہ اندرون ملک اور بیرون ملک ان پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے گئے۔ پاکستان میں پی ایچ ڈی کے مقالات اس لیے نہ لکھے جا سکے کہ یہاں زندہ رہنے والوں پہ پی ایچ ڈی نہیں ہو سکتی سو یہ کام بھارت میں ہوا (ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں پاکستان میں بھی پی ایچ ڈی، ایم فل کے کئی مقالہ جات لکھے گئے ہیں) ہمیں بھی ہماری ادبی خدمات پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کروانے کی آفر کے ساتھ جب یہ بتایا گیا کہ ایم فل کے لیے ساٹھ سال کا ہونا ضروری ہے اور پی ایچ ڈی کے لیے مرنا ضروری ہے تو ظاہر ہے ان آفرز کو Reject کیے جانے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ رہ سہہ کے ہم پر ایم اے کا تھیسس ہی لکھا جا سکا جو کہ ڈاکٹر عقیلہ شاہین نے ہماری پہلی کتاب "الوکھا لاڈلا" پر روبینہ کریم سے لکھوایا جو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے اب ایم اے پاس کر چکی ہیں۔

جب ہماری پہلی کتاب "الوکھا لاڈلا 1994ء میں شائع ہوئی تو ہم نے جان بوجھ کر احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی آراء آمنے سامنے صفحات پر شائع کیں۔ حالانکہ یہ طنز و مزاح کی کتاب تھی لیکن ہم اس بات میں سنجیدہ تھے کہ یہ دونوں ہستیاں ہمارے ادب کا لیجنڈ ہیں۔ جب وزیر آغا کمال مہربانی سے ہمارے گھر جھنگ تشریف لائے تو بعد میں ہم نے روٹری کلب جھنگ کے مشاعرے کے لیے صفدر سلیم سیال سے مل کر احمد ندیم قاسمی کو بھی دعوت دی مگر وہ علالت کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ ہماری شدید خواہش تھی کہ ان دونوں ہستیوں کو ملانے میں ہم کامیاب ہو جائیں لیکن پھر ہمیں یہ بھی احساس ہوا کہ ہماری "ہستی" جسے عام لفظوں میں شاید "اوقات" کہتے ہیں اتنی نہ تھی کہ یہ کام سرانجام دے سکتے تاہم ایسی پیاری خواہش رکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تھا۔

پھر ہمیں جب یہ خبر ملی کہ آغا صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تو ہم سکتے میں آ گئے۔ تب ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اب ہم خود بھی اس دنیا میں ہیں یا نہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے React کریں۔ موبائل فون پر ایس ایم ایس آنے شروع ہو گئے۔ ٹی وی پہ خبریں چلنا شروع ہو گئیں مگر زبان تھی کہ گنگ تھی۔ البتہ دل میں انا للہ وانا الیہ راجعون ضرور پڑھ رہے تھے اور پھر وزیر کوٹ کا دوسرا سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ صفدر سلیم سیال، عامر عبداللہ، غلام شبیر اسد، اور جنید امجد کو ساتھ لیے اب ہم اپنی گاڑی میں جو سفر کر رہے تھے تو منزل پہ پہنچ کر ڈاکٹر وزیر آغا سے تو باتیں نہ کر سکتی تھی بس قل خوانی پر ان کے پیارے بیٹے سلیم آغا قزلباش سے ملنا تھا لیکن اس سے کیا بات کرنی تھی کیسے پرسہ دینا تھا بلاشبہ نقصان ان کا سب سے زیادہ ہوا تھا مگر ہم بھی تو اپنے ادبی سرپرست دوست سے محروم ہو گئے تھے۔ وہاں افسر ساجد، علامہ ضیاء حسن ضیاء شاید شیدائی، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، ارشد ملک، شاکر کنڈان، شفیق آصف، طارق حبیب ،............اور ہم بھلا کس کس کا نام لیں سبھی غم خوار تو پہنچے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید اور ناصر عباس نیئر پہلے ہو کے چلے گئے تھے۔ جب ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا کی قبر پر لے گئے تو آنسو چھلک جانے پہ ہمارا اختیار ختم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وزیر آغا کی چند غزلیں

غزل

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا
حدِ افق پہ شام تھی خیمے میں منتظر
آنسو کا اک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا
جاتے کہاں کہ رات کی بانہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا
لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو ایک کوہِ گراں رہ گزر میں تھا
اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا
پاگل سی اک صدا کسی اجڑے مکاں میں تھی
کھڑکی میں اک چراغ بھری دوپہر میں تھا
اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ وش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

غزل

اُس تیغ ہَوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے
اپنے ہی گھر میں بے در و دیوار ہم بھی تھے
ہم نے بھی ساری عمر کیا خود کو تار تار
اپنے بدن میں کُند سی تلوار ہم بھی تھے
دامن دریدہ تم ہی نہیں تھے فقط وہاں
بے آبرو کھڑے سرِ بازار ہم بھی تھے
اک لفظ بے صدا کے رہے ہم بھی منتظر
ہاں اک نئے جنم کے طلب گار ہم بھی تھے
کوہِ ندا کے سحر میں تھا گم تمام شہر
اور شہر کے فسوں میں گرفتار ہم بھی تھے
کوزوں کے ساتھ ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں
اُس شہرِ بے مثال کے آثار ہم بھی تھے
ہم سے بھی پوچھتا کوئی سرکش لہو کا راز
اپنے بدن کے مالک و مختار ہم بھی تھے

غزل

بادل برس کے کھل گیا، رُت جواں ہوئی
بوڑھی زمیں نے تن کے کہا، میں جواں ہوئی
مکڑی نے پہلے جال بُنا میرے گرد، پھر
مونس بنی، رفیق بنی، پاسباں ہوئی
شب کی رکاب تھام کے خوشبو ہوئی جدا
دن چڑھتے چڑھتے بسری ہوئی داستاں ہوئی
کرتے ہو اب تلاش ستاروں کو خاک پر
جیسے زمیں، زمیں نہ ہوئی، آسماں ہوئی
س بار ایسا قحط پڑا چھاؤں کا کہ دھوپ
ہر سوکھتے شجر کے لیے سائباں ہوئی
گیلی ہوا کے لمس میں کچھ تھا وگرنہ کب
کلیوں کی باس گلیوں کے اندر رواں ہوئی
آتا ہے گر تو آ کہ چلنے لگی ہوا
کشتی سمندروں میں کھلا بادباں ہوئی

ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ کچھ یادیں کچھ باتیں

خالد اقبال

پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان سرگودھا

ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے عہد کی ادبی و تہذیبی زندگی کا نہایت قیمتی اثاثہ تھے۔ وقت گزرتے ہی پتہ چلے گا کہ وہ کتنے بڑے تخلیق کار تھے یہ جملہ میں نے کچھ اس بابت لکھا ہے کہ ابھی تعصبات، گروہ بندیوں کے آثار اور باقیات موجود ہیں ۔ میں پورے یقین سے یہ بات دوبارہ لکھ رہا ہوں کہ وہ ہمارے عہد کے بہت بڑے تخلیق کار تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ وہ زندہ رہنے، ہمیشہ زندہ رہنے والے تخلیق کاروں میں سے ہیں۔ مجھے ان کی شخصیت میں پیار اور علمی وژن دو وزن بہت واضح اور نمایاں دکھائی دیا۔ ان کے لہجے میں ٹھہراؤ، گفتار میں نرمی، مزاج میں قوت برداشت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ شائستگی، انسان دوستی اپنی شرافت اور وضعداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے یہ باتیں ان سے اپنی چند ملاقاتوں، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر لکھی ہیں۔ اگر میں ڈاکٹر وزیر آغا سے سلسلہ تعلق کا سراغ تلاش کروں تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ۸۰ کی دہائی کا آغاز ہے جب اردو انشائیہ کی بحث اپنے عروج پر تھی۔ اردو ادب کی اس نووارد صنف کے موجد ڈاکٹر وزیر آغا کا نام علمی ادبی حلقوں میں گونج رہا تھا۔ بہت سے سینئر ادیب و قلمکار جو طنز و مزاح یا کالم نگاری فرماتے تھے وہ انشائیہ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اپنی تحریروں کی پیشانی پر انشائیہ لکھنے لگے تھے لیکن نئے لکھنے والوں میں وہ پذیرائی نہ حاصل کر سکے۔ ملتان کی ادبی فضا میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے معروف علمی ادبی جریدے "اوراق" کا انشائیہ نمبر لانے کا اعلان کیا۔ ملتان سے بہت سے ادیبوں تخلیق کاروں نے اپنے اپنے مسودے ڈاکٹر وزیر آغا کو روانہ کیے۔ اوراق کا انشائیہ نمبر شائع ہوا تو ملتان سے صرف مجھ ناچیز کا انشائیہ شامل تھا۔ حالانکہ میرا ڈاکٹر وزیر آغا سے محض قلمی (خط و کتابت) کا رشتہ تھا۔ اوراق کے انشائیہ نمبر میں میرے انشائیے "گوبھی کا پھول" کو شائع کرنا ان کا اپنا فیصلہ تھا جو میرے لیے حوصلہ افزائی اور یقیناً خوشی کا باعث تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار ڈاکٹر وزیر آغا اردو اکادمی ملتان کے اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے کہ وہاں اردو انشائیہ کی بحث نے بہت زور پکڑ لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ، بہت دلیلوں سے وضاحت فرما رہے تھے کہ ایک صاحب (جن کا نام مجھے یاد نہیں) بہت جوش میں آ گئے اور کج بحثی پر اتر آئے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی گفتگو بردباری کے ساتھ سنتے رہے اور صرف اتنا کہا "انشائیے کو سمجھنا ہے تو انشائیے کو پڑھیں، اس کا مزاج کو سمجھیں ورنہ اس طرح کی بحث تو گرد کی طرح ہوتی ہے اور غبار کی مانند خود بخود بیٹھ جاتی ہے۔ وقت نے ثابت کیا اردو انشائیے کے حوالے سے بحث غبار کی طرح اڑی اور گرد کی مانند بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ادبی جریدے "اوراق" کے ذریعے مجھ سمیت سینکڑوں ہزاروں شاعروں ، ادیبوں، تخلیق کارون کو متعارف کرایا، جو کہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ادب میں اپنی حیثیت او رمقام بنا چکے ہیں۔ اردو انشائیہ کے مزاج اور انفرادی عناصر ترکیبی میں ایک خاص بات "انکشاف ذات" کا عمل ہے۔ یعنی تخلیق کار کی ذاتی زندگی اور اس کی زندگی کی دلچسپیوں، خیالات کی واضح جھلک انشائیے میں نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں آنے والے وقتوں میں ادب کے طالب علموں نے اگر کرید کی تو ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں انکشاف ذات کا عمل واضح دکھائی دیتا ہے جسے الگ سے "آپ بیتی" میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔" شام کی منڈیر سے" اگرچہ ڈاکٹر وزیر آغا کی خوبصورت دلآویز آپ بیتی ہے جو اپنی عمدہ نثر نگاری اور اسلوب بیان کے حوالے منفرد کتاب ہے تاہم میری تجویز کا مقصد اس بات کی طرح اشارہ ہے کہ اردو انشائیے میں یہ کس قدر خوبی ہے کہ اس صنف کے توسط سے انشائیہ نگار کے شخصی رویے اور تخلیق کار کی شخصیت کو آپ بہت حد تک جان سکتے ہیں۔

ایک جملہ ہم اکثر روایتی انداز میں لکھتے سنتے آئے ہیں کہ فلاں شخص ہمہ صفت ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا فی الحقیقت ایسی تخلیقی شخصیت ہیں جس کے کئی پہلو ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت شاعر، تنقید نگار، مدیر، نظم نگار، و دیگر کئی حیثیتوں میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء سے پہلے میرا ڈاکٹر وزیر آغا سے قلمی رشتہ تعلق تھا، ۲۰۰۵ء، ۲۹ مئی کو جب ریڈیو پاکستان سرگودھا کا افتتاح ہوا تو میں ملتان سے سرگودھا آ گیا۔ چند روز تو ریڈیو پاکستان سرگودھا کی افتتاحی مصروفیات میں گزرے اس کے بعد یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ڈاکٹر وزیر آغا سے شرف نیاز و ملاقات نہ کرتا۔ تو میں نے پہلی فرصت میں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ کے توسط سے ڈاکٹر وزیر آغا سے شرف ملاقات حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات ۵۸ ، ریلوے روڈ سرگودھا ان کے گھر ہوئی۔ نہایت محبت اور شفقت سے ملے۔ میں نے انہیں ریڈیو پاکستان سرگودھا کے سٹوڈیو میں انٹرویو ریکارڈ کرانے کی دعوت دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی اور دوسرے روز ڈاکٹر وزیر آغا وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔ میں انٹرویو ریکارڈنگ سے پہلے ان کے سامنے سوال نامہ رکھا تو انھوں نے سوالنامہ کے صفحات ایک طرف رکھ دیئے اور کہا گفتگو ریکارڈ کی جائے۔ میرا خیال تھا چند ایک سوالات جو معترضہ تھے شاید ڈاکٹر صاحب ان پر گفتگو نہ کریں لیکن انھوں نے نہایت مدلل اور ٹھوس علمی حقائق کی بنیاد پر واضح اور دوٹوک انداز میں گفتگو کی۔ ان کی شیریں اور متانت بھرے لہجے کی گفتگو اب بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی، ادب و شاعری کی معاشرے میں اہمیت و افادیت ، اپنی جدید نظم نگاری، انشائیہ، نظم جدید کی کروٹیں، امتزاجی تنقید کی اہمیت غرض اس نشست میں انھوں نے دیگر بہت سے ادبی موضوعات پر تقریباً ایک گھنٹہ برابر گفتگو فرمائی۔ ان کا یہ انٹرویو ریڈیو پاکستان سرگودھا کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ سرگودھا رائٹرز کلب کے تنقیدا جلاس کیونکہ ڈاکٹر وزیر آغا کی اسی کوٹھی میں ہی ہوتے ہیں جب بھی ڈاکٹر وزیر آغا لاہور سے تشریف لاتے ان کی اطلاع عابد خورشید اور ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ تمام دوستوں کو کر دیتے تھے اور یوں ڈاکٹر صاحب کے ہاں اس طرح کی متعدد مجالس میں مجھے بھی موقع میسر آیا۔ ہر آنے والے مہمان کا ڈاکٹر وزیر آغا اپنی خوبصورت مسکراہٹ سے استقبال کرتے۔ اس طرح کی مجالس میں پروفیسر یوسف خالد، پروفیسر طارق حبیب، ذوالفقار احسن، ریاض احمد شاد، صاحبزادہ عبدالرسول، ارشد ملک، ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، نسیم اقبال بھٹی، مرتضیٰ حسن، شفیق آصف، عابد خورشید، کے علاوہ اور بہت سے نمایاں شعراء و ادباء شامل ہوتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اس طرح کی نشست میں کم کم بولتے لیکن جہاں مناسب سمجھتے وہاں ضرور اظہار خیال فرماتے۔ ان کی یہ گفتگو علمی اور شگفتہ عناصر کی حامل ہوتی تھی اور گاہے گاہے ایسی باریک اور لطیف بات کرتے تھے کہ محفل زعفران ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس بنا پر ان کا کام اور نام امر ہے لیکن اس کے
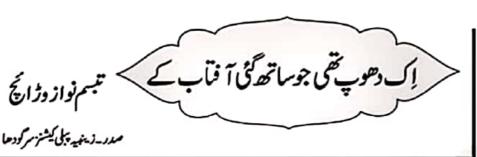
ساتھ ساتھ پنجابی شاعری ''واجاں یا جھ وچھوڑے/ ننج تاریاں دا'' کومل اور لطیف جذبوں کی شاعری بھی زندگی کے محسوسات اور تجربات سے بھرپور تادیر زندہ رہے گی۔ ان کی پنجابی زبان سے محبت اور شاعری کے حوالے سے میں نے پنجابی زبان میں غالباً ان کا پہلا انٹرویو ریکارڈ اور ریڈیو پروگرام پنجابی ادبی بیٹھک میں نشر کیا جس میں انھوں نے پنجابی زبان کی قدامت، اردو کے ساتھ اس کا لسانی رشتہ، اردو زبان کی مضبوطی کے لیے علاقائی زبانوں کے فروغ اور پنجابی شاعری میں زبان کے خالص استعمال پر بات کی۔

ڈاکٹر وزیر آغا جب بھی لاہور سے سرگودھا تشریف لاتے تو دیگر دوستوں کے ساتھ ساتھ مجھے کمال مہربانی سے اپنی علمی ادبی نشست میں ضرور یاد فرماتے اور میں ان کے ہاں حاضری دیتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بذریعہ ٹیلی فون شروع ہوگیا کیونکہ 2008ء کے بعد آغا صاحب اپنی طبیعت اور صحت کی وجہ سے سرگودھا کم کم آنے لگے تھے لیکن سرگودھا اور یہاں کے اہل ادب کے ساتھ ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ اسی دوران ڈاکٹر وزیر آغا کی بہت سی نایاب و ناپید کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ان کی نظموں، انشائیوں کے انتخاب شائع ہوئے وہ مجھے اپنی کتابیں جناب طارق حبیب اور عابد خورشید کے توسط سے بھجواتے رہے۔ اردو انشائیہ کے ضمن میں ان کی ایک کتاب جس میں عابد خورشید اور میں نے مشترکہ سوالنامہ ترتیب دیا تھا اس کی اشاعت کے حوالے سے ایک دن میں انہیں لاہور فون کیا تو فرمایا ''جی ہاں کتاب چھپ گئی ہے'' میں نے پوچھا کیسے ملے گی تو شگفتہ اور برجستہ جواب دیا'' پیسوں سے ملے گی'' میری یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کی وفات سے اندازاً 20 تا 30 دن پہلے کی بات ہے۔ جو مجھے اب تک یاد ہے اور وہ آٹوگراف جو میں نے پہلی بات ان سے لیا تھا جب وہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی اردو ڈیپارٹمنٹ تشریف لائے تھے۔ آٹوگراف کا شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔

اُسے بند آنکھ سے میں دیکھ تو لوں
مگر پھر عمر بھر کا رَت جگا ہے

❖OOO❖

تبسم نواز وڑائچ

صدر۔ زینبیہ پبلی کیشنز، سرگودھا

اس وقت میرے حافظہ کی غلام گردشوں میں ناخدائے سخن مرزا نوشہ کا یہ شعر گونج رہا ہے۔

جیب و دامان و گریباں، بخیہ و چاک و رفو
عشق کے اک کام سے کتنے نکل آتے ہیں کام

سچ پوچھیے تو ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے حوالے سے اگر کوئی لکھنا چاہے تو صرف ایک ڈاکٹر وزیر آغا کا نام لینے سے نہ جانے کتنی جہتیں، کتنے کردار، فن اور ادب کے کتنے ایوان، فکر اور اُسلوب کے کتنے گلستان، تخلیق اور تنقید کے کتنے در ہمارے دولت کدۂ خیال میں یکے بعد دیگرے کھلتے اور کھلتے جائیں گے۔ کیا کثیر الجہت علمی و ادبی نابغۂ روزگار شخصیت تھی کہ جس نے جنم تو سرگودھا کی سرزمین سے لیا مگر جس پر مادرِ وطن ہی نہیں گلستان اردو ادب ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔ ایک بے مثل نقاد، منفرد لہجہ کے شاعر، یکتائے روزگار دانشور، سنجیدہ خلاقِ ادب، محترم و معتبر نثر نگار، نظم کے میدان کے مانے ہوئے شہسوار، جدید اردو نظم اور انشائیہ کی کوئی بھی تاریخ جن کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ایک موقر ترین شارحِ کلامِ غالب کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر وزیر آغا کا نام ممتاز ہے۔ اس حوالے سے ان کی کتاب '' غالب کا ذوقِ تماشا'' حوالہ کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

''اوراق'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کی اپنی ایک شاندار اور خوبصورت و یادگار تاریخ ہے۔ ان سب حوالوں سے شناختوں پر حاوی ڈاکٹر وزیر آغا کی پہچان ایک عہد ساز شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ انسان ساز فرد کی بھی ہے کہ جن کے زیرِ سایہ بہت سی بلند قامت اور ممتاز ادبی شخصیات نے تربیت پائی اور اُن کے جوہر اس ادبی برگد کی چھاؤں میں نمو پذیر ہوئے۔ یہ درست ہے کہ اپنی خداداد علمی و ادبی صلاحیتوں کے حوالے سے اور اپنے افکار کی گہرائی و گیرائی کے اعتبار سے وزیر آغا کے فن پر ہم یہی تبصرہ کر سکتے ہیں کہ ایک عہد اختتام پذیر ہوگیا ہے۔ لیکن انھوں نے جس وسیع اور کثیر الجہت حوالوں سے اپنے فن کو پھیلاؤ عطا کیا۔ اس کے اثرات اردو ادب پر دائمی ہیں اور ان کی تخلیقات کے حوالے سے اردو ادب کے تخلیقی و تنقیدی حلقوں کے ساتھ دنیا بھر کے علمی و ادبی اداروں اور یونیورسٹیوں میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس قدر تحقیقی مقالہ جات تحریر کیے جا چکے ہیں کہ جن کو احاطۂ تحریر میں لانا شاید اتنا آسان کام نہیں ہے۔ برِعظیم پاک و ہند کے نامور نقاد، انشائیہ نگار، شاعر اور محقق ڈاکٹر وزیر آغا گو کہ آج جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن فکری اور تخلیقی حوالے سے انہیں شاید کبھی گردشِ زمانہ ہم سے جدا نہیں کر پائے گی وہ اپنی بے مثال تحریروں، لاجواب تنقیدی مضامین، بے نظیر شاعری، جاندار انشائیوں اور زندہ و جاوید نظموں کی مہک کے ذریعے ہمیشہ اردو ادب کے دالانوں اور فکر کے ایوانوں کو مہکائے رکھیں گے وہ سوچ کے دروازوں پر ہر عہد میں دستک دیتے رہیں گے۔ ان کے خیالات کی دھنک چمکتی بھر روشنی کی صورت میں پھیلتی رہے گی اور ان کے لفظوں کی مہک ہماری فکری کے چمنستان میں سدا چہکتی رہے گی۔

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وزیر آغا کی نذر

اُردو ادب کی شان تھے ڈاکٹر وزیر آغا
اہلِ سخن کی جان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

سینچا لہو سے اپنے اُردو کا گلستان
جذبوں کی اِک اُٹھان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

علم و ادب کی دُنیا کے ان تھک تھے راہوار
اِک عزم عالیشان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

شعر و سخن کی بزم کی ان سے تھیں رونقیں
حکمت بھر بیان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

بزمِ حیات و فن کے فردِ فرید تھے
دانش کی آن بان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

وہ اپنی ذات میں تھے بھرپور انجمن
ہم سب پہ مہربان تھے ڈاکٹر وزیر آغا

تبسم نواز وڑائچ

❖OOO❖

وزیر آغا ---- چند یادیں، چند باتیں

فہیم احمد صابری
لیکچرار شعبہ اردو
گریژن کیڈٹ کالج کوہاٹ

۲۰۰۱ء کا ذکر ہے کہ راقم الحروف نے ایم اے اردو کی سطح پر مقالہ لکھنے کے لیے "ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں کے انگریزی تراجم" کا موضوع انتخاب کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا اسم گرامی میرے لیے نامانوس نہیں تھا کیونکہ میں اس وقت تک ان کی چند کتب کا مطالعہ کر چکا تھا تاہم وزیر آغا پر قلم اٹھانا اور وہ بھی ان کی نظم پر کچھ ایسا آسان بھی نہ تھا لیکن مقالہ لکھنے کے دوران محترم وزیر آغا کا تعاون کچھ یوں شامل حال رہا کہ ادبی حوالے کے ساتھ ساتھ وزیر آغا کا مقام و مرتبہ بطور خلیق انسان میری نظروں میں بہت بلند ہو گیا۔ میں سوچا کرتا تھا معلوم (اسی) ۸۰ کتابوں کے خالق سے ملنے کے لیے کن کن حوالوں کو بروئے کار لانا پڑے مگر جب آغا جی سے ملنے ان کی کوٹھی متصل سول لائنز سرگودھا گیا تو یہ ملاقات میری متاع حیات ٹھہری۔ راقم جب آج ۲۰۱۰ء کے شام کنارے کھڑا ہو کر ۲۰۰۱ء کے شب و روز کی جانب مڑ کر دیکھتا ہے تو عجب پر بہار منظر دکھائی پڑتا ہے۔ المختصر (۷۸) سالہ بزرگ اپنے پلنگ پر دراز ہیں اور سامنے دھرے صوفوں پر سرگودھا کے قلم کار تشریف فرما ہیں ایک طرف رکھی صوفی چیئر پر محترمہ نجمہ منصور بیٹھی ہیں درمیان میں چائے کی ٹرالی پڑی ہے جس پر پکوڑے، سموسے، کیک اور بسکٹ کے ساتھ ساتھ چائے موجود ہے جو میزبان کی فراخی دلی کا پتہ دیتی ہے۔ ذوالفقار احسن آغا جی کے پرسنل سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہیں ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث وزیر آغا مجھے اپنے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور کچھ ایسا خلیق انداز ہوتا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا ہاتھ چوم لوں انھوں نے ایک مہربان کی طرح میری رہنمائی فرمائی اور بار ہا ملاقاتوں نے بہت سی جھجک کافور کر دی۔ بطور تحفہ ان کی عطا کردہ کتب آج میری ذاتی لائبریری کا حسن ہیں۔ جنھیں میں سینت سینت کر رکھتا ہوں۔ "شام اور سائے"، "اک کتھا انوکھی"، "عجب اک مسکراہٹ"، "ہم آنکھیں ہیں"، "چنا ہم نے پہاڑی راستہ"، "آدھی صدی کے بعد" Halp a ecntury Lateri Selected poems fo Wazir Agha, miled and 'seven poems of wazir Agha, A Tale so Strange poems and Haiku poems , mellow poems, اور کچھ اور کتب شامل ہیں اس مختصر مضمون میں سب کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ انگریزی کتب دراصل وزیر آغا کی اردو نظموں کا ترجمہ ہے جو خود انھوں نے بھی کیا اور بڑی تعداد میں دوسرے اصحاب نے بھی کیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عصر کے وقت وزیر آغا کا گھر اک کارواں سرائے کا روپ دھار لیتا جہاں کتنے ہی صاحبان فہم وذکا اترتے۔ یہ روز کا معمول تھا وہ سرگودھا میں ہوتے تب بھی اور لاہور میں ہوتے تب بھی تاہم سرگودھا میں ان کا ٹھہراؤ کم ہوتا۔ ملازمت کی مجبوری کے تحت راقم کو کوہاٹ میں سکونت اختیار کرنا پڑی اور یوں وزیر آغا سے ایک طرح کی جدائی ہو گئی جب کبھی سرگودھا جانے کا اتفاق ہوتا تو سب سے پہلے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ سرگودھا رائٹرز کلب کے تحت مہینے کی پہلی تاریخ کو مشاعرہ جبکہ پندرہ تاریخ کو ایک تنقیدی اجلاس کا انعقاد ہوتا ہے جہاں کبھی کبھی سرگودھا یونی ورسٹی میں منعقدہ اجلاس میں وزیر آغا بھی تشریف لاتے۔ یاد پڑتا ہے انھوں نے امتزاجی تنقید کا نظریہ پیش کیا تھا چنانچہ انہیں امتزاجی تنقید پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا جہاں ان سے کئی سوالات ہوئے جن کا انھوں نے بڑے تحمل اور علمی بصیرت سے جواب دیا۔ بعد میں مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب "وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی" چھپی۔

۲۰۰۶ء میں دل پھر مچلا کہ وزیر آغا سے ملاقات کی کوئی صورت ہونی چاہیے چنانچہ ملاقات کا بہانہ ان کا انٹرویو ٹھہرا۔ ان دنوں وہ لاہور میں تھے۔ وقت مانگ کر مقررہ تاریخ کو جب راقم چند طلباء کے ہمراہ ان کے گھر پہنچا تو آغا جی کو کوٹھی کے گیٹ پر چشم براہ پایا۔ حق تو یہ ہے کہ ملاقات کے اولین چند ثانیے اتنے خوبصورت تھے کہ اگر وہ انٹرویو دینے سے معذرت کر لیتے تب بھی یہ ملاقات مدتوں شاداب رہتی۔

تین گھنٹے کے طویل انٹرویو میں انھوں نے میرے ہر سوال کا بڑا واضح مدلل اور حسب معمول ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا ان کا مسرور چہرہ اور میٹھی آواز اب بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ تراسی سالہ وزیر آغا مسلسل تین گھنٹے محو گفتگو رہنے کے باوجود تازہ دم تھے۔ پرویز بزمی بھی سارا وقت وہیں موجود رہے اور انھوں نے زیادہ وقت سگریٹ پینے اور خراٹے لینے میں گزارا۔ آغا جی ایک بار پھر ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آئے بعد میں، میں نے ان کا انٹرویو کالج میگزین "گیریژونین" میں چھاپ دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے ذکر کے بغیر یقیناً اردو ادبی تاریخ ادھوری ہے۔ وہ پورا ایک تاباں عہد تھے جو نامور بھی رہا اور بدنام بھی ہوا۔ انور سدید، ناصر عباس نیئر، غلام جیلانی اصغر، مناظر عاشق ہرگانوی، ایسے مداح تھے تو سلیم اختر (اردو کی مختصر ترین تاریخ) اور ساقی فاروقی (ہدایت نامہ شاعر) ایسے شدت پسند کٹر آغا جی مخالف بھی تھے۔ انشائیہ ایک علاحدہ طوفان باخیز کو اپنے جلو میں سمیٹے تھا۔ وزیر آغا نے خود کو اردو ادب کا اولین انشائیہ نگار کہا ہی تھا کہ سلیم اختر اور ان کے حواری خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ یار لوگ سر سید اور ان کے اجداد تک کو زبردستی گھسیٹ کر میدان میں لے آئے وہ بھی تھے جنھوں نے کبھی "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک"، "دوسرا کنارہ"، "سمندر اگر میرے اندر گرے" (انشائیوں کے مجموعے) کا ایک بھی انشائیہ پڑھا تک نہ تھا۔ اس ہنگامہ افکار کا اردو زبان و ادب کو بس یہی فائدہ ہوا کہ "انشائیہ کی بنیاد" مصنف از ڈاکٹر سلیم اختر اور "انشائیہ مصنف از ڈاکٹر انور سدید اسے مل گئیں۔ وزیر آغا نے ایک نیا امتزاجی تنقید کا نظریہ پیش کیا۔ جواب سرگودھا یونی ورسٹی میں باقاعدہ پڑھایا جا رہا ہے۔ "اردو شاعری کا مزاج" لکھ کر وزیر آغا نے اردو زبان و ادب کی پیدائش اور ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا "تخلیقی عمل" میں انھوں نے وقت تخلیق یک رجحانات پر بحث کی پر دوستوں نے اسے عقل کی نقل کہہ کر کیا سے کیا ڈرامے رچائے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت پر لکھا اور "ساختیات اور سائنس" جیسے جدید موضوعات پر کتاب لکھ ڈالی۔ وزیر آغا کو ہندی اساطیر پر عبور حاصل تھا۔ شاید اسی لیے اس کا بھرپور اظہار ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کا بچپن ہے جو ہندوؤں کے درمیان گزرا۔ اس کی پوری تفصیل انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" میں لکھی ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ان کے ہاں علامت نشان بنتی ہے اور نہ کلیشے ان کی نظموں میں بڑی تعداد میں فطرت سے متعلقہ موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ نیز روحانی موضوعات، مادی دنیا میں کھلتے انسان کا دکھ، صوفیانہ موضوعات، مقامی کلچر ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ آدھی صدی کے بعد، نروینس، الاؤ، اندر کے رونے کی آواز، اک کتھا انوکھی ان کی شاندار نظموں میں سے ہیں۔ ان کی نظموں کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں جرمن، مالٹیز، جاپانی، انگریزی، مراٹھی، ہندی، یوگوسلاوی، ہسپانوی، یونانی، سویڈش، سرائیکی اور پنجابی میں ہو چکے ہیں۔ احمد ندیم

قاسمی کی رائے میں" وزیر آغا نے داخلیت اور خارجیت، روح اور مادہ، وجدان اور شعور کو جس انداز میں اپنی شاعری میں سمیٹا ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ شعر کہتے ہیں تو ان کی بصیرت اور بصارت دونوں بیدار اور یک بیک مصروف کار ہو جاتی ہیں۔" عارف عبدالمتین کے مطابق "وزیر آغا اردو کے علامت پسند شعراء کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں اور بقول مجید امجد وزیر آغا کی نظموں کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کو یا شعر ایک ایسی لطیف علامت ہے جو ایک زندہ استعارے سے ابھرتی ہے"۔" چنک انھی لفظوں کی چھاگل" کے عنوان سے ان کی نظموں اور غزلوں کے دو الگ الگ کلیات چھپ گئے ہیں۔ پاکستان اور انڈیا میں ان پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔

غلام جیلانی اصغر مرحوم سے ان کی بے تکلفی حد درجہ تھی جہاں دونوں احباب اکٹھے ہو جاتے محفل گل و گلزار بن جاتی۔ اصغر مرحوم خود اعلیٰ پایہ کے شاعر اور انشائیہ نگار تھے بے ساختہ اشعار یاد آ گئے قارئین کو بھی اس لذت میں شامل کرنا چاہوں گا۔

تمہارے ہاتھ کی پوروں سے چھو گیا ہوگا
کہ اپنا خون جگر بھی حنا سا لگتا ہے

ہم نے ہنس ہنس کے بھرم اہل وفا کا رکھا
ہم بھی رو دیتے اگر عشق میں جھوٹے ہوتے

ابھی مجھے اک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
اک مسافت ختم ہوئی ہے، اک سفر ابھی کرنا ہے

ابھی سے ترک تعلق کا تم نے سوچ لیا
یہ مرحلہ تو کہیں راستے میں آنا تھا

وزیر آغا نے اپنی خودنوشت سوانح عمری" شام کی منڈیر سے" کا انتساب پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے نام کرتے ہوئے یہ شعر لکھا۔

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

ڈاکٹر وزیر آغا نے ایم اے اکنامکس کیا اور پی ایچ ڈی" اردو ادب میں طنز و مزاح" کے عنوان کے تحت کی اور پھر وہ ہمیشہ اردو ادب کے ہو گئے۔ انھوں نے اپنی اولین نظم" دھرتی کی آواز" نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے شاہد احمد دہلوی کے رسالہ" ساقی" کو ارسال کی جو نہ صرف" ساقی" میں چھپی بلکہ قیوم نظر نے اس نظم کو ۱۹۴۶ء کی بہترین نظموں کے انتخاب میں جگہ دی۔ نظم یہ تھی۔

بادلو! دھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اک ردا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو مرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جرم، فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ، اتر آؤ میری دنیا پر

۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو سفر اختیار کرنے والے ڈاکٹر وزیر آغا ۲۷ رمضان المبارک، ۷ ستمبر ۲۰۱۰ء کو رات ۳۰:۱۱ بجے غروب ہو گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور محققین کو نیز ناقدین کو ان کا صحیح مقام و مرتبہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

خرم ثوانہ کا مضمون کا بقیہ حصہ

اس ملاقات کی اہم بات جو آغا صاحب کی ذات کے حوالے سے آج بھی یاد ہے کہ جب باتوں میں توقف آیا تو میری طرف متوجہ ہو کر میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ذرا اس مقالے کو بھی دیکھ لیجئے۔ شاید آپ کو کچھ فائدہ ہو۔ مزید بتایا کہ یہ ایم فل کا مقالہ ہے جو اقبالیات کے موضوع پر انگریزی میں ہے اس پر ایم فل کی ڈگری جاری ہو چکی ہے اور اب میرے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں جائزہ لے کر بتاؤں کہ اقبالیات پر ہونے والے تحقیقی کام کے حوالے سے یہ انعام کا حقدار ہے کہ نہیں..... یقیناً اس سطح کے فیصلے کے لیے ایسی ہی بلند شخصیت موزوں تھی۔ میں نے اس مقالہ کو کیا دیکھنا تھا کہ جب میرے تخیل سے اس کا نظارہ فزوں تر تھا۔ چنانچہ سرخ جلد کے اس مقالہ کو محض الٹ پلٹ کر دیکھ لیا اب جانچنا ڈاکٹر صاحب نے تھا۔ شام ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں عصر سے مغرب تک کا وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی رفاقت میں اس وقت کے گزرنے کا احساس نہایت معمولی تھا۔ آغا صاحب کی محفل ابھی جمی تھی لیکن مجھے کہیں جانا تھا سو ڈاکٹر صاحب کا بھرپور شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی انھوں نے محبت سے رخصت کیا اور میں سلام کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا کی دو نظمیں

آنکھ صدف بن جاتی ہے!

آواز کی کوری دھرتی پر
جب حرف کے بیج بکھرتے ہیں
اور لفظ کے پودے اُگتے ہیں
جب لفظ کی نازک شاخوں سے
کلیوں کی پو نکلتی ہے
پھولوں میں ڈھلنے لگتی ہے
جب نرم اشارے پھولوں کے
تشبیہیں بننے لگتے ہیں
تمثیلیں بننے لگتے ہیں
جب وقت کا اندر پھٹتا ہے
تاروں کے بیج بکھرتے ہیں
اور چاروں جانب اڑتے ہیں
تب...... آنکھ صدف بن جاتی ہے
اور خواب ہمکنے لگتے ہیں!

☆☆☆☆

ہیروئن

سانپ اور سپیرے کا
گھر کہیں نہیں ہوتا
دونوں ہی پیادہ پا
دونوں ہی مسافر ہیں
کینچلی ہے پہلے کی
گودڑی ہے دوجے کی
دوستی ہے عمروں کی
زہر کا یہ کاروبار
مل کے دونوں کرتے ہیں
ایک ڈس بناتا ہے
دوسرا محلوں میں
جا کے بیچ آتا ہے

ایک عہد ساز شخصیت ڈاکٹر وزیر آغا

پروفیسر ارشد جبار پراچہ

ایگزیکٹو ایڈمنسٹریٹر، دی سکالرز کالج بھلوال 0345-4999191

کسی بڑے انسان کا ذکر کرنا اور اسے خراج تحسین پیش کرنا قطعاً کوئی سہل بات نہیں ہے کیونکہ یہ عمل دریا کو کوزے میں سمیٹنے اور نشیب میں کھڑے ہو کر ہمالہ کی فلک بوس چوٹیوں کو دیکھنے کی مانند ہے۔ اجازت ہو تو میں کہہ دوں کہ زندگی دراصل ایک تتلی کا سفر ہے۔ کائنات رنگ و بو میں کھلے ان گنت خوشنما، خوش رنگ اور مہکتے پھولوں کے تعاقب میں سالوں کا سفر خارجی اور داخلی کیفیات کا تضاد لیے ادراک و آگہی کی منزلوں کی طرف رواں رکھ کر انسان کو تجربات اور مشاہدات کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ کبھی زندگی دیوانے کا خواب لگتی ہے تو کبھی حقائق کی جستجو، کہیں مصائب و حوادث سے عبارت دکھائی دیتی ہے۔ تو کہیں لذت آفرینی کی چاشنی سے لبریز، خالق ہمیں زندگی دے کر بھیجتا ہے اور ہم زندگی کرنے کی سعی میں اسے گزار دیتے ہیں مگر زندگی کرنا محال ہے۔ اس آبلہ پا مسافت میں فکر کی چڑیاں جب سر شام چہچہانے پر بضد ہو جاتی ہیں تو سود و زیاں کا میزان ایک نئے حیرت کدے کا در وا کر دیتا ہے۔ یہ حیرت اگر اظہار کا ہنر پالے تو پھر بامعنی، پرفکر اور بصیرت انگیز تخلیقات اپنے وجود کی سند تھامے اہل جہاں پر منکشف ہو کر رہتی ہیں۔ مجھے برملا یہ کہنا ہے کہ وزیر کوٹ کے باسی جناب وزیر آغا نے زندگی کے حیرت کدے سے جھانک کر اظہار کے ہنر کو حرفوں اور لفظوں پر آزمایا تو ان کی سوچ، ان کا بیان، اور ان کی تحریر سماعت اور بینائی سے خراج کے حقدار ٹھہرے۔ انسانوں کی یہی ضرورت سماج میں ادب کے پنپنے اور تہذیبوں کے جنم کی وجہ بنتی ہے۔ آج ہمارا یکجا ہو کر اس مجلس میں بیٹھنا اس امر کی گواہی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا محض ایک فرد، ایک انسان یا ایک شاعر و ادیب نہ تھے بلکہ ایک Institution، ایک تہذیبی مرکز اور تربیت گاہ تھے جن کے ہاں سے ان گنت تشنگان نے کسب فیض پایا۔

شاعری خواہ کسی بھی صنف سے متعلق ہو حساس جذبوں، شکستہ آرزوؤں، مچلتی امنگوں اور تجربات و مشاہدات سے لبریز اس دھارے کا نام ہے جسے تسلیم کی ضد درکار نہیں ہوتی بلکہ شاعر اور قلم کار اپنی راہیں اپنی نگاہوں سے تراشتا ہے اور روانی کو شعار بنا کر اپنی منزل کا تعین بھی خود ہی کرتا ہے۔ جناب وزیر آغا کا جنم ایک خوشحال گھرانے میں ہوا مگر انھوں نے ایک بے فکر نوجوان کی طرح زندگی گزارنے کی بجائے ایک تحریک بننے کو ترجیح دی۔ بلاشبہ اس امر میں ان کے تصوف سے لبریز فکر رکھنے والے والد گرامی کی تربیت کا بھی ایک اہم کردار ہے لیکن آغا جی نے زندگی کے صحرا میں جس مسافت کو قدموں سے باندھ لیا یہ ان کی ذات کا وہ وصف ہے جس کے سبب انھوں نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ دنیا بھر میں ایک مقام پایا اور ان کے عقیدت مند ملکوں ملکوں قریہ قریہ پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ دراصل آغا جی کو خالق نے ایسی روح عطا کی تھی جس نے تتلی کے پر تانک کر خوشبو کی تلاش میں، رنگوں کا کھوج لگانے اور آبشاروں کے گیت سننے کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ انھوں نے بے شک نازک جذبوں، ابھرتی صبحوں، امڈتی شاموں اور ڈھلتی راتوں کے باطن میں جھانکنے کا اذن چاہا تو وہ درختوں، دریاؤں، ندی، نالوں، خنک ہواؤں، کھلتے پھولوں اور مچلتے جذبوں سے ہمکلام ہوئے۔ انھوں نے بکھرے زاویے الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر پالیا۔ یہ سکت ہر ایک کو کہاں عطا ہوتی ہے۔ اس دولت سے ہر کوئی کہاں مالا مال ہوتا ہے لیکن ان کا قد اس وصف نے اور بڑا کر دیا کہ عطا کا فیض پا کر انھوں نے بنیئے جیسی منفعت سازی نہیں اپنائی بلکہ اپنے تجربہ، مشاہدہ اور ادراک کے موتی اس دریا دلی سے دوسروں میں بانٹ دیئے جیسے بے نیاز ابھرتی صبح شبنم کے قطرے بغیر کسی تعصب کے نچھاور کر ڈالتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ ایک بڑے انسان تھے ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۷ء میں وزیر کوٹ میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ میں مرحوم پروفیسر محمد سلیم بھٹی اور جناب اصغر شاہی کے ہمراہ ان کے پاس حاضر ہوا۔ مقصود مدعا بھلوال میں منعقد ہونے والے کل پاکستان مشاعرہ کی صدارت کے لیے استدعا کرنا تھا۔ جس خندہ پیشانی، مروت اور تپاک سے ملے اس کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ خوب تواضع کی اپنی ذاتی لائبریری اور آرام گاہ میں لے کے گئے۔ اپنے باغ کے تازہ کنو مرحمت فرمائے اور تقریب کی صدارت کے لیے آمادگی سے نوازا۔ ان سے مل کر یہ بھید کھلا کہ ان کی ذات میں تصنع، بناوٹ ریاکاری، نمود و نمائش اور اپنی دھاک بٹھانے جیسی کوئی کمزوری جگہ نہیں پا سکی۔ براق چہرہ، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی اور متبسم لہجہ ان کے خوبصورت سراپا کا ایسا اظہار تھا تو جو میرے جیسے کم فہم کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت، ان کے فن اور ان کی تخلیقات پر بات کرنے کے لیے زندگی درکار ہے یہ کار محال منٹوں، گھنٹوں یا دنوں ہفتوں میں کہاں ہو پائے گا لیکن مجھے تو اس مختصر سے بیان میں اس تفاخر سے سرفراز ہونا ہے کہ ہم بھی ان سے فیض پانے والوں میں ہیں۔ ان کا ذکر کرنے والوں میں ہیں۔

دُنیا میں کم لوگ ہوں گے جو اس قدر ہمہ صفت ہوں جس طرح ڈاکٹر وزیر آغا تھے ان کی نظم، ان کی غزل، ان کا انشائیہ، ان کی تنقید، ان کی تحقیق، ان کا سفرنامہ، ان کی ادارت، ان کی گفتگو، ان کی شگفتہ مزاجی مختصر یہ کہ ان کی تہ در تہ شخصیت کی کس قدر پرتیں ہیں شمار کرنا ہرگز سہل نہیں۔ میری عقل نارسا میں یہ سکت کہاں کہ اتنے قد آور شاعر، اس قدر بالغ نظر دانشور، اتنے نکتہ ور، پرفکر فلسفی، اتنے بلند قامت ادیب غرضیکہ اتنے عظیم انسان اور انسان دوست مہربان کی ذات کے گنبد میں جھانک کر کچھ اور کہہ پاؤں۔ مجھ جیسے تہی دامن دراصل اس جستجو سے اپنی پہچان اور شناخت کے متقاضی ہوتے ہیں ورنہ کہاں پتنگا اور کہاں طواف شمع.......... فراز نے کہا تھا:

بظاہر ایک ہی شب ہے فراق یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اور فیض نے کہا تھا:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا:

چلو اب اپنی جانب بھی چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سونا پڑا ہے

مزید کہتے ہیں

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

اور پھر یہ کہہ کر آرام کی نیند سو گئے کہ

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارہ بھی ہے جانے والا

سلیم آغا قزلباش کے عظیم والد گرامی اور ہزاروں لاکھوں محبت و عقیدت رکھنے والے پرستاروں کے ڈاکٹر وزیر آغا کو سلام جنھوں نے مہد سے لحد تک لفظوں کی مالا پروئی، سلام ہو میرا عقیدت بھرا سلام کہ

اک بار ہم نے پار کیا چپ کا ریگزار
پھر عمر بھر اٹے رہے لفظوں کی دھول میں
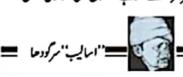
ڈاکٹر وزیر آغا کچھ یادیں۔ کچھ تاثرات

خرم ٹوانہ
لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ کالج بھاگٹانوالہ
0321-6019497

ڈاکٹر وزیر آغا بھی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت تھے جن کے دم سے جہاں کی کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ رونقیں وابستہ تھیں۔ایک شاعر، ایک نقاد، ایک محقق، ایک انشائیہ نگار ایک عمدہ شخصیت یہ سب ڈاکٹر صاحب کے کمالات ہیں جن سے دنیا واقف بھی ہے اور معترف بھی......ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آغا صاحب ادیب گر بھی تھے ان کی بزم سے بوئے، نالۂ دل اور دود چراغ محفل سبھی تربیت یافتہ ہو کر نکلے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے میری پہلی ملاقات ۲۰۰۳ء میں ان کی ادبی قیام گاہ واقع ریلوے اور سرگودھا پر ہوئی اور مجھے اس ملاقات کا تعلق ہمیشہ یاد رہے گا کہ یہ ملاقات پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اس کے بعد اکثر سوچتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہونی چاہیے مگر یہ سوچ ارادے سے بڑھ کر عمل کا روپ نہ دھار سکی۔ایک آدھ بار مصمم ارادہ بھی کیا مگر جب ڈاکٹر صاحب نے خرابی صحت کے باعث سرگودھا آنا جانا موقوف کیا ہوا تھا سوان کی ریلوے روڈ کی کوٹھی کے آگے سے گزر کر اس ملاقات کی بازیافت کر لی جو ان سے محض ایک بار ہی ہوئی تھی مگر یہ اتنی پراثر رہی کہ آج تک اس کا نقش یادوں کے ورق پر قائم ہے ۲۰۰۳ء میں یونی ورسٹی آف سرگودھا سے ایم اے اردو کے تحقیقی مقالہ "مجلہ کامران کا اشاریہ" پر ڈاکٹر سجاد حسین شیرازی مرحوم کی زیر نگرانی کام کر رہا تھا یہ سرگودھا کا ادبی جریدہ تھا جس کو بہت سے یگانہ روزگار ادیب اپنی نگارشات سے کامیاب بنائے ہوئے تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا بھی "کامران" کے مستقل لکھاری تھے اسی مناسبت سے ان سے ملنا ضروری ٹھہرا۔ بذریعہ فون ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت لیا فون پر ہی ایک اجنبی اور نو آموز محقق سے جس شفقت اور خلوص سے پیش آئے اس نے کام کرنے اور اتنی بڑی شخصیت سے ملاقات کرنے کا بھرپور حوصلہ فراہم کیا۔اگلے دن ۴ بجے سہ پہر ملاقات کا وقت طے ہوا۔عام حالات میں وقت کی پابندی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس دن میں نے کوشش نہیں بلکہ عمل کیا کیونکہ ملاقات جس شخصیت سے تھے اس نے پابندی کا احساس دونا کر دیا۔مقررہ وقت پر میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔جھجکتا ہوا کوٹھی کے بڑے گیٹ سے داخل ہوا۔ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کدھر کو جاؤں میں کہ ایک ملازم میری طرف آتا دکھائی دیا۔قریب آ کر اس نے ادب سے میری آمد کا مقصد پوچھا میں نے اپنا نام اور یہ بتایا کہ آغا صاحب نے ۴ بجے آنے کا کہا تھا ملازم کے انداز تخاطب سے بھی ڈاکٹر صاحب کی محبت کا فیضان جھلک رہا تھا۔ملازم نے مجھے لے جا کر برآمدے میں سلیقے سے بڑی کرسیوں پر بٹھایا اور خود برآمدے کے ساتھ والے بیرونی کمرے میں ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینے کے لیے داخل ہو گیا۔کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔تھوڑی دیر بعد مجھے اذن حاضری ملا۔کمرے میں داخل ہوا تو بائیں ہاتھ آغا صاحب شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے کرسی پر بیٹھے تھے سامنے ایک میز پڑا تھا جس پر کچھ کتابیں پڑی تھیں اور اس کے ساتھ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا درمیانی میز کی دوسری طرف دو اور افراد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔میں نے سلام کیا اور ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا انھوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور ساتھ پڑی کرسی پر تشریف رکھنے کو کہا۔میں باقی دو افراد سے ہاتھ ملانے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ایک لمحہ کے لیے خاموشی نے کمرے کی فضا کو ڈھانپ لیا۔آخر آغا صاحب نے اس سکوت کو توڑا اور مجھ سے حال دریافت کیا اس کے بعد میرے نگران کی بابت بات چل نکلی۔آغا صاحب نے ہی یہ انکشاف کیا کہ میرے نگران ڈاکٹر سجاد حسین شیرازی مرحوم کی پی ایچ ڈی کا مقالہ جانچ پڑتال کے لیے یونی ورسٹی نے آغا صاحب کے پاس ہی بھیجا تھا گویا آپ استادوں کے استاد تھے۔ڈاکٹر صاحب نے "مجلہ کامران" کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلہ میں اب تک کی جانے والی جستجو اور تحقیق سے انھیں آگاہ کیا اور عرض کی کہ مجھے "کامران" کے کچھ شمارے نہیں مل رہے چونکہ آپ "کامران" سے بطور ادیب منسلک رہے ہیں تو اس مناسبت سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ کے پاس بھی "کامران" کے شمارے آتے رہے ہوں گے اس کے جواب میں انھوں نے وضاحت کی کہ "کامران" کے سب شمارے میرے پاس نہیں تھے البتہ کل میں نے تلاش کیا تو جو کچھ ملا وہ موجود ہے اور ساتھ ہی میز پر رکھی ایک موٹی سی اور پرانی مجلد کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے دیکھنے کو کہا "کامران" کے مختلف شماروں کو ایک جلد میں اکٹھا کیا ہوا تھا جو پہلی نظر میں دیکھنے پر کوئی کتاب معلوم پڑتی تھی۔میز پر پہلے سے "کامران" کی موجودگی نے مجھے بے حد متاثر کیا میں اپنے طور پر توقع کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اٹھیں گے مجھے ساتھ لے جائیں گے اور اپنی ذاتی لائبریری کی کسی دبنگ الماری کے سامنے کھڑا کر کے کہیں گے کہ میاں یہ سب رسائل پڑے ہیں۔آپ اس بحر میں غوطہ زن ہو کر گوہر مراد نکالنا بحیثیت محقق تمہارا کام ہے۔مگر آفرین ہے آغا صاحب کی ہمت و عظمت کو، اس عمر اور برتری کے باوجود انھوں نے ایک دن پہلے اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے "کامران" سے متعلقہ تمام دستیاب مواد نکال کر حاضر کر لیا تا کہ ایک نو وارد کو تلاش کی زحمت سے بچایا جا سکے۔جو بڑے ہوتے ہیں یقیناً ان کے ظرف بھی بڑے ہوتے ہیں

میں شماروں کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب دیگر دو اصحاب سے گفتگو کرنے لگے۔گفتگو کا موضوع ان کی لاہور میں مصروفیات اور ادبی دلچسپیاں تھیں۔ شماروں کے سرورق دیکھنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ میرا مطلوبہ مواد نہیں ہے میں نے اسے میز پر رکھ دیا ڈاکٹر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ سب کچھ میرے پاس پہلے سے موجود ہے۔اسی دوران ان کا ملازم چائے کی ٹرے اٹھائے داخل ہوا۔باقی دو افراد پہلے سے چائے پی رہے تھے۔میں نے اس دوران نہیں دیکھا تھا کہ آغا صاحب نے ملازم کو بلایا ہو یا اشارہ کیا ہو کہ چائے لے آئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ان کے گھر کی ہر چیز اور فرد ایک سلیقے سے خودکار نظام کے تحت چل رہے تھے کسی کی آمد پر ملازم کا خود بخود چائے لے آنا اس بات کی علامت تھا کہ رکھ رکھاؤ اور خاطر تواضع اس کوٹھی کی پرانی ریت ہے۔چائے چینی کی پرچ پیالی میں تھی۔چینی ڈالنے کے لیے الگ سے چینی دان اور پرچ میں چمچ موجود تھا اور لطف بڑھانے کے لیے بسکٹ کی پلیٹ حاضر تھی۔

اسی دوران گفتگو کا موضوع دیہات اور زمینداری کی طرف مڑ گیا میں اس محفل میں زیادہ تر سامع کا کردار ادا کر رہا تھا۔میرے لیے تو آغا صاحب کے ساتھ بیٹھنا ہی ایک اعزاز تھا اور پھر جس محبت اور احترام سے مجھے نوازا گیا اس نے مزید لب ہلانے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی اسی نشست سے مجھے اس بات کا علم بھی ہوا کہ آغا صاحب نے ۱۹۶۰ء میں سرگودھا میں پہلی بار کنو کی کاشت کا تجربہ کیا۔انھوں نے بتایا کہ کنو کا بیج کیلیفورنیا میں بنا اور سرگودھا میں اسے پہلی بار میں لایا اور اپنی زمینوں پر اسے کاشت کیا۔

بقیہ صفحہ 44 پر ملاحظہ کریں

آغا جی......ایک مکمل باب!!

سیّد تحسین گیلانی (ساؤتھ آفریقہ)
0027844550342

کون کہتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ہم میں نہیں رہے۔ ارے وہ تو اپنی تحریروں کی صورت میں ہمارے دل و دماغ میں سرایت کر چکے ہیں...... اگر کوئی 'اصل' قاری انہیں میسر آ جائے (جیسا کہ بہت کم ہوا ہے) تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شخص تب تک واپس لوٹ آئے جب تک وہ 'خود' سے 'خود' تک کا سفر طے نہ کر لے...... یہی ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سوں کو اپنا ہی بھیانک چہرہ جب جب نظر آیا (انہیں پڑھنے کے بعد) تب تب ان کے خلاف علم بلند ہوا۔

نہ صرف ان کی تخلیقات بلکہ ان کی شخصیت میں بھی ایسا جادو میں نے پایا کہ جب جب میں ان سے ملا مجھے یوں لگا جیسے میں کسی صوفی یا ولی کی درگاہ سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ علم نے ان کے گرد ایک ایسا جادوئی حصار قائم کر دیا تھا کہ وہ سرتاپا محبت تھے۔ جب بھی مجھے ان کی ضرورت پڑی، چاہے خطوط کے ذریعے ہو یا ٹیلیفون پر ہمیشہ انہوں نے میری رہنمائی کی۔ انشائیہ اور نظم کو سمجھنے میں انہوں نے میری بہت مدد کی، ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کہا تم اچھا انشائیہ لکھتے ہو، اس لئے میں تمہیں مشورہ دوں گا تم غزل کی بجائے نظم پر توجہ دو۔ نظم کو تم جیسوں کی ضرورت ہے بعد ازاں جب میں نے اس بات پر سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے خمیر میں ہے ہی نظم ...... یہ ان کی عمیق نظری تھی۔ پھر جب انہوں نے مختلف رسائل میں میرے تنقیدی خطوط پڑھے تو مجھے تنقید کی جانب آنے کی ترغیب دی ان کی حوصلہ افزائی پر میں اس میدان میں بھی کود پڑا...... ان کی تخلیقات چاہے نظم ہو غزل ہو یا انشائیہ انہوں نے ہمیشہ 'انسان' کی بات کی ہے...... اس ضمن میں بہترین مثال ان کا انشائیہ "حقہ پینا" ان کی نظمیں "نشتر گاہ" اور "اور اب سنا ہے" میری نظر میں خاص طور پر انسان اور زندگی پر عمدہ نظمیں ہیں۔

اسی طرح جب تنقید میں سلسلہ نئی تنقید سے شروع ہوتا ہوا ساختیات، مابعد جدیدیت تک جا پہنچا تو آپ نے امتزاجی تنقید کو متعارف کروایا۔ اس سے پہلے جب انہوں نے مضمون "سٹرکچر اور اینٹی سٹرکچر" لکھا تو اس نے بھی تنقید نگاروں کو متوجہ کیا۔ یہاں بھی آپ نے انسان کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"انسان کی فطرت میں یہ بات ودیعت ہے کہ وہ نہ صرف مظاہر کے اندر میں "ساخت" تلاش کرتا ہے بلکہ ہر ساخت کے عقب میں ایک اور ساخت دریافت کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اس آخری ساخت یعنی "اینٹی ساخت" پر پہنچ کر رک جاتا ہے جو ساری ساختیاتی ہائیر آرکی کا منبع اور مصدر ہے"۔

یونہی دریدا نے جب 'معنی کے التوا' کی بات کی تو آپ نے ایک مقالے بعنوان "اکتشافی تنقید" جواباً لکھا:

"...... بے شک معنی کی سطح پر یہ بات درست ہے کہ معنیاتی توسیع ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتی لیکن "احساس" کی سطحوں کی کوئی حد نہیں۔ ہر قاری (یہاں بھی قاری کی حمایت بلاشبہ انسان کی ہی حمایت ہے جس کی تذلیل میں دریدا نے کوئی کمی نہیں چھوڑی) اپنے احساس کے آئینے میں جب متن کو دیکھتا ہے تو متن کو منقلب کرتا ہے۔ گویا اس کی معنویت میں تازگی اور بوقلمونی کا اضافہ کر کے اس سے جمالیاتی حظ کی تحصیل کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی اچھا شعر ایک مخصوص تشریحاتی عمل کے نتیجے میں محض ایک متعین معنی کا حامل بن کر رہ جاتا...... ایک ایسا معنی جو آئندہ نسلوں کو میکانگی انداز میں منتقل ہوتا رہتا!!"

اب وہ ہم میں نہیں مگر وہ اپنی لکھت میں زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے...... سلیم آغا قزلباش سے میری بات ہوئی تو انہوں نے یہی بات کہی کہ:

"خدارا! ان کے تحقیقی، علمی اور تنقیدی کام کو ایک بار تعصب کی عینک اتار کر پڑھا جائے...... خدارا......!!

(ڈاکٹر وزیر آغا کی نذر)

وہ دیکھو... وہاں ہے!!
بے خود فضا میں
ہیں لیے خوشی میں
بے حرفوں کا ماتم
کیا وہ "مکاں" ہے
تو معنی و تخلیق بے نور سائے..
کہ اب... متن... گنگ......!!
اور رنگ بے رنگ جیسے ہوا ہے...
اور آج 'دال اور مدلول'
یہ کیا....؟؟
یہ بے نشاں کیوں؟
علامت، غزل، نظم
اور آج انشائیہ، Ego بھی
بین کرتے ہیں... ماتم ہے ماتم، بے سطروں کا ماتم...!!

شگفتہ وہ پوریں
وہ کومل سا لہجہ
وہ اسلوب والا
وہ سب سے نرالا ...... وہ دیکھو وہاں ہے!؟
یہ دیکھو یہاں ہے!؟
وہ لیکن کہاں ہے؟؟
سمندر کہ جس کے اندر... کہاں ہے؟؟
جو معنی کا بہتا جہاں ہے......!!

☆☆☆☆☆

seema Gupta (india)

Brief Introduction Dr. Wazir Agha

Kehne ko chand gam tha ye arsa-e-hayat
lekin tamam umr hi chalna para mujhe

Dr. Wazir Agha one of the famous well known Pakistani writer, poet, essayist and Urdu critic was born in Pakistan on 18-05-1922 in a Village Wazir Kot in Sargodha district, and died in the age of 88 year on 27th of Ramzan, September 7, 2010 in Lahore.

In 1948 his poems were published in Maulana Salahuddin Ahmad's then famous literary magazine 'Adabi Duniya. . In 1953, his work on "In search of happiness" opened a formal paradigm of research in Urdu literature. For his research on humor and satire in Urdu Literature in 1956 he was awarded the degree of doctorate by the University of Punjab.

From 1960 to 1963, he was acting co-editor of "Adbi Dunia" and from 1965 and onwards, he worked as editor of monthly "Auraq" for decades. In his literary carrier he wrote around 60 books on various topics, which includes criticism, , humor, poetry, literary and many more. Most of his poetry was based on elementary stories. His contribution towards establishment of Urdu Inshaiya is commendable and he was like a pillar of Urdu literature.

Dr Wazir Agha is a very famous name in Urdu critic where his most famous Urdu works are: Adab Mein Tanz-o-Mazah (1958), Urdu Shairi Ka Mizaaj (1965), Takhleequi Amal (1970), Tasawuraat-e- Ishq-o-Khird - Iqbal Ki Nazar Mein (1977), Majeed Amjad Ki Dastaan-e -Muhabbat(1991) and Ghalib Ka Zauq-e-Tamasha (1997).
He also wrote an autobiography Shaam Ki Mundair Sey Few of his best known essays are Nazm-e-Jadeed Ki Karwatein (1963), Tanqeed Aur Ehtesaab (1968), Naye Maqaalaat (1972), Naye Tanaazur (1979), Máni Aur Tanaazur (1998), Tanqeed Aur Majlisi Tanqeed (1975), Daairey Aur Lakirein (1986), Tanqeed Aur Jadeed Urdu Tanqeed (1989),Inshaiye Kei Khad-o-Khaal (1990), Saakhtiat Aur Science (1991), Dastak Us Darwaazey Par (1994) and Imtizaji Tanqeed Ka Scienci Aur Fikri Tanaazur (2006) , which are well appreciated in litrary world.

One of his best poetry which I like most.

Heroin

Snake And its charmer
Never have a home
Both tread their path
On foot
Both are travellers
One has its (cast off) skin
The other has the mendicant wrap
Life-long companions
Poison dealers
They 're partners in trade
One makes the poison
The other sells it
On the street!

☆☆☆☆☆

فکری جہات

وزیر آغا کی نظموں کا فکری پس منظر

ڈاکٹر رشید امجد

چیئرمین شعبہ اردو انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی اسلام آباد

وزیر آغا کی نظموں کی فنی بنت کاری اور فلسفیانہ عمل کو سمجھنے کے لیے ان کے تصورِ فن اور ثقافتی شعور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ "اردو شاعری کا مزاج" میں وہ کہتے ہیں:

"کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں اس زبان اور اس کی شاعری نے جنم لیا ہے لیکن یہ پس منظر کسی سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح کو پیش نہیں کرتا بلکہ دو مختلف سطحوں کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کی پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا ایک آئینہ ہے، یعنی یہ سطح دھرتی کے اصل باشندوں اور باہر سے آنے والے قبائل کی باہمی آویزش سے اپنے لیے ایک خاص رنگ مستعار لیتی ہے۔ دوسری سطح داخلی اور تہذیبی تصادم کا اجاگر کرتی ہے اور زمین کے اوصاف کے علاوہ آسمان کے اوصاف کو بھی پیش کرتی ہے۔ ان دونوں سطحوں کے امتزاج ہی سے کسی ملک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو اس زبان اور شاعری پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے۔"

اپنے اس تخلیقی فکری نظام کا اظہار انھوں نے تخلیق اور تنقید دونوں طریقوں سے کیا ہے اس لیے ان کی ساری تحریریں چاہے وہ تخلیقی ہوں یا تنقیدی اسی فکری نظام کے تسلسل کی صورتیں ہیں۔ وزیر آغا کا بنیادی موضوع تو انسان ہی ہے لیکن ان کا مطالعۂ انسان جسم کی ضروریات تک محدود نہیں بلکہ وہ انسانی تخلیق کے اسرار کو سمجھنا چاہتے ہیں اور شعور کے اس سفر کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جو انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کے چھپے ہوئے گوشوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ الجھا ہوا تخلیقی عمل، انسان کے وجود اور اس کے آرٹ کی مختلف شکلوں کے ظہور کی دلیل ہے۔

سمندر اگر میرے اندر گرے\
تو پایاب لہروں میں ڈھل کر سسکنے لگے\
پیاس کے بےنشاں دشت میں\
ڈنبل مچھلی کی صورت تڑپنے لگے\
بار پونوں سے، نیزوں سے چھلنی بدن پر\
دہکتی ہوئی ریت کے تیز چرکے سہے\
اور پھر ریت پر جھاگ کے کچھ نشاں چھوڑ کر\
تا ابد سر بریدہ سے ساحل کے سائے میں\
"ہونے نہ ہونے" کی میٹھی اذیت میں کھویا رہے

یہ "ہونے نہ ہونے" کی میٹھی اذیت بھی کیا ہے\
نگاہیں اٹھاؤں تو حدِ نظر تک\
ازل سے ابد کے ستونوں پہ باریک سا ایک خیمہ تنا ہے\
(نہ ہونے کا یہ روپ کتنا نیا ہے)\
اور خیمے کے اندر\
کروڑوں ستاروں کا میلہ لگا ہے\
(یہ ہونے کا بہروپ لاانتہا ہے)\
مرا جسم\
ریشم کا صد چاک خیمہ\
کسی بے کراں دشت میں بے سہارا کھڑا ہے\
مگر جب میں آنکھیں جھکاؤں\
تو اس سرد خیمے کے اندر\
کروڑوں تڑپتے ہوئے تندوروں کا دشت پھیلا ہوا ہے\
(یہ نہ ہونے کی میٹھی اذیت)\
عجب ماجرا ہے

(سمندر اگر میرے اندر گرے)

تخلیقِ آدم کے اسرار اور اظہار کے اس پیچیدہ عمل کو سمجھنے اور جاننے کے لیے وہ دو بنیادی مقامات کا تعین کرتے ہیں۔ ایک انسان کا باطن اور اس میں چھپی ہوئی دوسری ہستی کی پہچان اور دوسرے انسان کا خارج یعنی اس کا سماجی عمل جسے وہ ثقافتی اقدار کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان دونوں مقامات کے امتزاج میں اعتدال اور توازن وزیر آغا کی انفرادی پہچان ہے یعنی وہ نہ تو داخلیت پسندوں کی طرح باطنی سفر میں خارج کی نفی کرتے ہیں اور نہ خارجی مشاہدے میں باطن کو نظرانداز، بلکہ انھوں نے اس سارے عمل کو ایک ہی کل کے مختلف روپ تصور کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان سب انسان کے معاشرتی عمل کو اس کے جبلیاتی تقاضوں سے علیحدہ کر کے مسائل کو خانوں میں بانٹنے کا رویہ نہیں ہے۔ وہ انسان کو مکمل اکائی تسلیم کر کے متعلقات و مسائل کو ایک تخلیقی تسلسل میں دیکھتے ہیں۔

عجب روشنی تھی\
مہکتے ہوئے سبز باغات\
پنچھی\
کسانوں کے گھر\
کھیتیاں\
میرے دامن پہ\
گوٹے کناری کی صورت\
دمکتی تھیں\
میں ساری دھرتی کو\
سینگوں پہ اپنے اٹھائے\
کھڑا تھا

مرے دم سے\
گندم کے خوشوں میں دانے تھے\
اشجار بارِ ثمر سے جھکتے تھے\
سفیدی کے دھبے\
ہر گھاس میں پر رہے تھے\
میں ہل کی انی تھا\
درانتی کی کبڑی زبان تھا\
اُگاتا تھا میں\
خود ہی پھر کاٹتا تھا\
پرانی سی ایک بیل گاڑی میں پھر\
خود کو میں لادتا تھا\
سڑک بن کے\
شہروں کے پھولے ہوئے پیٹ تک\
رینگتا تھا\
رگوں میں لہو بن کے پھر\
دوڑتا تھا\
قلم کی انی\
مو قلم کی زبان سے\
لرزتی ہوئی انگلیوں کی کماں سے\
شبیہ اک بناتا تھا ایسی\
کہ جو اصل خندہ زن تھی\
میں دھاروں کا سنگم\
گلوں کی روانی تھا\
رنگوں کی سیال حدت میں\
بھیگا پڑا تھا (آدھی صدی کے بعد)

بنیادی بات یہ ہے کہ وزیر آغا کے یہاں فلسفیانہ عمل کے باوجود معاشرتی حقیقتوں سے رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔ ان کے افکار و نظریات میں سماجی اور ثقافتی عمل ایک زندہ شے ہیں۔ وہ انسانی عظمت کی تشکیل کو محض فکری یا خیالی سطح پر محسوس کرنے کی بجائے انسان کو ایک متحرک سماجی قوت تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں میں فکر اور خیال کی بلند پروازی کے باوجود زمین کی نفی نہیں ہوتی۔

صبح سویرے
ایک لرزتی، کانپتی سی آواز آتی ہے
سونے والو تم مالک کو بھول گئے ہو
تم، مالک کو بھول گئے ہو!!
پھر چیکیلی مل کا سائرن
ایک غلیظ، ڈرانے والی صدا کے روپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں کے
تنگ، اندھیرے باڑے میں کہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلے کو ہانک کر لے جاتا ہے
پھر انجن کی برہم سیٹی
صبح سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے
اور شب بھر کی تھکی ہوئی ایک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے
پھر یک دم اک سناٹا چھا جاتا ہے
اور میں گھڑی کی ظالم سوئیوں کی ٹک ٹک میں
دن کے زرد پہاڑ پر چڑھنے لگتا ہوں
(کوہ ندا)

ان کی نظمیں زمین پر انسانی المیوں کا کھوج لگانے کے عمل سے عبارت ہیں اور چھوٹے چھوٹے دکھوں کے ساتھ ساتھ عظیم انسانی المیوں کی داستان سناتی ہیں۔ یوں وہ اپنے قاری کو اس کی چھوٹی سی دنیا سے بلند کر کے وسیع لامحدود کائنات کے اندرون لے جاتی ہیں جہاں خواب اپنی مجرد صورتوں میں ایک مکمل اور عظیم اکائی میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ صورت دوہرے تخلیقی سفر کا اشاریہ ہے کہ وزیر آغا سماجی عمل کی قوت اور انسان پر اس کے گہرے اثرات کو جانتے ہیں لیکن خارجیت پسندوں کی طرح اسے حرفِ آخر ہی نہیں سمجھتے بلکہ انسان کے بطون اور اس کی جبلی اور فطری میلانات کو بھی ایک اہم اور موثر قوت خیال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سماجی عمل میں مبتلا انسان محض ایک مادی وجود بن کر صرف سانس کی سطح پر یا پھر سماجی حیوان کی سطح پر زندہ رہنے کی بجائے ایک داخلی روحانی اور کشفی تجربے کے نتیجہ میں ایسی اکائی بنتا ہے جس میں کائنات اور وجود کائنات اپنی تمام طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی صورتوں کے ساتھ متشکل ہو جاتی ہے یوں وزیر آغا کے یہاں ایک نیا شعری مابعد الطبیعاتی نظام جنم لیتا ہے۔

معاً
میں نے دیکھا
زمیں پر ہوا تھی
ہوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے
مگر سبز دھرتی کی
ٹھنڈی تہوں میں
جڑوں کی پراسرار وحدت تھی
سب فاصلے
ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے
ہزاروں جڑیں
ایک ہی جڑ سے پھوٹی تھیں
آگے بڑھی تھیں
مگر جڑ سے ایسی جڑی تھیں
کہ چلنے کے عالم میں
ٹھہری ہوئی تھیں
یہ ساری جڑیں
سبز دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں
جو خود اس کے گیلے بدن میں
اُترتی گئی ہیں

کہو کون تھا وہ؟
کہ جس نے کہا تھا
ستارے فقط پات ہیں
کہکشائیں
مجھے تو فقط
اپنے ہونے کا عرفاں ہے
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں
پروں کو ہلاتی
حسیں قوس بن کر
مری سمت آتی ہوئی
فاختہ
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
تیرگی کی گپھا سے نکلتا ہوا
روشنی کا جہاں
دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن
بھیگی پلکوں پہ دکھ کی چمکتی چبھن
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آب جو
اک انوکھے پراسرار معنی کے

گندھی نرم شاخیں ہیں
آکاش
اک سبز چھتنار
ہر شے پہ سایہ کناں ہے
مگر اس کی جڑ
اس کے اپنے بدن میں
نہیں ہے
کہو کون تھا وہ
کہ جس نے ہوا کی حسیں سرسراہٹ
لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا
مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز
اور خواہشوں کے تلاطم کو
دکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟
وہ جس نے
خود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو
اپنی جڑوں کو
فریبی، سیہ کار، جھوٹا کہا تھا
مرا اس سے
کوئی تعارف نہیں ہے
گھاؤ سے رستا لہو
مسکراتے ہوئے لب
یہ سب
میرے اوتار ہیں
میری آنکھیں ہیں
مجھ کو ہمیشہ تکتی رہی ہیں
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی !! (آدھی صدی کے بعد)

ہماری شاعری تصوف اور مابعد الطبیعاتی سوچ سے نہ صرف آشنا ہے بلکہ اپنی ایک مخصوص روایت بھی رکھتی ہے لیکن جدید عہد سے پہلے تصوف اور مابعد الطبیعاتی سوچ میں سماجی عمل کی نفی خود انسان کی نفی کے برابر تھی۔ سو نفیٔ ذات کا اعلان خود اپنی موت کا اعلان بن جاتا تھا۔ جدید عہد اثبات ذات کا عہد ہے اور وزیر آغا کے یہاں اثبات ذات کے معنی دوسری ہستی کے ادراک کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی شعور کی شمولیت سے ہی مکمل ہوتے ہیں۔ وہ انسانی المیوں کو ثقافتی المیوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتے کہ انسان اپنے تمام تر کشفی اور روحانی تجربوں کے باوجود اپنی زمینی حدود کا اسیر ہے۔

چلو ہم بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں
زمیں پر اترتی ہوئی برف کے سرد بوسوں سے خود کو بچائیں
نگاہوں میں وحشت، زباں پر کڑکتے ہوئے بول لائیں

گھنے دم بہ دم جلتے بجھتے ہوئے بادلوں سے گزر کر
ستاروں کے جھرمٹ کو ہاتھوں کی پوروں سے دونیم کر کے بڑھیں
برف کے اک تڑختے پگھلتے جہنم میں اتریں

سیاہی کے یخ بستہ مرقد پہ آنسو بہائیں
چٹانیں اگر کہنہ صدیوں کی گاڑھی، گھنی، گیلی بدبو میں
لتھڑی پڑی ہیں تو کیا ہے
اگر گھاس کی لاش کو برف کی ایک میلی رضائی نے
آنگن کو مردہ درختوں کی بھوبل نے ڈھانپا ہوا ہے تو کیا ہے
کہ ہم راکھ کے ڈھیر
گرتی ہوئی برف کے کیلے نرم گالے
کسیلی سی بدبو کے بھبکے نہیں ہیں
تجھے کیا خبر ہم
زمیں کی طرح بھوری مٹی کی اک کھال اوڑھے ہوئے ہیں
اگر ہاتھ ہم کو میسر نہیں تو کیا ہے
چلو اپنی پلکوں کے نیزوں سے اس بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں
چلو تیز شعلوں کے دوزخ میں اتریں
ابلتے ہوئے تند لاوے کی موجوں میں دھونی رمائیں
(بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں)

وزیر آغا نے اپنی نظموں میں اس روحانی اور وجدانی حاصل کو سماجی اور ثقافتی عمل سے مربوط کر کے ایک فکری جہت کا دروازہ وا کیا ہے اور اردو نظم کو نئی سوچ اور احساس کی لذت سے ہمکنار کیا ہے اور یہ فکری جہت اور نیا مابعد الطبیعاتی ذائقہ ان کی تمام نظموں میں محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ "شام اور سائے"، "دن کا زرد پہاڑ"، "نردبان"، اور "آدھی صدی کے بعد" ان کے اپنے شعری سفر ہی کے نہیں بلکہ جدید اردو نظم کی ارتقائی رفتار اور متوازن رویے کے اشارے بھی ہیں۔ پچھلے بیس برسوں میں جدید اردو نظم جس تجرباتی افراط و تفریط کا شکار رہی ہے اس نے نظم کو ایک تجربہ گاہ تو ضرور بنایا ہے لیکن معیار کے معاملہ کو خاصا مشکل کر دیا ہے۔

وزیر آغا ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس انتہا پسندی میں جدیدیت کو متوازن انداز اور لہجہ سے ہم آہنگ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور نظم میں تنقید کی طرح ایک دبستان کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

> "نظم کی پرکھ کے سلسلے میں اس بات کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ٹھوس تمثالیں Concreto Images کا کیا عالم ہے کیونکہ ٹھوس تمثالیں معنی دیار کے ارضی نشانات ہیں جو شاعر کے حسی تجربے کے خدوخال کو اجاگر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا نظم ان حسی تجربات کو بنیاد بنا کر اوپر کی طرف اٹھ بھی رہی ہے یا نہیں یعنی وہ محض حسی تجربات تک محدود ہے یا معنی کی ان گنت پرچھائیوں اور شعاعوں کو جنم بھی دے رہی ہے۔ ہر اچھی نظم کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک ارضی سطح جو ٹھوس اور محسوس تمثالوں میں منتقل ہوتی ہے۔ دوسری معنوی سطح جو امکانات کے در وا کر دیتی ہے مگر امکانات کی صورت بھی ممکن ہے کہ شاعر اور پھر قاری پہلے اپنے تجربے کے بطون میں سفر کرے اور پھر تجربے سے نکلنے والی شعاعوں پر محوخرام ہو۔ تجربے کے بطون میں سفر کے لیے نظم کے معنی دیار سے آگاہی ضروری ہے۔ اور یہ آگاہی شاعر کی وساطت سے بھی ہو سکتی ہے اور نظم کی ٹھوس تمثالوں کے ذریعے بھی۔ موخرالذکر طریق ایک آزمودہ نسخہ ہے مگر مقدم الذکر کو اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے زیادہ مواقع مہیا نہیں کیے گئے کیا ہرج ہے اگر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اس طریق کو بھی آزمایا جائے۔" (دیباچہ۔ نردبان)

"شام اور سائے" سے "آدھی صدی کے بعد" تک ان کا فنی اور شعری سفر اس بات کی گواہی ہے کہ ان کے یہاں سوچ فکر اور تجربہ کی تازگی برقرار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شعری موضوع یک رنگ یا یک جہت نہیں ہے۔ وہ انسان سے وابستہ تخلیقی عمل کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں جو کائنات کی طرح قدیم اور لازوال ہے۔ چنانچہ زندگی کو جان کر اس کی بے ثباتی کا شعور اور زندگی کے لمحہ لمحہ سے لطف اٹھانے کی تمنا کی تضاد ایک ایسے کرب کو جنم دیتا ہے۔ جس نے ان کی نظموں میں تہہ داری کی وہ کیفیت پیدا کی ہے جس تک رسائی نظم کے قاری کو نئی لذتوں اور نئی رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

ہوا کچوکے لگا کے کہتی ہے تم ابھی سانس لے رہے ہو
ہوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ سانس تو ایک واہمہ ہے
ہزاروں کالی مگس جونکیں
مرے بدن سے چمٹ گئی ہیں
بدن کے ساغر کو پی رہی ہیں
میں خشک ہوتے ہوئے شجر کا سفید پتہ
ہوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ تھرتھراہٹ
خود اس کے ہاتھوں کی کپکپی ہے
مری شکستہ اڑان
اس کی دہکتی پھونکوں کی قوس تک ہے
میں اک لرزتا سا واہمہ ہوں
مہیب کھڈ کے لبوں پہ اٹکا ہوا میں چکنا سا گول پتھر
ہوا کی ٹھوکر کے خوف میں جیتا مرتا ہوں
ہوا سے کیسے کہوں کہ میں ایک جری سپاہی
میں اپنے خنجر کی نوک سے خود ہی کٹ گیا ہوں
لہو کے قطروں میں بٹ گیا ہوں
ہوا اگر خوشبوؤں کا فرغل پہن کے آئے
ہوا اگر بادلوں سے جھانکے
ہوا اگر کہے کہ وہ تو اک لمس ہے ذرا سا
ہوا اگر میرا روپ دھارے
مجھے پکارے
تو ہنس پڑوں میں
ہوا کے قدموں کی دھول بن کر
برس پڑوں میں (ہوا اگر میرا روپ دھارے)

وزیر آغا کی نظمیں انسان، کائنات اور وقت کی تثلیث سے عبارت ہیں۔ وہ انسانی دکھوں کا مطالعہ کائنات کی وسیع تر معنویت کے پس منظر میں وقت کی رفتار کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں چنانچہ لمحہ ان کے یہاں بنیادی نکتہ ہے۔ لمحہ جو موجود بھی ہے اور نہیں بھی جس کے ایک طرف ماضی اور دوسری طرف مستقبل ہے چنانچہ لمحہ کی گرفت میں وہ ایک طرف تو اتھاہ ماضی کے اسراروں میں اور دوسری طرف مستقبل کی سرمئی دھند میں دور نکل جاتے ہیں لیکن نہ تو ماضی میں گم ہوتے ہیں اور نہ مستقبل کی سرمئی دھند میں اپنے آپ کو بھلا دیتے ہیں بلکہ ایک جست میں لمحہ موجود میں لوٹ آتے ہیں۔ اس حسیت کے نتیجہ میں جو تجربہ احساس اور خیال ان کی گرفت میں آتا ہے وہی ان کی نظموں کا اثاثہ ہے۔

پرندہ ہوا ہے
ہوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لوٹ جانے کا اک سلسلہ ہے
میں اس سلسلے کے پراسرار سے زیر و بم میں رواں ہوں
مسافت کے دریا میں موجود کی زد پہ
ہواؤں کی ٹھوکر پہ آیا ہوا ابر کا ایک بجرا ہوں
بجرے کا تنہا مسافر ہوں
دریا کے دونوں کناروں میں سیال سا رابطہ ہوں
ازل سے ابد کی طرف
اور ابد سے ازل کی طرف بہہ رہا ہوں
زمانوں کے سارے معطر مکاتیب پر میرے ہونے کی مہریں لگی
ہیں
میں ہر نامہ معتبر کی جبیں پر کھدا ہوں
دلوں کے کڑے فاصلے، میری سچی گواہی نہ ہو تو کبھی ختم ہونے
نہیں ہیں
میں تار نظر ہوں، میں یادوں کی برکھا ہوں
بہتے ہوئے چاند کی روشنی ہوں کہ جس میں بھی
غسل کرنے پر مجبور ہیں
دوستوں دشمنوں میں مرے قدم ہی سے ترسیل کا سلسلہ ہے

میں تار نظر ہوں
میں سیال سا رابطہ ہوں
مقدر میں میرے لکھا ہے کہ میں سانس بن کر
اک اک تن میں اتروں اک اک تن سے باہر کو آؤں
زمانوں کو تازہ لہو کی حرارت مہیا کروں
وسیت کو نیست ہونے سے ہر دم بچاؤں
مگر اپنی خاطر کوئی جسم ہرگز نہ مانگوں
کسی ایک منزل پہ رکنے نہ پاؤں

عجب فیصلہ ہے
عجب یہ سزا ہے
ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت میں اڑتا پھروں
اپنی صورت کوتر سا کروں
اپنی تجرید میں خوش رہوں
اور زندہ رہوں
اور زندہ رہوں (ازل سے ابد تک)

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ وزیر آغا بنیادی طور پر ایک مفکر ہیں۔ کوئی بھی بڑا مفکر اس وقت تک بڑا شاعر نہیں بنتا جب تک اس کی شاعرانہ شخصیت بھی اتنی ہی بڑی نہ ہو۔ وزیر آغا کی فنی اور فکری شخصیت کا مطالعہ اور ان کی نظموں کی خالص تخلیقی اور فنی پرکھ یہ انکشاف کرتی ہے کہ وہ ایک بڑے مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی شاعرانہ صفت بھی رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں موضوع، فکر اور خیال کے حوالہ سے جتنی بڑی ہیں اظہار، اسلوب اور فنی سطح پر بھی بڑی شاعری کے معیار پر پوری اتری ہیں۔ لفظ کے چناؤ اور استعمال کا سلیقہ اور مصرعہ کی ساخت اور فنی بنت کاری کا انداز انہیں بڑا شاعر ثابت کرتا ہے۔

زمانہ...... وہ مکتب سے بھاگا ہوا وحشی لڑکا
جو میرے تعاقب میں گر گر کے پاگل ہوا تھا
اسے دھن اگر تھی تو بس اس قدر تھی
کہ وہ اپنی مٹھی میں مجھ کو گرفتار کر کے دکھائے
زمان و مکاں کی حدوں میں
کسی صاف تختی کے چہرے پہ لکھے
سیاہی کے بے نام نقطے پہ رکھنے کو خوگر بنائے
(ایک خواب)

زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے
زمانہ تو بھیگا ہوا ایک چابک ہے
میرے بدن پر
انوکھے سفر کی کہانی سی اک
لکھ رہا ہے
(آدھی صدی کے بعد)

ان کا اپنا ایک مکمل علامتی نظام ہے۔ جو ان کے سبھی مجموعوں میں پھیلا ہوا ہے ان کی علامتیں فطرت کے گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کے مطالعہ اور ثقافتی توانائی کی مظہر ہیں۔ علامتی نظام استعمال کی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ ان کے سبھی مجموعوں میں فنی خوبصورتی کی ایک انفرادی سطح قائم کرتا ہے۔ ان کی نظموں کے چاروں مجموعے فکری، فنی اور اسلوبی سطح پر نہ صرف ان کے اپنے شعری سفر کی ارتقائی صورت حال کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ جدید اردو نظم میں مکمل چہرگی اور فنی وفکری اعتبار کی معتبر گواہی بھی دیتے ہیں۔

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا اوران کا شعروادب

رب نواز مائل
مکان نمبر ۱۸۱/۱۳۔۵
کوچہ قادر شہید فقیر محمد روڈ کوئٹہ

کہا جاتا ہے اور جیسا کہ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے مضمون میں آیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ساٹھ کتابیں چھپی ہیں اصالتا اس سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ اتنا بڑا کام کوئی گوشت پوست کا انسان کیسے کر سکتا تھا سو انھوں نے کیسے کیا لیکن پھر کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا انسانی گوشت پوست میں جن ہی ہوں جن کے متعلق بڑے بڑے نادر کام اور ہیئتیں بدلنے، وقوعے موجود میں لانے تک کیا نہیں متصور ہوتا۔

لیکن اس پیرے کے بعد اس طرف بہ انداز دیگر اس طرح آ رہا ہوں کہ کتنے مشکل موضوعات اس کے تحت کیا فلسفہ ان کے ہاں جاری تھا، کیسی سادہ بیانی اور روانی، آپ کی سی صورت ان کی شاعری اور نثر دونوں کی تھی کہ احمد ندیم قاسمی نے بھی اسے سراہا اور جمیل یوسف نے تو اندازے سے بڑھ کر سراہا۔ پھر ڈاکٹر انور سدید، جمیل آذر، اور رشید امجد جیسے اور جیلانی اصغر جیسے تو اس کے اپنے ہی تھے گویا کون سے گرو اس مہا گرو کے چرنوں میں داد سخن و داد فن نہیں دے رہے تھے۔ ساٹھ کتابیں بھی چلیں، بڑے بڑے ادیب کے ہم پلہ رہے اور ان کی نثر بھی عظیم نثر گنی گئی اور شاعری بھی عظیم شاعری گویا اس طور ٹھہری۔

دراصل ڈاکٹر وزیر آغا ایک انتہائی طباع قسم کی ادبی شخصیت رکھتے تھے وہ غالب اور اقبال دونوں کو مانتے تھے اسی طرح اور بڑوں بڑوں کو بھی چاہے مشرق کے تھے چاہے مغرب کے، بہ الفاظ دیگر پوری مشرقی فکر آگے اور پوری تحریک فکر بھی آگے تھی لیکن اس نے اپنی شعری ونثری خاکہ گری دونوں اپنی حیثیت میں اپنی حیثیت ہی سے کی۔ غزل میں اپنے شعر نکالے اپنی ہی آواز کے جوہر کے ساتھ۔ کلاسیکی شاعری سے کوئی ربط یا اس کا کوئی پرتو اس پر پڑنے نہیں دیا۔ جدید شاعر تھے، جدید آزاد تلازمۂ خیال کے جملہ افقوں کے حامل ان سے ہی گویا سب کچھ برآمد کرتے ہوئے۔

وہ اپنے طور بلاشبہ اتنا کچھ رکھتے ہوئے کہ جیسے وہ کبھی خالی نہیں ہوں گے میں تو ادھر کہوں گا کہ وہ ایک سو ساٹھ کتابیں اور بھی لکھ سکتے تھے۔ دراصل جدیدیت نے اس کے اوریجنل خیالات کو اس طرح اپنے اندر جگہ دی کہ ٹی ایس ایلیٹ کی روایت پرستی یا کلاسیکیت نوازی گویا اس کے قول میں اضافہ نہیں کر رہی تھی وہ خود ساز تھے عہد ساز تھے۔ انشائیے کے بھی گویا بانی تھے۔ اپنی کتاب تخلیقی عمل پر میرا تبصرہ بھی انہیں پسند آیا تھا۔ ساختیات کی باتیں ان سے اب تک چل رہی تھیں سو ڈاکٹر وزیر آغا زندہ باد۔

❖OOO❖

دھوکا

دبیز گرد کی چادر نے سارے منظر کو
بدل دیا ہے کچھ ایسے کہ سبز پیڑ ہمیں
پرند دکھتے ہیں، پھولے ہوئے پروں والے
پتنگ بن کے پرندے فلک پہ پراں ہیں
مکان جیسے کہ مرقد ہوں اور مکیں ستارے
حنوط لاشوں کی صورت زمیں پہ بکھرے ہیں
ہر ایک چیز کا معنی بدل گیا یک دم
عجب دبیز کی چادر ہے جس نے بچپنے ہی
ہمیں بتایا کہ جو کچھ اب اس کے پیچھے ہے
وہی نہیں ہے جو دکھتا رہا سدا ہم کو
ہر ایک چیز کے اندر ہے کوئی شے ایسی
جو گرد پہلے تو دکھتی ہے ورنہ دھوکا ہے!

وزیر آغا

❖OOO❖

وزیر آغا

(خطوط سے اقتباسات پر مبنی ایک دستاویز)

ستیہ پال آنند

ڈاکٹر وزیر آغا سے میری خط و کتابت پینتیس چالیس برس کے لمبے عرصے تک پھیلی ہوئی ہے۔ چالیس برس پہلے انڈیا میں فون لگ بھگ نایاب تھا اور دوسرے کسی ملک میں بات کرنے کی خاطر کال بک کروانے کے لیے ڈاکخانے جانا پڑتا تھا، اس وقت خط و کتابت ہی رابطے کا ایک ذریعہ تھا۔ 1982ء میں میرے بیرون ملک آ جانے کے بعد ہمارا فون پر بات چیت کرنا لگ بھگ ہفتہ واری معمول ہو گیا لیکن خط و کتابت جاری رہی کیونکہ کچھ باتیں صرف تحریر میں ہی لائی جا سکتی ہیں۔ ان کی رحلت کے بعد آجکل میں ان کے بے شمار خطوط کی نہ صرف تاریخ وار درجہ بندی کرنے کے عمل میں مصروف ہوں، بلکہ موضوعاتی نکتۂ نظر سے اقتباسات کو ریسرچ کے معروضی طریق کار سے حاشیہ زد کر رہا ہوں۔ اس مختصر مضمون میں صرف دو شخصیات پر مختلف برسوں میں تحریر کردہ کچھ خطوط سے متعلقہ پیراگرافوں کو ہی لیا گیا ہے ۔ ذاتی دعا، القاب وغیرہ اور معاصرین ادباء کے بارے میں ریمارکس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ کسی تنقیدی مضمون اور ذاتی خط کا اسلوب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ خطوط میں عموماً ایک آزاد، ڈھیلا ڈھالا سا طرز تحریر روا رکھا جاتا ہے۔ (س۔پ۔آ)

ن۔م۔راشد کے بارے میں

(اقتباس، مکتوب۔1996-9-3)

......آپ نے درست لکھا ہے، راشد کے لیے لفظ "جدید" یا "جدیدیت" وہ معانی نہیں رکھتے تھے جو آج کل بھارت میں چلائی گئی تحریک کا محرک ہیں۔ راشد نے خود ایک مضمون لکھا تھا، "جدیدیت کیا ہے"۔ یہ ان کی وفات کے بعد "شعر و حکمت" (حیدر آباد، دکن) کے راشد نمبر میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس میں راشد نے جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے کچھ مفروضات کی نشاندہی کی تھی۔ مثلاً یہ عام خیال کہ جدیدیت سے مراد صرف سر بمہر استعاروں، علامتوں، تلمیحوں سے روگردانی ہے، جو روایتی شاعر کا سکۂ وقت ہوتے ہیں، کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ اس بات کا تعلق صرف اسلوب سے ہے، زندگی کے بنیادی حقائق سے نہیں ہے۔ راشد نے یہ بھی لکھا تھا کہ جدیدیت سے مراد محض معاصریت نہیں ہے۔ ہمارے معاصرین میں بھی زیادہ تعداد ان شعرا کی ہے جو انداز فکر میں اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں، صرف ماضی سے تعلق روا رکھتے ہیں۔ اپنی دانست میں جدید انداز فکر کا حامل شاعر بھی اگر صرف اپنی کسی کاوش کو اس لیے 'جدید' سمجھتا ہے کہ اس کے اشعار میں "حسب توقع" مضمون کی جگہ پر اجنبی اور غیر متوقع مضمون باندھے گئے ہیں، تو بھی وہ اشعار جدیدیت کی تعریف پر پورے نہیں اتریں گے۔ جب تک کہ وہ مضمون براہ راست یا علامتی سطح پر اپنے آس پاس کی جیتی جاگتی زندگی سے نہ اخذ کیا گیا ہو، اسے 'جدید' کہنا غلط ہوگا......آپ نے یہ بھی صحیح لکھا ہے کہ راشد کی جدیدیت کو یورپی جدیدیت کے پیمانوں سے ماپنا اس کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ میرے خیال میں اگر ہم منطق کے اس اصول سے چلیں جس میں نفی کی ایک ایک جہت کو لے کر انہیں باری باری سے رد کرتے ہوئے آخر اس مثبت جہت تک پہنچا جاتا ہے جو روح اصل ہے، تو ہم شاید راشد کو اس کے اپنے اور معاصرانہ سیاق و سباق میں سمجھ پائیں۔ اس کے لیے ہمیں اس کی شاعری کو روایت کے ہی پیمانے سے ماپنا پڑے گا۔ جس قدر وہ ماضی کی روایتی اصناف شعر، رسمی رکھ رکھاؤ، دقیانوسی ہیئت سے قطع تعلق کرتا ہوا نظر آئے گا اتنا ہی وہ "جدید" ہوگا۔ اس طریق کار میں ایک اور راز بھی مخفی ہے۔ آج کی جدیدیت آنے والے کل کی روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔ راشد نے خود لکھا تھا کہ حالی اور آزاد کو اپنی شاعری کی تحریک "انتشار روایت سے بغاوت" کے جذبے سے ملی۔ یہی بغاوت آج ہماری اس روایت کا ایک حصہ ہے، جسے آپ نے ایک ہندی اصطلاح "رُڑھی واد" سے مشابہ کیا ہے۔

مزید راشد کے بارے میں

(اقتباس۔مکتوب 20-11-96)

......آپ نے جو اقتباس راشد کے مضمون سے لیا ہے، وہ خود میں مکمل نہیں ہے۔ راشد پر وقتاً فوقتاً تینوں الزامات لگائے جاتے رہے ہیں۔ فحاشی تو عریانی کی آخری حد ہے اور میرے خیال میں راشد کی کسی نظم میں بھی یہ بدعت نہیں دیکھی جا سکتی۔ راشد کی ان نظموں میں، جن کا محرک شاید کوئی ہنگامی واقعہ رہا ہو، عریانی صرف اس حد تک ہے کہ وہاں وہ اپنے شاعرانہ 'ابہام' کو بروئے کار نہیں لا سکے۔ صاف صاف الفاظ میں نسوانی جسم کے زاویوں کا بیان عریاں نہیں کہا جا سکتا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے، کہ شاعر اپنے قارئین کو جھٹکا دے کر یا جھنجوڑ کر ایک غیر قدرتی نیند سے بیدار کرنا چاہتا ہے، کہ وہ جن موضوعات سے ذاتی زندگی میں دو چار تو رہتے ہی ہیں لیکن مجلسی زندگی میں ان پر بات کرنے سے بھی اجتناب برتتے ہیں، ان پر بھی بات کر سکیں۔ یہ قارئین کے غیر قدرتی 'اخلاقی' persona کو صدمہ پہنچانے کی ایک سعی ہوگی......دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ ہنگامی خیالات کا اظہار کے لیے بھی نظم نویسی کا سہارا لیتے ہیں۔ جب کہ ان کے لیے ایک اخباری خبر ہی بہترین ذریعۂ اظہار ہے......ہنگامی خیالات سے آپ کی مراد اگر یہ ہے کہ راشد نے کسی گوری عورت کے ساتھ ہمبستری کی اور پھر اس پر ایک نظم لکھ دی، تو ہر شاعر محرک کے طور پر کسی تازہ یا بھولے بسرے واقعے کو بنیاد بنا کر ایک مثالی حکایت (parable) کا چوکھٹا تیار کرتا ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ راشد نے خود اپنے زیر بحث مضمون میں لکھا تھا، (میں حرف بحرف لکھ رہا ہوں)۔ ...."فوری قسم کے خیالات کا اظہار جو جدید شاعری کے ایک طبقے کی خصوصیت ہے، ایک حد تک جدید صحافت نگاری کا نتیجہ ہے۔ دوسرے ان سیاسی اور معاشرتی گروہوں کی تبلیغ کا جو ہمیشہ سے شاعر اور ادیب کو اپنے "جلال کبریائی" کے فروغ کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں.....اس طرح نہایت شخصی قسم کے تصورات کا اظہار بھی اسی اضطراب کا پرتو ہے یا موضوعات کی بنیادی قلت یا تشنگی کو کم کرنے کی کوشش ہے یا اس اپج اور ندرت کی تڑپ ہے جو جدید عصر کی خصوصیت ہے اور جس کے بغیر کسی فنی کارنامے کی الگ شناخت اور برتری ممکن نہیں۔ یوں بھی جدید شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ پوری بھرپور زندگی کے خفیہ روزن اس وقت تک وا نہیں ہو سکتے جب تک شاعر دوسروں کو دیکھنے کی بجائے اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے، اپنے اندر نہ جھانک سکے اور اپنے اندر جھانکنے میں دوسروں کی رہنمائی نہ کر سکے۔"....اب اس حوالے سے آپ اسی نظم کو دیکھیں جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے، اور جس کے "جواب" کے طور پر آپ نے بھی ایک نظم لکھی ہے، "میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر...." تو آپ کو احساس ہوگا کہ راشد عریانی یا فحاشی سے لذت حاصل نہیں کر رہے تھے شاید آپ اور آپ جیسے لاکھوں ہموطنوں کے دلوں میں موجزن اس 'انتقام' کے جذبے کا اظہار کر رہے تھے جو ایک طرف تو گوری جلد والی عورت (خصوصاً انگلستان کی "میم") سے ہمبستری کی سوقیانہ خواہش ہے اور دوسری طرف اس فعل کو انگریزوں کے ہاتھوں اپنے وطن کے نام و ناموس کو تباہ کرنے "سزا" یا "انتقام" کے طور پر دیکھنے کی ذہنی عیاشی ہے.........اب آئیں آپ کے تیسرے نکتے یعنی 'ابہام' کی طرف۔ آپ نے اپنی بات کہنے کے لیے

جس استعارے کا استعمال کیا ہے، وہ بہت پہلے راشد خود کر چکے ہیں۔ نگینہ جڑا ہوا انگوٹھی میں، انگوٹھی ایک بند ڈبیا میں، ڈبیا ایک قفل بند صندوق میں اور صندوق سمندر کی گہرائی میں۔ اب وہ کیسا غوطہ خور ہوگا، جو اس کی تلاش میں نکلے گا؟ معنی کا نگینہ شاید رہتی دنیا تک سمندر کی تہہ میں دفن رہے! یہ استعارہ بصری تصویر کی سطح پر لفظ ''ابہام'' سے انصاف نہیں کرتا۔ 'ابہام' کی صفت 'مبہم' ہے۔ 'مبہم' غیر یقینی یا مشکوک تو ہو سکتا ہے، یعنی ''گونگم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کے تحت آ سکتا ہے، لیکن بالکل مخفی نہیں ہوتا۔ آپ اس بات سے تو اتفاق رکھتے ہیں کہ شاعری میں حتمیت اور قطعیت نہیں ہے، اچھی شاعری کا منشا بھی ترسیل کی صد فی صد کامیابی نہیں ہے۔ اس لیے اسلوب کے مختلف پہلوؤں پر اگر غیر معین، ذو معنی (یا راشد کے ہی الفاظ میں) ژولیدہ ہونے کا الزام لگایا جائے تو یہ اس کی تعریف ہوگی، برائی نہیں......

......جیسا کہ راشد نے اپنے زیر بحث مضمون میں بھی لکھا تھا، جدید شاعروں کو اپنے نئے، غیر روایتی اور کثیر تجربات اور مشاہدات کے اظہار کے لیے مناسب زبان نہیں ملتی۔ کانسیپٹ کی سطح پر اگر کسی پیچیدہ مسئلے کو انگریزی میں صرف ایک اصطلاح سے بیان کیا جا سکتا ہے تو، شاعری کی زبان تو درکنار، اردو نثر میں بھی آپ کو اس کے لیے شاید ایک پوری سطر لکھنی پڑے۔ یہ تجربات اور مشاہدات یکسر نئے ہیں ایک حد تک ہمارے معاشرے میں اپنے لیے جگہ بنا چکے ہیں، لیکن ان کے لیے 'لیبل' ابھی اردو زبان میں ایجاد نہیں ہوئے۔ 'امرد پرستی' قدیم لفظ ہے۔ پنجابی میں کمسن لڑکوں کو خراب کرنے کے لیے ایک بے ہودہ لفظ بھی ہے۔ لیکن امریکی لفظ ''گے'' کا کیا ترجمہ ہے؟ آپ بتا سکتے ہیں؟ نئے تجربات اور مشاہدات (خصوصی طور پر راشد جیسے اور آپ جیسے شاعروں کے لیے جو مغرب میں رہ چکے ہیں یا رہ رہے ہیں) کوئی پہیلی نہیں ہیں اور آج کل تو یہ ایک عام رواج سا بن گیا ہے کہ جہاں ہم کوئی صحیح اردو متبادل نہیں ڈھونڈ سکتے، وہاں ہم انگریزی لفظ ہی جڑ دیتے ہیں۔ لیکن راشد کے وقتوں میں جدید شاعر کے لیے یہ ایک ناقابل حل معمہ تھا۔ اسے زبان کا استعمال، یعنی سطح پر بھی، اور زیریں سطحوں پر ایسے کرنا پڑتا تھا کہ ابہام کا در آنا ایک قدرتی بات تھی۔ (میں لفظ 'نیچرل' لکھنے والا ہی تھا، کہ میں نے 'قدرتی' لکھ دیا۔ دراصل 'قدرتی' صحیح طور پر 'نیچرل' کے معنی کی سب جہتوں کا حامل نہیں ہے!)......

مزید راشد کے بارے میں

(اقتباس۔ مکتوب 97-2-22)

.....آپ نے راشد کے ساتھ سعادت سعید کے ایک مباحثے کی کچھ تفصیل دی ہے۔ میری نظر سے یہ تحریر نہیں گذری۔ بہر حال آپ نے یہ اچھا کیا کہ اس بات چیت کے کچھ حصے ہو بہو نقل کر دیے۔ (جو اقتباس میں نے واوین میں تحریر کیا تھا۔ وہ حسب ذیل ہے۔ س۔ پ۔ آ)

ن۔ م۔ راشد نے سعادت سعید کے ایک سوال کے جواب میں کہا: ''جب شاعر شعر کہتا ہے تو اس میں دو ہستیاں برابر کی شریک ہوتی ہیں ایک تو شاعر کی شعوری انا اور دوسرے کوئی فرشتۂ غیب جسے تحلیل نفسی کی زبان میں غیر شعوری انا بیان کیا جاتا ہے۔ ہماری شاعری میں اسی کو سروش یا ہاتف کا نام دیا گیا ہے۔ شعر کی تخلیق کے لیے ان دونوں کا وصال ضروری ہے۔ لیکن یہ دونوں بھی یک جا ہونے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتے جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ فن کار یا شاعر کسی خاص واقعے کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ وہ اس وقت تک فن کار یا شاعر کے اندر ہیجان پیدا کرنے پر مائل نہیں ہوتے جب تک کہ انہیں اس گہری وابستگی کا یقین نہ ہو۔ ہاں، جب یہ دونوں یہ ہیجان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ایک تیسری ہستی، یعنی فن کار یا شاعر کے اندر چھپے ہوئے محتسب کی ہستی اس کو اس کی لغزشوں سے برابر آگاہ کرتی رہتی ہے......اس وصال کے موقع پر (جہاں تک شاعر کے عمل تخلیق کا تعلق ہے) کچھ اور ذوات بھی شریک ہو جاتی ہیں مثلاً الفاظ اپنی اصوات، اپنے باہمی آہنگ اور مفہوم کے ساتھ ۔۔۔ مثلاً قافیے، ردیفیں، 'اوزان'، اصناف سخن، فصاحت و بلاغت کے وہ اصول جن کا علم شاعر نے مدرسے میں یا اپنے معلموں کے ذریعے کسب کیا ہو۔ ان سب کی حیثیت شاعر کے دست بستہ غلاموں کی ہے۔ لیکن اگر شاعر چوکنا نہ رہے تو ان میں سے ہر ایک اس کا آقا بن کر اس پر سواری کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ ان کا شیوہ یہ ہے کہ اگر شاعر کے ماتھے پر شکن دیکھ پائیں تو فوراً کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اگر شاعر انہیں شفقت کی نگاہ سے دیکھ لے تو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

.......تخلیقی قوت میلان طبع کی محتاج نہیں ہے۔ (آغا صاحب نے مجھے لکھا۔ س۔ پ۔ آ)۔ راشد نے جس نفاست اور سادگی کی آمیزش سے فنکار کی کسی ''خاص واقعے سے گہری جذباتی وابستگی'' کو شرط اولیں تسلیم کیا ہے، اس سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ ''ہیجانی کیفیت'' کو بھی جن الفاظ میں راشد نے creative faculty کو مہمیز دینے کی شرط کہا ہے، میری سمجھ سے باہر ہے۔ بخار کی سی کیفیت میں یا ہذیان بکتے ہوئے ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ لیکن میں ان الفاظ کے استعمال کے لیے راشد کو الزام نہیں دیتا۔ راشد کی شاعری جس دور میں پروان چڑھی (مجھ سے گیارہ بارہ برس ہی تو سینئر تھے!) وہ میرا بھی دیکھا ہوا ہے۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ راشد کا ''جدیدیت'' کی اصطلاح کو استعمال کرنا شاید اس وقت کے قاری کو قابل قبول ہو جس وقت سعادت سعید اس مباحثے کی روداد لکھ رہے تھے لیکن آج کے قاری کو یہ قبول نہیں ہے۔ راشد (اور میرا جی) کا دور، میرے خیال میں، ایک عبوری دور ہے، جس میں یہ دو شعرا ترقی پسند تحریک کے عین برعکس تو نہیں، لیکن کسی حد تک متوازی اور نیا راستہ بنا کر اس پر گامزن ہوئے۔ (یہ ترقی پسند تحریک کا ہی اثر تھا جس نے انہیں اپنی نظموں میں یورپی امپیریل ازم کے برخلاف لکھنے پر اکسایا)......... آج کا قاری جس تحریک کو 'جدیدیت'' سمجھتا ہے، وہ اس صدی کی پانچویں دہائی کے وسط میں ابھری۔ یعنی آزادی کے دس سال بعد تک تو اُس افراتفری کا دور رہا جس میں مرغوب ترین موضوعات تقسیم وطن سے متعلق تھے۔ اُس دور میں کسی کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ انفرادی اور داخلی تجربات کو جمالیاتی اور وجدانی سونے کا ملمع چڑھا کر پیش کرتا۔ آج کی جدیدیت میں جو بے ستی ہے، کلبیت ہے، بہیمیت ہے، انتشار اور بحران ہے، وہ ایک نپے تلے منصوبے کے تحت، مجھے محسوس ہوتا ہے، انڈیا میں ادب پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ لیکن راشد کو ترقی پسند تحریک سے کوئی ایسا بیر نہیں تھا کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد کا ایسے ہی اعلان کرتے، جیسے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے زمانے میں اور اس کے بعد 'جدیدیت' کے علمبرداروں نے انڈیا میں کیا.......... مجھے یاد ہے برسوں پہلے میں نے کہیں لکھا تھا کہ راشد کی بیشتر نظمیں جو زیادہ طویل نہیں ہیں، ایسے چلتی ہیں جیسے ایک پایاب ندی میں پتھروں کو اس طرح رکھ دیا گیا ہو کہ ندی پار کرنے کے لیے آسانی سے ان پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھا جا سکے۔ ایک مثال جو میں نے دی تھی، وہ ''ماورا'' میں شامل کی گئی ''طلسم جاوداں'' کی تھی۔ یہ نظم خود کلامی کے form-at میں ہے، لیکن اس میں مد مقابل کا وجود، جو شاعر یا اس کے واحد متکلم کی محبوبہ ہے، فرض کر لیا گیا ہے۔ ابتدائی سطریں، درمیان کی کچھ سطریں اور آخری سطریں اس کی Organic Unity کو مستحکم کرتی ہیں۔ اس میں کوئی 'ہیجانی کیفیت' نہیں ہے، براہ راست تخاطب ہے جس میں شاعر منطق کا دامن نہیں چھوڑتا۔ آپ اگر اسے پڑھیں تو آپ کو بآسانی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ایک سوچ سمجھ کر لکھی ہوئی، ''ٹھنڈے دماغ'' کی نظم ہے، جس میں کوئی ہیجان نہیں ہے۔ پہلی تین سطریں یہ ہیں۔ ''رہنے دے اب، کھو نہیں باتوں میں وقت! / اب رہنے دے / اپنی آنکھوں کے طلسم جاوداں میں بہنے دے'' درمیان کی کچھ سطریں دہرائے جانے کی عمل میں اس احساس کو تیز کرتی ہیں: ''رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت / اب رہنے دے!'' اور آخری سطریں پھر یہی عمل دہراتی ہیں۔ ''رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت / زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے۔۔۔۔۔۔'' اب غور کریں تو ان تین ''وقفوں'' میں محیط سارا ڈرامہ ''مصر، ہند و نجد و ایران کے اساطیر قدیم''، شہنشاہوں، شہزادوں، قافلوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یعنی۔ There definite middle and a definite end a definite beginning, a is۔ اس کی بُنت میں یہ تاگے ایسے شامل کیے گئے ہیں کہ سب کمڈی پر چڑھا کر ''بُنا گیا'' سا لگتا ہے۔ ایسی نظموں کی شان نزول کو ہم کیسے ایک ایسی ذہنی کیفیت کی آئینہ دار کہہ سکتے ہیں جو ہیجانی

ہو......

میراجی کے بارے میں

(اقتباس۔ مکتوب 13-5-98)

.....آپ نے درست تحریر کیا ہے کہ دونوں کی رفاقت اور دوستی کو یک جہتی کی وہ سطح دے دینا جس پر وہ ایک جیسے ہی نظر آئیں، غلط ہے۔ شاعر کے طور پر دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ راشد اور میراجی کے درمیان دوستی ضرور تھی، خیر خواہی تھی لیکن اگر ہم کہیں کہ اینٹلیکچوئل لیول پر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلتے تھے، غلط ہے۔ کچھ برسوں کے بعد اس دوستی میں بھی صرف پاسداری کا عنصر رہ گیا، انس بھی رہا لیکن 'یک جان دو قالب' ہونے کی بابت جو کچھ بھی ان کے تذکرہ نویس لکھتے ہیں، حقیقت سے بہت دور ہے۔ رسم و راہ میں بھی اور نشست و برخاست میں بھی، وہ الگ الگ سمتوں میں چلے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کی باہم بات چیت کے دوران کوئی ادبی مسئلہ اس طرح زیر بحث لایا گیا ہو کہ دیگر حاضرین بھی اس میں شریک ہو سکیں......

.....راشد بہت پڑھے لکھے تھے۔ انگریزی اچھی بولتے تھے اور واجبی لکھ بھی لیتے تھے۔ روشن دماغ تھے۔ فارسی میں صلاحیت رکھنے کی وجہ سے اپنا مخصوص شعری اسلوب بہت پہلے سے ہی ترتیب دے چکے تھے۔ چہرہ پر سکون رکھتے تھے، ان کی بات چیت میں توازن تھا، زود فہم تھے اور سنجیدگی سے گفتگو میں حصہ لیتے تھے......میراجی ان سب امور میں ان کے ہم پلہ تو کیا، کہیں قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ دونوں کی شاعری مختلف النوع تھی، زبان و بیان میں بے حد تفاوت تھی، اور راشد کے برعکس میراجی کی پوشاک، (بمعہ جوتے) سبھو کاتب کی طرح للہ عبارت سے لگتے تھے، ان دونوں کے مابین (یورپ، خصوصاً انگلستان) کے ادب پر ایسا بحث و مباحثہ ہوتا جس پر اپنی تعلیم و تربیت کے حوالے سے میراجی اپنی صائب رائے دے سکیں، مجھے کچھ بعید از قیاس لگتا ہے۔ اس کا ذکر (عام طور پر دبی زبان میں) ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں نے کیا ہے، لیکن کسی نے اس موضوع پر کھل کر بات نہیں کی.....راشد نے خود ایک انٹرویو میں کہا تھا: "جن لوگوں سے مجھے رغبت رہی ہے یا جن کی رفاقت نے میری شاعری اور عادات پر خاطر خواہ اثر ڈالا ہے، ان میں آغا عبدالحمید، چراغ حسن حسرت، محمد وحید گیلانی (جنہوں نے مجھے راشد تخلص سے نوازا)، پروفیسر احمد شاہ بخاری، غلام عباس ہیں۔ اختر شیرانی سے میں نے اپنی شاعری کی شروعات کی...." اس فہرست میں کہیں بھی میراجی کا تذکرہ نہیں ہے، چہ آنکہ اپنی 'عملی تنقید' کی وساطت سے میراجی نے راشد کو ایک منفرد شاعر کے طور پر پیش کیا........فردیاتی سطح پر میراجی پر "خوف" کی پرچھائیں ہر دم مسلط ہے۔ جیسے انہیں اپنی ہستی، اپنا وجود، حتٰے کہ اپنا بدن بھی غیر معتبر لگتا ہو۔ فرد کی ناکامی اس کی "جنسی ذات" کی ناکامی سے مترشح ہے، یہ پورے معاشرے یا پوری نسل کی ناکامی نہیں۔ میراجی "فرد" کے طور پر اپنے اندر سے فرار کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک بیمار ذہن کی اپج ہے کہ جب دایاں ہاتھ ان کی جنسی ضرورت کی تکمیل نہیں کر سکتا تو وہ ذہنی عیاشی کے لیے اس قسم کی سطریں لکھتے ہیں۔

سنتا ہوں، شہر کے محلے میں
تن کی پوجا کرنے والی ایک عورت ہے
اور سستا ہے اس کا کرایہ، ہاں سستے ہیں اس کے دام

راشد اس قسم کی جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں تھے۔ جہاں میراجی کی شاعری میں خوف ہے، وحشت کی فضا ہے، وہاں راشد کے ہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ان کی تشنگی بہت جلد آسودگی میں تبدیل ہو جاتی ہے، جب کہ میراجی اپنی "جنس زدگی" میں کوڑھ کے ایک مریض کی طرح تڑپتے رہ جاتے ہیں....

مزید میراجی کے بارے میں

(مکتوب 18-8-98)

آپ نے یہاں تک تو شاید درست ہی لکھا ہے کہ میراجی تنقید کی technical parlance سے واقف نہیں ہیں، لیکن یہ بات صحیح نہیں دکھائی دیتی کہ اس ایک کمی کی وجہ سے ہی وہ "معروضی طریق کار کے بجائے ذاتی زاویوں سے نظم کو دیکھتے ہیں، اور یوں نفس مضمون کو 'فرض' کر کے اپنا مضمون لکھتے چلے جاتے ہیں"....یہ تو دیکھئے کہ اس سے پہلے اردو میں عملی تنقید لگ بھگ ناپید تھی میراجی نے ایک راستہ تو دکھایا. آپ چونکہ یونیورسٹی کی سطح پر ادب عالیہ پڑھاتے ہیں اس لیے اپنے پیمانوں سے میراجی کو ناپ رہے ہیں۔ I.A. Richards نے جو نمونے پیش کیے، میراجی نے کہاں دیکھے ہوں گے؟ اور آج کل یورپ اور امریکا میں تو ادبی جرائد میں ریویوز کا معیار ہی وہ سند بن گیا ہے جس سے عملی تنقید کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنے والی بات ہے کہ میراجی راشد کے دوست تھے۔ نہ معلوم کہاں کہاں اور کیسے کیسے انہوں نے وہ نظمیں راشد سے شاید سنی بھی ہوں گی اور موضوعات پر بحث بھی ہوگی۔ (مجھے یاد تو نہیں کہ کہاں مگر سعید میر صاحب نے کہیں اس بات کی نشان دہی بھی کی ہے۔).....تنقید کی سکہ بند زبان کی بات کو اگر فی الحال بھول جائیں تو دوسرے نکتے پر آپ سے اختلاف رائے رکھتے ہوئے میں کہنا چاہوں گا، کہ اگر ان کی نظم "رقص" کو ہی لیں اور اس پر لکھے ہوئے میراجی کے تجزیاتی مضمون کو پڑھیں تو ظاہر ہوگا کہ اس میں ان کا اپنا زاویہ نگاہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ذات کی تو بات ہی دوسری ہے! میراجی نے تو شاید کسی عورت کو بازوؤں میں بھر کر بال روم میں ڈانس کرنے کا خواب تک نہ دیکھا ہوگا......... "رقص" کا مختصر تجزیہ اگر آپ ایک بار پھر پڑھیں تو آپ کو اس میں رقص کی صوتیات کے حوالے سے میراجی کی یہ قابل ستائش سعی نظر آئے گی کہ وہ نظم کے وسط سے پہلے اور فوراً بعد اسی حوالے سے مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی بات کہتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو یا نصیر احمد ناصر کو چھوڑ کر، آج یعنی میراجی کے کئی برس بعد بھی، عملی تنقید لکھنے والے ان باریکیوں کو نہیں دیکھتے......"زنجیر" کے تجزیے میں تو میراجی ایک ایسے نقاد کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں جو درسی یا نصابی تنقید کا ہنر بھی جانتا ہے۔ آپ ان کا تجزیہ سامنے رکھ کر دیکھیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ انہیں موضوع، عنوان، مضمون اور متن کو الگ الگ رکھ کر دیکھنے اور پرکھنے کا ہنر آتا ہے۔ متن کو پرکھتے ہوئے وہ مصرعوں کے مجوزہ شمار اور موجودہ شمار میں تفریق کا ایک منظر نامہ پیش کرتے ہیں، جس کے آخر میں "شاعر" اور "پبلنہ ریشم" کے مابین ایک مکالمہ ہے......مجھے یاد ہے، جب پہلی بار میں نے میراجی کے اس تجزیاتی مضمون کو پڑھا تھا تو مجھے خود حیرت ہوئی تھی کہ اس مرنجاں مرنج قسم کے "سائیں لوک" نے کس باریک بینی سے راشد یا شاعر کے متکلم کی شعوری رو کو ہر سطر اور ہر لفظ کے ساتھ trace کیا ہے۔ البتہ اس وقت بھی میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ مضمون کی آخری سطریں راشد سے کہیں زیادہ میراجی کی اپنی جنسی کج روی پر فٹ آتی ہیں۔

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا کی فکر کا جہانِ نو

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

اُردو ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام کئی وجوہ سے اہم ہے۔ وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں جن کی نظریہ سازی کا عمل گہرے اور بصیرت افروز حقائق کی عقدہ کشائی اور اس کے نتیجے میں ایک متوازن اور معتدل فکری سلسلے کو قائم کرنے سے وابستہ ہے اور یہ کہ انھوں نے اُردو تنقید کی سابقہ یا مروجہ روش پر پاؤں دھرنے کے بجائے ادب کی ماہیت اور اس کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کا ایک الگ اور منفرد زاویہ نظر دریافت کیا ہے جس کی کم ازکم اردو ادب میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

ان وجوہ میں مزید اضافہ بھی ممکن ہے مثلاً اُن کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی دنیا بے حد وسیع ہے جس میں متنوع قدیم وجدید علوم کے مطلعے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف آب وہوا رکھنے کے باوجود ایک خاص نوع کی تخلیقی اور تنقیدی بصیرت کے تحت ایک ہو جاتے ہیں۔ ان ہمہ جہت اور متنوع علوم کے تناظر میں جو دراصل ایک وحدت سے جڑے ہوئے ہیں، وہ ایسے اصول وضع کرتے ہیں جو ہمیں ایک مرکز پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جہاں سے ہم چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھیں تو فکر وخیال کے سارے دھارے ہمیں اپنی طرف بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے محدب عدسے کے ذریعے فضا میں بکھری ہوئی ان گنت کرنیں ایک نقطے کی طرف لپکتی ہیں اور معکوس ہو کر اس نقطے کو بہت زیادہ روشن اور حرارت خیز بنا کر آگ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اسی طرح ان کے نظامِ فکر میں تخلیق کے چھپے ہوئے ابعاد ایک مرکزے پر آکر منکشف ہوتے ہیں اور قاری کو ایک خوشگوار حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا تنقید کے معیارات کے بارے میں بھی اپنا الگ نکتہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تنقید کا نظام اقدار ریاضی کے کسی فارمولے کی طرح معروضیت کے تابع نہیں ہے اور نہ کسی سیارے کی طرح ایک مدار میں مسلسل حرکت پذیر رہنے پر مجبور ہے بلکہ اسے تخلیق کے بدلتے ہوئے معیارات کی طرح اپنے لیے نئے مدار بنانا پڑتے ہیں۔ نئے منطقوں کی تلاش میں مختلف سمتوں میں اپنے سفر کی جاری رکھنا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ بجائے خود اس تخلیقی عمل سے مماثل ہے جس میں سے ایک تخلیق کار کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں نقاد، تخلیق میں موجود معنی کا پتہ ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی گرہیں کھولتے ہوئے ایک نئی تخلیقی معنویت کو بھی وجود میں لاتا ہے جس تک عام ذہن رسائی نہیں پاتا۔ یوں تنقید، تخلیق کی معنیاتی توسیع بھی کرتی ہے اور اس معنیاتی توسیع کا تخلیقی جواز بھی فراہم کرتی ہے اس صورت حال میں تنقید اور تخلیق ایک جیسے تخلیقی عمل سے مربوط ہو جاتے ہیں اور ان میں تخلیقی سطح پر کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے یہاں دھرتی اور زمین کا حوالہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ شہر کے ہنگاموں سے دور گاؤں میں رہ کر گزارا ہے جہاں انھوں نے مٹی کے لمس کو بڑے قریب سے محسوس کیا ہے اور فطرت کے مظاہر کے ساتھ ایک گہرا تعلق استوار کیا ہے۔ ان کے نزدیک زمین کی ایک تہذیبی اور ثقافتی اہمیت ہے جس میں ارض وطن کا حوالہ بھی ہے جو ہماری جذباتی وابستگی کا مظہر ہے لیکن اس سے آگے زمین کی کوکھ سے تہذیب اور کلچر جنم لیتے ہیں چنانچہ وہ زمین کو طبقاتی اور معاشی تناظر میں دیکھنے کے بجائے خالص تخلیقی حوالے سے دیکھتے ہیں اور کلچر کو دھرتی کا اٹوٹ انگ قرار دیتے ہیں کہ اس کی جڑیں دھرتی میں بہت دور تک اتری ہوئی ہیں۔ تاہم وہ کلچر کو کوئی جامد شے تصور نہیں کرتے۔ ان کی کارگہِ فکر میں کلچر ایک متحرک عمل سے وابستہ ہے اور ایک انوکھے انداز میں سفر کرتا ہے۔ سفر سے پہلے وہ اپنی قلبِ ماہیت کرتا ہے۔ اسے وہ ایک مثال کے ذریعے یوں واضح کرتے ہیں کہ جب درختوں پر پھول آتے ہیں تو درخت ان پھولوں کے جوہر کو خوشبو میں منتقل کر کے دُور تک پھیلاتا ہے مگر خوشبو ایسی چیز ہے کہ ہوا کا رُخ بدل جائے اور پیچھے سے خوشبو کی آمد کا سلسلہ رک جائے تو یہ رقیق ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہی حال کلچر کا ہے، وہ خود کو تہذیب میں منتقل کر کے دُور دُور تک پہنچاتا ہے اور ترسیل کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو تہذیب نئی دھرتی کے مزاج کا حصہ بن کر اس میں ضم ہو جاتی ہے۔ اس پیش منظر میں کلچر ایک تخلیقی حیثیت رکھتا ہے جبکہ تہذیب ایک اڑتی ہوئی سی خوشبو ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں کلچر اور تہذیب دراصل انسانی ارتقاء کی دو سطحیں ہیں۔ ایک تخلیقی سطح اور دوسری تقلیدی۔ کلچر کی سطح تموج اور جست کی ہے جبکہ تہذیب کی سطح پھیلاؤ جذب اور تقلید کی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے جہانِ فکر میں جسم بھی زمین کا ایک اہم نمائندہ ہے جسے وہ روح کی زمین کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک روح کے اظہار کے لیے جسم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی حوالے سے ان کے یہاں اجتماعی لاشعور کی تفہیم ایک منفرد انداز میں ہوتی ہے جسے انھوں نے ہمارے "نسلی تجربات" کی دھرتی قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ہمارا اجتماعی لاشعور دراصل ہماری ثقافتی سرزمین ہے جس میں ہماری پوری تاریخ، ہماری تہذیب اور کلچر کے سارے مظاہر مضمر ہیں۔ وہ دھرتی کا نفسیات، فلسفہ، ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی نقطہ نظر سے دھرتی کے اثار کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دھرتی سے بے اعتنائی دراصل اپنی ساری تہذیب اور ثقافت کو مسترد کرنے کے مترادف ہے۔

دھرتی، کلچر اور تہذیب کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ نظریات ادب کی تفہیم میں بے حد کارآمد ہیں کہ ادب کی تفہیم کے لیے زمینی رشتوں کے ثقافتی تناظر کی کارکردگی سے آشنا ہونا بے حد ضروری ہے جن کی جڑیں ہزاروں برس پہلے کی تہذیبوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں وہ لوگ جن کا موقف یہ ہے کہ آج کی پاکستانی تہذیب کا وادی سندھ یعنی موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں سے کوئی علاقہ نہیں وہ دراصل تاریخ اور تہذیب کے اچھے طالب علم نہیں ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا اردو تنقید میں سب سے اہم فکری اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص دائرہ علم میں رہ کر تنقید لکھنے کے بجائے اسے کائنات کی وسعتوں تک پھیلا دیا ہے اس پھیلاؤ میں تمام سماجی اور سائنسی علوم سمٹ آئے ہیں۔ ان کے نزدیک تنقید کو تخلیق کائنات کے عمل سے الگ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ انھوں نے تنقید کو دبستانوں کی قید سے آزاد کر کے اسے تخلیق کائنات اور اس کے ارتقائی مراحل سے جوڑ دیا ہے اور افق پھیلا ہوا ایک نیا منظرنامہ ترتیب دیا ہے۔ وہ شاید پہلے نقاد ہیں جن کی چشم بینا نے فطرت کو ایک اور آن میں مشاہدہ کیا ہے ان کے نزدیک فطرت کے روبرو آنے سے مراد پوری کائنات کے روبرو آنا ہے۔ اس کائنات میں درختوں، پھولوں، پرندوں اور وادیوں کے علاوہ کرۂ ارض، نظامِ شمسی اور لاکھوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی شامل ہیں، جنھیں وہ فطرت کے مظاہر ہی میں شمار کرتے ہیں۔ فطرت کے ان مظاہر سے دلچسپی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی فکر میں ایک حیرت انگیز تموج

پیدا کیا اور انھوں نے خالص سائنس کے براہ راست مطالعے سے یہ حقیقت معلوم کی کہ خالص سائنس جس پرت در پرت اور حجاب اندر حجاب جہان میں محوِ سفر ہے، ادب کا سفر اس سے مختلف نہیں ہے۔ ادب نے جہاں معاشرتی اور سماجی سائنسوں مثلاً فلسفے، نفسیات، عمرانیات اور تاریخ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے وہاں اس کا خالص سائنس کے نظریات سے بھی استفادہ خارج از امکان نہیں ہے۔

خالص سائنس کے حوالے سے طبیعات کے میدان میں ہونے والے جدید سائنسی تجربات ڈاکٹر وزیر آغا کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ یہ تجربات کائنات کی بنیادی اکائی تک پہنچنے کی کوشش ہیں۔ یہی بنیادی اکائی ڈاکٹر وزیر آغا کے نظام فکر میں "امتزاج" کی صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"امتزاج کا یہ عمل طبیعات میں بھی پچھلے ایک سو برس سے جاری ہے۔ طبیعات والے اس کوشش میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کائنات کی چاروں قوتوں کو یکجائی کے عالم میں دیکھ سکیں۔ تا حال وہ ان میں سے تین قوتوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر چوتھی قوت (مراد کشش ثقل) ابھی ان کی گرفت میں نہیں آئی۔ اب پچھلے چند برس سے وہ سپر سٹرنگ (Super string) کی مدد سے اسے زیرِ دام لانے کی کوشش میں ہیں۔"

وحدت کی تلاش کا یہ عمل سب سے پہلے نیوٹن سے آغاز ہوا جس نے اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ کشش جو سیب کو زمین کی طرف گراتی ہے اور وہ کشش جو سیاروں کو سورج کے گرد گھماتی ہے، دراصل ایک ہی چیز ہے۔ اس کے بعد فیراڈے اور میکسویل نے وحدت کا دوسرا کرشمہ دکھایا کہ بجلی اور مقناطیسی قوت دونوں ایک ہی شے ہیں۔ اس تجربے میں دو طرح کی وحدتیں دریافت ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ بجلی کا ایک پارٹیکل لے کر اسے Move کریں تو مقناطیسی قوت پیدا ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر الیکٹریکل پارٹیکل کو ایکسلریٹ کریں تو اس سے حرارت، روشنی اور ریڈی ایشن پیدا ہوتی ہے یہ دوسری وحدت ہے۔ تیسرا معجزہ جو ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کے ساتھیوں پروفیسر گلاشو اور وائن برگ کے ہاتھوں رونما ہوا، نیوکلیئر قوتوں اور بجلی کی قوتوں کی یکتائی کا معجزہ تھا۔ اس سے آگے کے مراحل ابھی باقی ہیں اور چاروں قوتوں کی یکجائی کے تجربات اس وحدت تک پہنچنے کا عمل ہیں جس پر اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے نظام فکر میں ان تجربات کی اہمیت وحدت کے عمل سے اپنی جگہ بناتی ہے۔ ان تجربات کا چوتھا مرحلہ سٹرنگ قوت سے آشنائی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک:

"سٹرنگ شکتی سے آشنا ہونا پراسراریت کو مس کرنا بھی ہے کیونکہ اب وہ اس دیار کی سرحدوں پر آ گئی ہے جہاں کا مختصر ترین جزو یعنی سٹرنگ بجائے خود ایک Closed Loop ہے۔ سائنسی تجربات اس بات کے متقاضی ہیں کہ سٹرنگ محدود یعنی Finite ثابت ہو۔ دوسری طرف مشرقی دانش "محدود" سے آگاہی کو محض ایک مرحلہ تصور کرتی ہے۔ اس سے آگے لامحدود یا "بے انت" ہے جہاں زمان و مکاں کی دوئی معدوم ہو جاتی ہے۔ فن کی صورت یہ ہے کہ اس کا تعلق "محدود" اور "لامحدود" دونوں سے ہے۔ وہ اپنے تخلیقی عمل میں "لامحدود" کو "محدود" میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ایسا کرنا جبھی ممکن ہے کہ متخیلہ کی حرارت بہت زیادہ ہو اتنی زیادہ کہ یہ دونوں باہم آمیز ہو سکیں۔ بالکل جس طرح کائنات کی چاروں قوتیں یکجا ہوں تو تخلیق کار ی کی "پہلی ضرب" کے امکانات روشن ہوتے ہیں یوں دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ تخلیقی عمل کی یکتائی یا امتزاج کی اہمیت کس قدر ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا کے یہاں "امتزاج" کا تصور کتنا پائیدار اور سائنسی اصولوں پر مبنی ہے اس کا اندازہ درج بالا سطور سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ تاہم اسے سمجھنے اور مکمل ادراک کے لیے ذہن رسا کی ضرورت ہے۔ اس نظام فکر کی گہرائی میں اترنے کے لیے دروں بینی اور نگاہ بصیرت زاد کار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا محض طبیعات کے ان جدید نظریات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ اس سے بھی بہت آگے کی بات کرتے ہیں جہاں طبیعات کے یہ جدید نظریات رسائی پانے سے معذور ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"طبیعات نے اس کائنات کو صرف ایک مقام تک ہی کھولا ہے مگر اس مقام کے آگے "ناموجود" کا وہ منطقہ بھی ہے جو خالق کائنات کے لاتعداد ابعاد میں سے ایک بُعد ہے۔"

یہاں میں ڈاکٹر عبدالسلام کے وہ الفاظ درج کرنا چاہوں گا جو انھوں نے گورونانک یونیورسٹی امرتسر کے دسویں سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہے کہ:

"میں بھی ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو اپنے خاص پس منظر کے باعث اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر شے کو سمٹریکل پیدا کیا ہے۔ آپ کی مذہبی اساس اور ماحول کی تربیت سائنس پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسی اثر کے تحت آپ کی تحقیق چیزوں کو وحدت کی طرف لے کر جاتی ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا کے یہاں بھی "امتزاج" کا نظریہ دراصل ان کی مضبوط مذہبی اساس کا رہین احسان ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی فکر مذہب، سائنس اور ادب کی تکون سے تشکیل پاتی ہے تو ان کے فکری نظام کے سارے سلسلے روشن ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"کائنات کو بے نقاب کرنے کے لیے تا حال انسان نے تین تجربے کیے ہیں۔ منطقی تجربہ، عارفانہ تجربہ اور جمالیاتی تجربہ، ایک تجربہ عقل و خرد سے عبارت، یہ دوسرا معرفت ذات سے اور تیسرا تخلیقی عمل سے۔ اس آخری تجربے کے امکانات سے ابھی انسان پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ اسے ابھی اس بات کا کماحقہ احساس نہیں ہے۔ کہ جمالیاتی تجربہ میں عارفانہ تجربہ کی Isness کا رنگ بھی ہے اور منطقی تجربے کے Thatness کا بھی مگر یہ ان آمیزہ نہیں ہے بلکہ ایک الگ وجود رکھتا ہے جس کا کام Isness کو Thatness میں اس طور منتقل کرنا ہے کہ بات "جاننے" اور "کھولنے" سے آگے بڑھ کر "تخلیق کرنے" کے مدار میں آ جائے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ "تخلیق کرنے" کے مدار میں آئے گی تو خالق اور مصنف کی "موجودگی" کا برملا اقرار کرے گی اور یہی اصل بات ہے۔"

❖OOO❖

وزیر آغا اور نئی تنقیدی تھیوری

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

وزیر آغا کی ادبی خدمات کی ایک سے زیادہ جہات ہیں: شاعری، تنقید، انشائیہ نگاری۔ وزیر آغا خود اپنی شاعری کو اوّلیت دیتے تھے جب کہ اردو کے ارباب نظر ان کی تنقید کو۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وزیر آغا خود اپنی تنقید کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں۔ حالاں کہ اصل معاملہ یہ تھا کہ وزیر آغا شاعری (خصوصاً نظم) کو اپنے تخلیقی اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ خیال کرتے تھے اور اس کے مقابلے میں تنقید سمیت کسی بھی دوسری صنف کو لانا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس طور وہ اپنی شاعری اور تنقید کو ایک دوسرے کا نہ تو حریف قرار دیتے تھے، نہ حلیف۔ جب کہ ہمارے یہاں روش عام یہ ہے کہ تخلیقی ادب اور تنقید کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کیا جاتا ہے اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تیر برسائے جاتے اور تیرے بھیجے جاتے ہیں اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ یہ روش دونوں کے حق میں مضر ہے اور دونوں میں ایک ایسا فاصلہ پیدا کرتی ہے جو حقیقتاً موجود ہی نہیں۔ جہاں تک وزیر آغا کا اپنی تنقید کو اپنی شاعری کی حلیف قرار دینے کا قصہ ہے تو عرض ہے کہ انھوں نے حصۂ دوسرے ناقدین کے برعکس اپنی تنقید کو اپنی شاعری کے دفاع کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ہمارے بیش تر نقاد انھی تنقیدی مسائل کو اہمیت دیتے ہیں جن کا گہرا تعلق ان کی اپنی تخلیقات کی مخصوص موضوعاتی، اسلوبی، ہیئتی جہات سے ہوتا ہے۔ حقیقتاً وہ تنقید نہیں لکھتے، اپنی شاعری یا فکشن کی 'اپالوجی' تیار کرتے ہیں۔ وزیر آغا نے 'اپالوجی' نہیں تنقید لکھی ہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ فکشن پر حصۂ د مقالات لکھے؛ اردو نقادوں پر لکھا؛ ادب کے دیگر شعبوں اور کلامیوں کے رشتے پر قلم اٹھایا؛ تنقید کے قدیم، کلاسکی، جدید مابعد جدید، نظری مباحث پر جم کر لکھا اور امتزاجی تنقید کے نام سے اپنا ایک تنقیدی موقف تشکیل دیا۔

وزیر آغا کی تنقید کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں "تجسس اور انحصار" شروع سے آخر تک برقی رَو کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ تجسس نے، ان کی تنقید کو مسلسل مائل بہ ارتقا رکھا اور چند گنے چنے تنقیدی موضوعات کے گلاوے سے آزادی دی، جب کہ انحصار نے ان کی تنقید کو بعض بنیادی نوعیت کے سوالات سے اسی طرح وابستہ رکھا، جس طرح کوئی صحب ادب اپنی ہیئت سے اور پھر اپنے بنیادی ماخذ سے وابستہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں تردید و تضاد کی صورتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور اپنی تہادا موقف کو قائم رکھتے ہوئے آگے اور دیگر اطراف میں بڑھتے چلے جانے کا رویہ نظر آتا ہے۔ ان کی تنقید کے اس امتیاز کو تھیوری پر لکھے ان کے مقالات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ زیر نظر تحریر میں ان کے انھی مقالات کا مطالعہ مقصود ہے۔

وزیر آغا اردو کے ان اوّلین لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے نئی تنقیدی تھیوری پر تفصیل سے لکھا اور نتیجتاً تھیوری زیر بحث آئی۔ یہی نہیں، ان کے تھیوری سے متعلق خیالات نے تھیوری کے مباحث کو مخصوص رخ بھی دیا۔ تھیوری سے متعلق غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کیا اور تھیوری کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہوئے، ثقافتی اور ادبی صورت حال سے اس کے تعلق کی نہج کو بھی اجاگر کیا۔

تنقیدی نظریات کے ضمن میں وزیر آغا نے ایک خاص طریق مطالعہ سے کام لیا ہے۔ وہ ہر تنقیدی نظریے کے اس سیاق کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں، جس میں نظریے کا جنم ہوا اور جس کے تحت وہ نظریہ اپنی موزونیت اور معقولیت باور کراتا ہے۔ اسی ضمن میں وہ ہر تنقیدی نظریے/تھیوری کے ہر بحث کو نہ صرف دیگر نظریات کے متوازی اور متقابل رکھتے ہیں، بلکہ دیگر علوم کی بنیادی بصیرتوں کے تناظر میں بھی زیر مطالعہ نظریے کا محاکمہ بھی کرتے ہیں۔ اس طریق کار کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انھیں تنقیدی نظریات کی تمام چھوٹی بڑی تفاصیل پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وزیر آغا نے نئی تھیوری کے مرکزی اور کلیدی مقدمات اور تعقلات کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر نظریے کی اس بنیادی بصیرت سے سروکار رکھا ہے جو متعلقہ نظریے کے باطن میں مستور ہے اور جو اسے دیگر نظریات سے ممیز کرتی ہے۔ اس باب میں یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی نظریے کی بنیادی بصیرت کا تعین دراصل اس نظریے کی تعبیر ہے۔ چناں چہ ضروری نہیں کہ جسے ایک نقاد کسی نظریے کی بنیادی بصیرت قرار دیتا ہے، دوسرے نقاد بھی اسے، نظریے کی اختصاصی جہت تسلیم کر لیں۔ بنیادی بصیرت کا تعین اس تناظر میں ہوتا ہے، جس کا علم بردار نقاد ہے۔ لہٰذا جب کوئی نقاد کسی نظریے کے اختصاص پر حکم لگاتا ہے تو دراصل خود اپنی آئیڈیالوجیکل جہت بھی آشکار کرتا ہے۔ وزیر آغا کی آئیڈیالوجیکل جہت، سیاسی یا معاشرتی نہیں، فلسفیانہ نوعیت کی ہے۔ وہ بالعموم تنقیدی نظریات کے ان پہلوؤں کو مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں جو زندگی، کائنات اور جمالیات (تخلیقی عمل) کے بھید کی گرہ کشائی نئے ڈھنگ سے کرتے ہوں۔ گزشتہ سطور میں جسے 'انحصار' کہا گیا ہے، وہ انھی سہ گانہ عناصر کے امتزاج سے عبارت ہے جو وزیر آغا کی تنقید میں پیہم رواں ہے۔ انھوں نے ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کا مطالعہ بھی اپنی اسی مخصوص فلسفیانہ جہت سے کیا ہے۔

دوسروں کے برعکس وزیر آغا، ساختیات کو بیسویں صدی کی اجتماعی رَو قرار دیتے ہیں، جس کا مشاہدہ بیسویں صدی کی فلکیات، حیاتیات، فلسفے، لسانیات اور معاشرتی سائنسوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عمرانیات میں درکھیم کے معاشرتی ماحول (Social Milieu) کے نظریے، نفسیات میں فرائیڈ کے لاشعور اور ژونگ کے اجتماعی لاشعور کے نظریات اور لسانیات میں سوسئیور کے لانگ (Langue) کے تصورات میں ساختیات قدر مشترک کے طور پر دکھائی دیتی ہے ___ ظاہر ہے یہاں وزیر آغا نے ساختیات کی تمام چھوٹی بڑی جزئیات کے بجائے اس کے کلیدی تصور (تصور ساخت) کو پیش نظر رکھا ہے۔ ساختیات کا تصور ساخت رشتوں کے نظام سے عبارت ہے، جس میں جز کی اپنی انفرادی حیثیت اور قدر نہیں ہوتی؛ وہ کل کے ساتھ اپنے رشتے کی وجہ سے معنی خیز ہوتا ہے۔ گویا موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں۔ وزیر آغا کے نزدیک اس تصور ساخت کو بعض جزوی تبدیلیوں کے ساتھ طبیعیات، حیاتیات، فلسفے، لسانیات اور بشریات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

وزیر آغا اس سوال کو نظر انداز نہیں کرتے کہ آیا تمام علوم میں بہ یک وقت مذکورہ تصور ساخت پیدا ہوا، اتفاقاً پیدا ہوا یا کسی خاص علمیاتی اصول کے تحت یا پہلے کسی ایک شعبۂ علم میں یہ تصور پیش ہوا اور بعد ازاں دیگر علوم نے اسے قبول کیا؟ ان کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کی معاشرتی سائنسوں نے گو سوسئیور کے لسانی ماڈل سے گہرا اثر قبول کیا ہے، تاہم ساختیاتی فکر کی ابتدا، ان کی رائے میں، جدید طبیعیات سے ہوئی ہے، جب برقی قوت ایجاد ہوئی۔ برق چوں کہ مادہ نہیں، قوت ہے، اس لیے کائنات کے مادی ہونے کا نظریہ چیلنج ہو گیا اور کائنات کو رشتوں کے نظام سے عبارت ایک ساخت کے طور پر قبول کیا جانے لگا۔ وزیر آغا کے مضامین سے یہ اشارہ اکثر ملتا ہے کہ فکری اور علمی منطقوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کا آغاز

طبیعیات کے انکشافات سے ہوا ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ سوشیور کو ساختیاتی لسانی ماڈل پیش کرنے کا خیال طبیعیات کی تھیوری سے آیا تھا اور فرائیڈ اور درکھیم بھی طبیعیاتی انکشافات سے متاثر ہوئے تھے؟ اس سوال کا حتمی جواب ہم نہیں دے سکتے، تاہم اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جب ہم بیسویں صدی کی مجموعی انسانی فکر کا مطالعہ کرتے ہیں تو طبیعیات ہی اس کی پیش رو نظر آتی ہے۔ دوسری طرف وزیر آغا کے یہاں Episteme یا روحِ عصر کی طرز کا بھی تصور موجود ہے، جو مختلف شعبوں میں ہونے والی پیش رفت کے عقب میں کارفرما ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی شعبہ علم کو الگ تھلگ تصور نہیں کرتے: فکری اشتراک کی ایک نادیدہ زنجیر انھیں باہم جوڑے رکھتی ہے۔ وزیر آغا اس زنجیر کا سرا پکڑنے کی سعی کرتے ہیں ___ ساختیات کو اس طور معرضِ تفہیم میں لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں اس سازشی نظریے کی پرچھائیں تک نہیں پڑی جو ہر مغربی نظریے کو سامراجی سازش قرار دیتا ہے اور انسانی فکر و بصیرت کے دروازوں کو بند کرنے کا اقدام کرتا ہے۔

وزیر آغا نے ساختیات کے بنیادی قضیے کو (کہ شے نہیں ساخت اصل ہے اور ساخت ہیئتوں کا نظام ہے) انیسویں صدی کی فکر کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے:

> انیسویں صدی کی فکر مرکز میں، سپرمین میں، فرد میں مرتکز ہو گئی تھی ...... انیسویں صدی نے ایک مصنف، ایک مرکز اور ایک خالق کا پرچم بلند کیا تھا، جب کہ بیسویں صدی نے تناظر کو، پس منظر کو، دیار کو، گہری ساخت اور پیٹرن کو نمایاں کر کے پیش کیا۔
>
> (دستک اس دروازے پر، ص ۱۱۵، ۱۱۶)

اسی طرح وہ ساختیات کی بنیادی بصیرت کو جدید طبیعیات اور تصوف کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں:

> ساختیاتی تنقید نے قرأت کے جس عمل کو اس قدر اہمیت دی ہے، وہ جدید طبیعیات کی رو سے ناظر کی کارکردگی اور تصوف کی رو سے سالک کے طرزِ عمل کے مشابہ ہے۔
>
> (معنی اور تناظر، ص ۹۳)

ساختیات کو اس وسیع علمی، مغربی و مشرقی تناظر میں رکھ کر دیکھنے سے ساختیات کی ایک نئی تعبیر سامنے آئی ہے جو وزیر آغا کے معاصر اردو نقادوں کی ساختیات فہمی سے یکسر مختلف ہے۔ وزیر آغا کی تعبیر کے مطابق ساختیات نہ تو سائنسی فکر سے متصادم ہے اور نہ صوفیانہ فکر سے۔ مگر کیا واقعی؟ جدید طبیعیات (کوانٹم فزکس) میں جسے حقیقت کہا گیا ہے وہ ناظر اور نظارے سے بہ یک وقت عبارت ہے۔ مشاہدہ کرنے والے کا زاویہ، نگاہ، زیرِ مشاہدہ چیز (ذرّے) کی حقیقت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ یہی صورت ساختیات میں قرأت کی ہے۔ متن کی حقیقت، متن اور اس کی قرأت سے بہ یک وقت عبارت ہوتی ہے۔ قرأت ہی متن کے ان معنیاتی سلسلوں کو متحرک کرتی اور انھیں منظرِ عام پر لاتی ہے جن کے بغیر متن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ان دونوں میں تو ناظر اور قاری فعّال کردار ادا کرتے ہیں، مگر کیا تصوف میں بھی سالک فعّال ہوتا ہے یا منفعل؟ صوفیانہ واردات کا تو امکان ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب سالک اپنی ذات، اپنی انا کی نفی کرتا ہے۔ نفی کا یہ عمل سالک کی فعالیت کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے، مگر اس کے بعد وہ جن مقامات و منازل سے گزرتا ہے، ان کا انکشاف سالک کی عدم فعالیت یا ترکِ ذات کے بغیر ممکن نہیں۔ بیدل نے کہا ہے:

> حسن یکتائی و آغوشِ دوئی وہم است وہم
>
> تا تو از آئینہ ی یابی اثر دیدار نیست

تاہم وزیر آغا کے خیالات سے ساختیات و تصوف کے بعض اشتراکات کو سمجھنے کی تحریک ضرور ملتی ہے۔ مثلاً ہر صوفیانہ واردات میں جو تمثالیں، شکلیں، صورتیں، شخصیات اور ان کی صفات جلوہ آرا ہوتی ہیں، وہ صوفی کے ثقافتی پس منظر سے منسلک ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہندو رشی کے صوفیانہ تجربے کی حاکم رامائن، عیسائی راہب کی صوفیانہ واردات کی حاکم بائبل اور مسلمان صوفی کے صوفیانہ تجربے کا حاکم قرآن ہوتا ہے۔ ان مذہبی متون کی صوفیانہ تعبیریں ہی ان تمام ہیئتوں اور صورتوں کی تشکیل کرتی ہیں، جن کے تحت اور اندر صوفیانہ تجربات واقع ہوتے ہیں۔ صوفیانہ تجربے کی یہ وضاحت بجائے خود ساختیاتی ہے ___ بہ ہر کیف وزیر آغا نے ساختیات کی ایک ایسی تعبیر ضرور پیش کی، جو اس تنقیدی کتب کی عمومی تعبیروں سے خاصی مختلف اور بعض صورتوں میں ممتاز ہے۔ مثلاً اکثر اردو نقادوں نے ساختیات کے یہ اوصاف گنوائے ہیں:

> ساختیات، موضوع کی نفی کرتی ہے؛ مرکزیت کی مخالف ہے؛ سریت اور ماورائیت کو مسترد کرتی ہے؛ مصنف کی جگہ شعریات کو قابلِ اعتنا سمجھتی ہے۔

جب کہ وزیر آغا کی رائے میں ساختیات نے موضوع، مصنف، مرکز اور پراسراریت کو بے دخل نہیں کیا، صرف دبایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا استدلال ہے کہ ساختیات اصلاً Pattern-Oriented ہے (انیسویں صدی میں ساخت کو Centre-Oriented سمجھا گیا تھا) جس میں کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا، مگر مرکز کی نفی بھی نہیں ہوتی، مرکز پورے پیٹرن میں پھیل جاتا ہے۔ مرکز کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ساخت کا کوئی نکتہ/جز بنیادی اور Referential ہے، جب کہ دوسرے نکات ثانوی ہیں۔ یعنی تمام دوسرے نکات اس بنیادی نکتے کے حوالے سے اپنی معنویت متعین کرتے ہیں۔ مرکز کو اقتداری حیثیت حاصل ہے اور باقی سب اس پر منحصر ہیں، مگر مرکز کے پیٹرن میں پھیل جانے کا مطلب یہ ہے کہ ساخت میں کسی ایک عنصر، جز یا نکتے کو اقتداری حیثیت حاصل نہیں، تمام نکات یکساں اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ ساخت کا ہر نکتہ دیگر نکات کے ساتھ رشتے کی وجہ سے اپنی معنویت اور قدر متعین کرتا ہے۔ نیز ساخت کی مجموعی معنویت کے تعین میں تمام نکات کا کردار یکساں ہے۔ وزیر آغا اسی بات کی مزید وضاحت اس طبیعیات کے بوٹ سٹریپ نظریے کی مثال دیتے ہیں، جس کے مطابق کائنات ربطِ باہم (Inter-Reletedness) سے عبارت ایک متحرک جال (Web) کی صورت ہے۔ اس جال کے کسی بھی حصے کی صفات بنیادی نہیں اور یہ جال کے دیگر حصوں سے مشروط ہیں۔ وہ یہاں سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا یہ اس پراسراریت کا حامل نہیں جسے ساختیاتی فکر نے، مرکز، مصنف، Cogito اور ماورائی مدلول کے ساتھ ہی مسترد کر دیا تھا؟ وزیر آغا کے خیال میں مرکز شعریات میں منقلب ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ یعنی اب مرکز ایک متحرک ساخت ہے۔ تاہم اس میں وہی پراسراریت ہے جو مرکز سے منسوب چلی آتی ہے۔

وزیر آغا کی تنقید میں پراسراریت کا لفظ ان قارئین کے لیے چکرا دینے والا ہے، جو تنقید میں قطعیت چاہتے ہیں۔ وزیر آغا کے یہاں یہ لفظ ایک باقاعدہ تنقیدی تصور یا ادبی اصطلاح کے طور پر ظاہر نہیں ہوا۔ انھوں نے اسے "خود توضیحی" لفظ کے طور پر برتا ہے اور یہ وزیر آغا کے تخلیقی عمل کے تصور کی ایک لازمی جہت کے اشاریے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ان کے نزدیک تخلیقی عمل کسی سیاسی نظریے، آئیڈیالوجی، معاشرتی اصلاحی ایجنڈے، سامنے کی مبیّن حقیقت، عمومی تجربے یا شعورِ عامہ کی ترجمانی پر مامور نہیں؛ تخلیقی عمل ایک ایسے جہان کو مَس کرنے کا وسیلہ ہے، جس میں حیرت، بھید، اسرار ہے اور جو عالم تمام اشیا اور مظاہر کے عقب میں ایک بنیادی، ازلی قوت کے طور پر موجود ہے۔ یہ جہان انسان کے باطن میں بھی ہے اور اس جہان کی اسراریت اس کائنات میں بھی ہے، مگر اس تک رسائی تخلیقی عمل کے ذریعے ممکن ہے۔ ان کی تنقید میں تصوف کا بار بار ذکر بھی اسی تناظر میں ہوا ہے کہ تصوف اور تخلیقی عمل دونوں اسرار تک پہنچتے ہیں۔ تاہم وزیر آغا صوفی اور شاعر میں فرق کرتے ہیں۔ صوفی اسرار میں تحلیل ہونا پسند کرتا ہے اور شاعر اسرار سے خود کو اور لفظ کو جلا دینا چاہتا ہے اور واپس آنا چاہتا ہے ___ چناں چہ شعریات میں منقلب ہونے والے مرکز میں وزیر آغا جس پراسراریت کی بات کرتے ہیں، وہ حیرت اور بھید ہے جو تجزیے سے ماورا ہے۔

وزیر آغا نے شعریات کو مرکز قرار دیا ہے، مگر ایسا مرکز جو شعریات کے تمام اجزا میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے ہی وہ لامرکزیت کی حامل مرکزیت قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم ایک لمحے کے لیے مرکز سے مراد مصنف لیں تو وزیر آغا کی توجیہ کے مطابق مصنف اس شعریات میں سرایت کر گیا ہے جو ثقافتی رسمیات اور ضابطوں سے عبارت ہے۔ گویا مصنف، متن کے مرکز میں نہیں، متن کے پورے معنیاتی نظام میں منتشر ہو گیا ہے۔ اسی لیے وزیر آغا نے متن سے مصنف کی کامل نفی کے

تصور کو قبول نہیں کیا، تاہم ادبی متن کے معانی کی دریافت میں مصنف اور اس کے منشا کو فاعلی قوت بھی تسلیم نہیں کیا۔

وزیر آغا نے ساختیات کے فلسفیانہ مضمرات پر بہ طور خاص توجہ دی ہے اور اسے مغربی فکر کے طور پر نہیں، اس انسانی فکر کے طور پر سمجھا ہے، جس پر کسی خاص خطے کو سیاسی، ثقافتی اجارہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ساختیات کی ادبی و تنقیدی معنویت طے کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف ساختیاتی تنقید کے عمل نمونے پیش کیے (عصمت چغتائی اور منٹو کے نسوانی کرداروں کا مطالعہ) بلکہ اس کتب کے اطلاقی فریم ورک کا تنقیدی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کہیں بھی اس نظریے کے شارح نہیں بنے۔ وہ اسے وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھتے اور اس کے اطلاقی امکانات کا تنقیدی جائزہ لیتے اور اس کے حدود متعین کرتے ہیں۔

> میرا تاثر یہ ہے کہ ساختیاتی تنقید حرفِ آخر نہیں......
> ساختیاتی تنقید کی اہمیت ایک تو اس اعتبار سے بنتی ہے کہ اس نے نئی تنقید کی جبریت کو توڑا، دوسرے اس اعتبار سے کہ اس نے نہ صرف مارکسی نظریے کے اثرات قبول کیے بلکہ مارکسی تنقید پر اپنے اثرات بھی مرتسم کیے، تیسرے اس نے ساخت شکن اور نسوانی تنقید کو ایک ایسے عمل پر مجبور کیا جس سے خود ساختیاتی تنقید کی توسیع ہو گئی۔
>
> (معنی اور تناظر، ص ۹۲، ۹۳)

گویا وزیر آغا کے نزدیک ساختیاتی تنقید حرفِ آخر نہیں تو حرفِ غلط بھی نہیں۔ تنقید ہی پر موقوف نہیں، انسانی فکر کا کوئی پڑاؤ، کوئی علم، اس علم کا کوئی نظریہ حتمی نہیں ہوتا۔ دیکھنے والی بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی نظریہ اپنے حدود میں کیا امکانات رکھتا ہے؟ ساختیات نے اس تنقیدی فکر کو آگے بڑھایا جو نئی تنقید (جس کا دوسرا نام امریکی ہیئت پسندی ہے) پر آ کر رک سی گئی تھی۔ نئی تنقید ادب پارے کو خود مختار اور خود مکتفی قرار دیتی تھی، اس کے ہیئتی ترکیبی عناصر کا تجزیہ کرتی تھی اور ادب پارے کے سماجی اور ثقافتی علائق سے بیگانہ محض رہتی تھی۔ ساختیات نے ادب کی خود مختاریت کے اس تصور کو چیلنج کیا اور واضح کیا کہ ادب، ثقافتی نشانیاتی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ یعنی ادب خود پر، اپنی ہیئت پر منحصر نہیں، ہیئت کو ادب نے خود اپنے بطن سے نہیں جنم دیا، ثقافت سے اخذ کیا ہے، اس لیے ادب ثقافت پہ منحصر ہے۔ جسے ہم ادب کی شعریات کہتے ہیں وہ ثقافتی رسمیات سے ترتیب پاتی ہے۔ شعریات اور ثقافت کا یہی وہ رشتہ ہے جو ساختیات کو مارکسیت سے منسلک کرتا ہے، مگر جس سے اردو کے مارکسی نقاد اب تک بے خبر ہیں۔ مغرب کے تمام نو مارکسی نقاد (التھیوسے، ماشرے، ٹیری ایگلٹن، فریڈرک جیمی سن اور دوسرے) ساختیات و مارکسیت کے باہم ربط سے آگاہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساختیات جب متن کو رشتوں کے ایک ایسے نظام سے عبارت قرار دیتی ہے، جس میں کسی ایک جز کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ ہر چیز کی قدر اور معنویت دیگر اجزا کے ساتھ رشتے کی مرہون ہے ___ تو مارکسیت کو سماج کے مطالعے کے لیے ایک نئی بصیرت فراہم کرتی ہے۔ مارکسیت بھی سماجی اکائیوں کو ایک دوسرے پر منحصر سمجھتی ہے، مگر مرکزی اور اقتداری حیثیت معیشت اور ذرائع پیداوار کو دیتی ہے۔ ساختیات، مارکسیت کو یہ اصول فراہم کرتی ہے کہ سماج میں اقتداری حیثیت معیشت کو نہیں، سماج کے تمام شعبے، سیاست، معیشت، مذہب، ادب، قانون، ثقافت، اقدار ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ سب میں اثر انداز ہونے اور اثر پذیر ہونے کی صلاحیت ہے۔ اصل شے مرکز نہیں، رشتوں کا نظام ہے۔ اس طور دیکھیں تو ساختیات، مارکسیت کو مطالعے کا ایک نیا تناظر فراہم کرتی ہے، جس میں ادب کے اس سادہ مارکسی تصور پر نظر ثانی کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے کہ ادب طبقاتی جدلیات کا آئینہ دار ہے۔ آخر سماج میں طبقات کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے! خیر یہ چند باتیں تو بر سبیل تذکرہ آ گئیں، لیکن ان کی تحریک وزیر آغا کے اس نکتے سے ہوئی کہ ساختیات نے مارکسی تنقید پر اثرات مرتب کیے ___ وزیر آغا ساختیاتی تنقید کے حدود کے بیان میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ساختیاتی تنقید کی سائنسی روش کے غیر معتدلانہ اطلاق سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ساختیات میں ادبی متن کے جمالیاتی پہلو پر توجہ نہیں ملتی۔ وزیر آغا کی رائے ہے کہ متن کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کر کے متن کی معنی آفرینی کے عمل کا تجزیہ، ایک میکانکی عمل ہے۔ وزیر آغا کے نزدیک ذوقِ نظر ہی وہ میزان ہے جس میں ادبی متن کو اولاً تولا جانا چاہیے اور جو تنقیدی نظریہ اس میزان کی موجودگی یا اہمیت کا منکر ہو وہ محدود ہے۔ مگر کیا یہ 'محدودیت' فقط ساختیاتی تنقید سے مخصوص ہے؟ نفسیاتی، عمرانی، مارکسی، تانیثی، مابعد نو آبادیاتی تنقیدی دبستانوں میں بھی تو ادبی متن کی جمالیات سے روگردانی موجود ہے۔ وزیر آغا نے یہ بجا کہا ہے کہ کسی بھی تنقیدی نظریے کی روشنی میں متن کے تجزیے سے پہلے، متن کو ذوقِ نظر کی میزان میں تولنا چاہیے۔ یعنی تجزیہ، متن کے ادبی مرتبے کا تعین نہیں کرتا، نقاد تجزیے سے پہلے کرتا ہے۔ تاہم اگر ساختیاتی تنقید کے تمام مضمرات پر نظر کی جائے تو اس میں ادب پارے کی جمالیات تک رسائی کا طریقہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ساختیاتی تنقید، متن کی شعریات، یعنی معنی آفرینی کا نظام دریافت کرتی ہے۔ شعریات، رسمیات اور ضابطوں کا نظام ہے۔ جمالیات بھی ایک ضابطہ ہو سکتی ہے، جو ادبی متن کے معانی کی آفرینش میں حصہ لیتا ہے۔ آخر جمالیاتی تصورات یا تحسین کے معیارات بھی تو ثقافتی ہوتے ہیں۔

ساختیات کے علاوہ مابعد جدیدیت کا مطالعہ بھی وزیر آغا نے اس مخصوص طرزِ فکر سے کیا ہے اور مابعد جدیدیت سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کے معاصرین کی فکر سے مختلف ہیں۔ یہ ایک دل چسپ اور بحث انگیز پہلو ہے کہ ساختیات کے ضمن میں وزیر آغا مغربی فکر اور مغربی تہذیب کا ذکر نہیں کرتے، مگر مابعد جدیدیت کے ساتھ وہ ان دونوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ گو یہ تذکرہ، تذکرہ ہی ہے، مابعد جدیدیت سے متعلق ان کے ڈسکورس کا مرکزی مبحث نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مابعد جدیدیت بہ یک وقت تھیوری اور صورتِ حال ہے۔ تھیوری میں زیادہ تر پس ساختیاتی فکر شامل ہے، جب کہ مابعد جدیدیت جس صورتِ حال سے وابستہ ہے، وہ معاصر مغربی سائنسی، ثقافتی صورتِ حال ہے۔ وزیر آغا تسلیم کرتے ہیں کہ "مابعد جدیدیت مغرب کی سائیکی کی پیداوار ہے جو مشرق کی سائیکی سے ایک الگ اور جدا امزاج رکھتی ہے۔" اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "اردو میں مابعد جدیدیت کے اس خاص مزاج کے فروغ پانے کے امکانات بہت کم ہیں جو مغرب میں پیدا ہوا ہے۔" (معنی اور تناظر، ص ۲۲۱) یہاں ان کا واضح اشارہ معاصر مغربی سائنسی ثقافت کی طرف ہے، جسے لیوتار پوسٹ ماڈرن کنڈیشن کا نام دیتا ہے اور جو مابعد صنعتی عہد کی صورتِ حال ہے۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں ابھی صنعتی عہد ہی رونما نہ ہوا ہو، وہاں مابعد صنعتی عہد کی صورتِ حال کیوں کر ظاہر ہو سکتی ہے۔ اسی وضع کی دلیل مابعد جدیدیت کے دیگر معترضین کی بھی ہوتی ہے، مگر ان کے یہاں یہ دلیل مابعد جدیدیت کو کلی طور پر مسترد کرنے کے لیے لائی جاتی ہے، جب کہ اصلاً یہ دلیل مابعد جدیدیت سے معقولیت کے ساتھ استفادے کو ممکن بناتی ہے۔ وزیر آغا مغرب اور مشرق کے ثقافتی فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے مابعد جدیدیت سے استفادے کے حق میں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ مابعد جدید صورتِ حال کے بجائے مابعد جدید فکر کی تفہیم اور اس سے ربط ضبط قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

وزیر آغا نے مابعد جدیدیت پر جس زاویے سے نظر ڈالی ہے، ان کے اردو معاصرین میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ وزیر آغا مابعد جدیدیت کو جدیدیت کا نہیں، فوق جدیدیت/ہائی ماڈرن ازم کا ردِ عمل قرار دیتے ہیں، جب کہ ان کے معاصرین، مابعد جدیدیت کو جدیدیت کی ضد کہنے پر مصر ہیں۔ وزیر آغا مابعد جدیدیت کو بیسویں صدی کی تنقیدی فکر کی تمام کڑیوں کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں:

> نئی تنقید نے معنی کی کثرت پر زور دیا، ساختیات نے کثیر معانی کی پیدائش کی سرچشتی پر غور کیا، جب کہ ساخت شکنی نے معانی کی absence پر زور دیا اور absence کا یہ تصور دراصل مرکزیت، منطق، سماجی شیرازہ بندی اور قدروں کی موجودگی پر خطِ تنسیخ کھینچنے کا تصور تھا۔ لہٰذا جب مابعد جدیدیت کا ذکر آئے تو ہمیں اسے جدیدیت کا مدِ مقابل قرار دینے کے بجائے ہائی ماڈرن ازم کا ردِ عمل قرار دینا چاہیے۔
>
> (معنی اور تناظر، ص ۲۱۵)

وزیر آغا ساختیات کو ہائی ماڈرن ازم کہتے ہیں اور اسے

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں، اس لیے ان کے خیال میں مابعد جدیدیت نے جدیدیت کو نہیں، ساختیات یا ہائی ماڈرن ازم کو بے دخل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ساختیات یا ہائی ماڈرن ازم کا جدیدیت سے کیا تعلق ہے؟ ہم جانتے ہیں، جدیدیت کی نمایندگی نئی تنقید نے کی اور نئی تنقید کو ساختیات نے غیر موثر کیا، تو کہا جا سکتا ہے کہ ساختیات نے جدیدیت کو اور ساختیات کو مابعد جدیدیت نے بے دخل کیا۔ ویسے سطح پر تو نظریات میں ایک کش مکش نظر آتی ہے، مگر دوسری طرف یہ نظریات دراصل تھیوری کے مظاہر ہیں، اس لیے ان میں اگر افتراقات ہیں تو اشتراکات بھی موجود ہیں۔ چناں چہ وزیر آغا، تھیوری کے وسیع منظرنامے کو پیش نظر رکھنے کی تجویز دیتے ہیں؛ ان کے مابین افتراقات ابھارنے سے زیادہ اشتراکات دریافت کرنے کے حق میں ہیں اور یہی ان کے امتزاجی موقف کا تقاضا ہے:

> مابعد جدیدیت کے دور کو ایک وسیع منظرنامے کی صورت میں دیکھنا چاہیے جس میں جدیدیت، ہائی ماڈرن ازم، ساخت شکنی اور دوسرے نظریوں نے مل جل کر ایک ایسی ادبی تھیوری کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو امتزاج پر منتج ہو رہی ہے۔
>
> (معنی اور تناظر، ص ۲۲۰)

وزیر آغا کا یہ امتزاجی موقف، بہ ظاہر تھیوری سے متعلق ان کی بعض آرا سے ٹکراتا ہے: اگر ساختیات نے جدیدیت (نئی تنقید) کو اور مابعد جدیدیت نے فوق جدیدیت (ساختیات) کو بے دخل کیا تو پھر ان سب کو ایک منظرنامے کی صورت کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے؟ تاہم وزیر آغا کی دیگر تحریریں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'تھیوری' کو اب تک کے تمام تنقیدی نظریات کو محتوی خیال کرتے ہیں۔ نظریات ایک دوسرے سے آویزش و تصادم کا رشتہ رکھتے ہیں جو دراصل متن کے مطالعے میں ان کی اختیار کردہ حکمت عملی کے فرق کا نتیجہ ہے، مگر یہ تمام نظریات "میٹا تھیوری" کا حصہ ہیں، جسے ہم مختلف ناموں سے قدیم ہندوستان اور یونان سے لے کر تاریخ کے مختلف ادوار میں دیکھتے ہیں اور جس کی مدد سے کائنات کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کی کوشش ہوئی ہے۔ یہ تھیوری، عمومی اور ابدی جستجوے انسانی ہی کا حصہ ہے، کوئی نیا اور اچانک وقوع پذیر ہونے والا مغربی مظہر نہیں۔ ہمارے یہاں جن لوگوں نے اسے گذشتہ چار دہائیوں کا منفرد مغربی مظہر قرار دیا ہے اور اسے قدیم سے چلی آ رہی تنقیدی فکر سے کاٹ کر دیکھا ہے، انھوں نے اس کے متعلق بہت گرد اڑائی ہے۔ اس کے تعقلات کا جم کر مطالعہ کرنے اور اس سے اتفاق و اختلاف کی صورتیں پیدا کرنے کے بجائے اسے مسترد مسترد کیا ہے۔ خیر یہاں تک بھی کوئی قباحت نہیں تھی، اگر وہ نئی تھیوری کو مسترد کر کے، اس کا متبادل بھی پیش کرتے اور اہل نظر کو دکھاتے کہ اس طرح کہتے ہیں سخنور سہرا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ معاصر تھیوری پر تو تبرا بھیجتے ہیں، مگر اپنے مطالعات میں جن اصولوں کو راہنما بناتے ہیں وہ "قبل نئی تھیوری" کے مغربی تنقیدی اصول ہوتے ہیں۔ ان کے لیے جارج لوکاچ، کاڈویل، آرنلڈ، ایلیٹ، لائنل ٹرلنگ، رچرڈز، لیوس، کلینتھ بروکس، ومساٹ، کروچے اور ان سے بھی پہلے کے مغربی نقاد قابلِ احترام اور قابلِ تقلید ہیں مگر بارت، دریدا، فوکو، آلتھوسے، ژولیا کریسٹوا، ورارڈ ہیٹ وغیرہ صرف نظر کیے جانے کے قابل ہیں، جنھوں نے اپنے پہلوں سے آگے کی باتیں کی ہیں۔ ٹیری ایگلٹن اور سعید کا نام بھی اس لیے لیتے ہیں کہ وہ سیاسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، حالاں کہ ان کی فکر پر دریدا، آلتھوسے اور فوکو جیسے نئی تھیوری کے بنیاد گزار مفکرین کے گہرے اثرات ہیں۔ اس تناظر میں وزیر آغا نے نئی تھیوری سے متعلق اڑائی گئی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

نئے تنقیدی نظریات کی ناگزیریت کا گہرا احساس رکھنے کے باوجود، وزیر آغا ان کے پرجوش شارح کا منصب قبول نہیں کرتے، وہ ان کے متوازن نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ تھیوری کی نئی بصیرتوں کا کھلے بازوؤں سے خیر مقدم کرتے ہیں، مگر جہاں کہیں یہ بصیرتیں فن کی بنیادی اقدار سے چشم پوشی کرتی ہیں، وہاں انھیں تھیوری کو ہدف تنقید بنانے میں تامل نہیں ہوتا۔ مثلاً مصنف سے صرف نظر کرنے کے سلسلے میں وزیر آغا نے تھیوری پر تنقید کی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ تھیوری نے قاری کی اہمیت کو تو بجا طور پر باور کرایا ہے اور اسے تنقید میں ایک نئے بعد کا اضافہ قرار دیا ہے، مگر کیا قاری کو مصنف کی مسند پر بٹھایا جا سکتا ہے؟ وزیر آغا اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔ تھیوری اور خاص طور پر ساختیات نے متن کو مصنف کے بجائے ثقافتی ضابطوں اور رسمیات سے عبارت شعریات کی پیداوار تسلیم کیا ہے اور مصنف کو محض ذریعہ کیا ہے۔ ایک منفعل ذریعہ، متن کی تشکیل میں جس کا کوئی کلیدی کردار نہیں۔ وزیر آغا کی دلیل ہے کہ:

> متن مصنف کے بغیر کسی طرح وجود میں نہیں آ سکتا کیوں کہ شعریات کے دھاگے کو سوئی کے سوراخ میں سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے، مگر کیا مصنف کی حیثیت محض ایک عام سی سوئی کے سوراخ کی ہے؟ دل چسپ بات یہ ہے کہ مصنف سوئی کا ایسا سوراخ ہے جس میں سے شعریات کا دھاگہ جب گزرتا ہے تو منقلب ہو کر متن میں تبدیل ہو جاتا ہے......
>
> (معنی اور تناظر، ص ۲۰۰)

وزیر آغا کا مقصود غالباً یہ ہے کہ شعریات یا ثقافت کے ضوابط اور رسمیات تک دست رس تو سب کو ہے، مگر اسے متن کا درجہ مصنف کی وجہ سے ملتا ہے۔ ایک غیر تخلیقی کار، شعریات کی باز آفرینی یا ترجمانی تو کر سکتا ہے، اسے منقلب نہیں کر سکتا اور شعریات منقلب نہ ہو تو وہ ادبی متن نہیں۔ لہٰذا جو ہستی یہ کارنامہ سرانجام دیتی ہے، اسے کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے!__ دراصل وزیر آغا اس عمومی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ متن کی تخلیق میں مصنف کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہوتا، وگرنہ وہ تھیوری کے اس سیاق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، جس میں مصنف کی موت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سیاق میں مصنف، متن کی قرأت میں رکاوٹ بنتا ہے۔ بارت نے جب مصنف کی مرگ کا اعلان کیا تھا تو درحقیقت یہ کہا تھا کہ متن کی تفہیم میں مصنف حتمی اور بنیادی ماخذ (ریفرنس) نہیں، اگر ہم مصنف کو حتمی ریفرنس تسلیم کریں تو متن کی کثیرالجہاتی تنقیدی قرأت ناممکن ہو جائے۔ مصنف کا منشا، متن کو محض ایک معنی کا پابند بنا دے گا اور یہ متن کے استحصال، متن کی علامتی فطرت کو مسخ کرنے کی صورت ہوگی۔ وزیر آغا، بارت کی طرح ایک متوازن موقف کو سنسنی خیز پیرائے میں پیش نہیں کرتے مگر یہ رائے ضرور دیتے ہیں کہ متن کا مطالعہ، متن، قاری اور مصنف کے ایک ایسے رشتے کا مرہون ہے، جس میں کسی ایک کو دوسروں پر برتری حاصل ہے نہ ایک، دوسرے کو بے دخل اور غیر موثر کرتا ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کا دست و بازو بنتے ہیں اور اس کے نتیجے میں متن سے جن معانی کو دریافت کیا جاتا ہے وہ مصنف کے منشا یا مصنف کے سوانحی کوائف کے علامتی ترجمان نہیں ہوتے۔ اس امر کی عملی مثال وزیر آغا کی غالب کے شعر (آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں / غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے) کی پس ساختیاتی کی قرأت ہے، جس میں کہیں بھی غالب بہ طور شخص یا بہ طور شاعر بنیادی ریفرنس نہیں۔ شعر کو دریدا کے تحریر اول اور تقریر ثانی کے تصور کی روشنی میں معروضی تجزیے میں لایا گیا ہے اور نہایت بصیرت افروز نکات ابھارے گئے ہیں!

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وزیر آغا کی زمین میں غزل

کس کے بدن کی باس ہے کلی فضا سے پوچھ
"خوشبو کے کتنے رنگ ہیں موجِ ہَوا سے پوچھ"

اس کار زار زیست میں کیا کیا نہیں لٹا
کچھ ابتدا سے پوچھ تو کچھ انتہا سے پوچھ

طوفاں کا سامنا بھی ہے موجوں کا شور بھی
کیسے بچے گی ناؤ اب یہ نا خدا سے پوچھ

ڈھونڈا نہیں ہے میں تجھے کون   سی جگہ
چل میری بات چھوڑ تو ارض و سما سے پوچھ

میں نے تو منزلوں کے نشاں دے دیے تجھیں
اب راستے کی بات کسی رہنما سے پوچھ

آیا تو ہوں میں در پہ ترے مانگنے تجھے
پہنچا ہوں کس طرح سے یہ میری انا سے پوچھ

ارشد تمہارا مسئلہ سمجھا نہیں کوئی
اب پوچھنا ہے جو بھی وہ اپنے خدا سے پوچھ

ارشد محمود ارشد

ڈاکٹر وزیر آغا کا مطالعۂ طبعیات

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

مروِن منسکی کے بقول "اگر آپ کسی چیز کو صرف ایک رخ سے جانتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ آپ اس چیز کو بالکل نہیں جانتے۔" شاید اس لیے آج کے دور میں علم کے کسی ایک شعبے میں تخصص کی نسبت بین العلومی مطالعہ زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ بین العلومی مطالعہ سے نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی، اور سوچ میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ یہ علمی ہمہ جہتی سوچ کو توازن عطا کرتی ہے۔ مطالعاتی سفر میں علمی ہمہ جہتی، اور تیقن کی منزل تشکیک اور تجسس کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد آتی ہے۔ فکری ارتقاء کا یہ سفر استخراجی فکر سے استقرائی فکر تک جاری رہتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا فکر و دانش کی ایسی نمایاں شخصیت تھے جنہوں نے مختلف علوم بالخصوص عمرانیات، فلکیات، حیاتیات طبعیات، ما بعد الطبعیات، لسانیات، ادبیات، فلکیات، تصوف اور نفسیات کے علاوہ اساطیر کے مطالعہ کو اپنا مرکز و محور بنایا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطالعاتی سفر کے حوالے سے رفیق سندیلوی نے لکھا ہے:

"ادب کی احتراجی کائنات کی تفہیم کے سلسلے میں جدید سائنسی نظریات سے وزیر آغا کی دلچسپی کا آغاز علم فلکیات کے مطالعہ سے ہوا۔ پر وہ حیاتیات کی طرف مائل بہ توجہ ہوئے اور Mutation theory کا مطالعہ کیا۔ رابعہ جیری کے BICAMERAL MIND کے انکشافات نے انہیں دماغ کی ساخت کا فہم عطا کیا۔ اور وہ پرانے اور نئے دماغ کی کارکردگی سے واقف ہوئے کیپرا اور گیری ذوکاف کی تحریروں میں انہیں کوانٹم تھیوری کی طرف راغب کیا۔ اور انہیں علم ہوا کہ حقیقت کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک وقت میں یا partical کو مشاہدے میں لایا جا سکتا۔ یا wave کو۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقت کا حاضر اور غائب یعنی پارٹیکل اور ویو دونوں یکجا ہیں۔ کوانٹم مکینکس کے مطابق موج اور ذرہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ذرہ موج کا اور موج ذرہ کا طرز عمل اختیار کر سکتی ہے۔ ذرہ ٹھہراؤ یا Position کے عالم میں ہو تو پارٹیکل ہے۔ حرکت یا Motion کے عالم میں ہو تو موج ہے۔ تھیج نظریے کے زمان و مکان کی دس الابعادی سطحوں کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ جن میں سے تین یعنی طول، عرض اور گہرائی کو ابتدا میں آزادی مل گئی تھی انہیں آزاد والابعاد کے حوالے سے برقی مقناطیسی توانائی، مضبوط نیوکلیئر توانائی اور کمزور نیوکلیئر توانائی کی وحدت پیمائی عمل میں آ چکی ہے۔ لیکن تا حال تجاذب یا کشش ثقل یعنی Gravity کے ساتھ اس کی یکجائی نہیں ہو سکتی۔ اس پر غور و خوض جاری ہے۔ بہر کیف طبعیات، سپر سٹرنگ، تھیوری کی مدد سے اس گلّے کو قابل فہم بنانے کا قصد کیے ہوئے ہے اور تمام اشیاء کی وحدانیت یعنی Theory of every thing کا راز پانا چاہتی ہے۔

وزیر آغا کے نزدیک طبعیات جس پر اسرار دیار میں جھانکنے کی متمنی ہے۔ عملی تجربات ابھی اس تک نہیں پہنچ سکے اصلاً وزیر آغا نے بالواسطہ انداز میں طبعیات کی احتراجی روش اور اس کی معذوریوں کو زبان ادب اور تصوف پر منطبق کر کے تفہیم حقیقت کے لیے راستہ ہموار کیا۔ ("ڈاکٹر وزیر کی شخصیت اور فن" ص 111–112)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اوراق کے اداریوں کے بعنوان "پہلا ورق" میں بھی بارہا طبعیات کے نظریات پر اظہار خیال کیا اور نظریات کا ادب پر انطباق کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی تعلیم پس منظر نہ رکھنے کے باوجود اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہے تاہم ان سے کہیں کہیں فروگزاشتیں بھی ہوئیں۔

بالعموم حیاتیات اور بالخصوص طبعیات کے حقائق کے مربوط اور مرتکز مطالعہ کے ثمرات ان کی تنقیدات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے جدید سماجی اور سائنسی علوم کے احتراج اور انضمام سے اپنا تنقیدی نظام وضع کیا جسے انہوں نے بجا طور پر احتراجی تنقید کے نام سے موسوم کیا۔ یہ تنقیدی روش اُن کے بین العلومی مطالعے کی دین ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مضطرب، تجسس، اور متحرک ذہن نے انہیں کسی ایک علم کے مطالعہ تک محدود نہیں رہنے دیا وہ اپنی علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے مختلف علوم کے غائر مطالعہ کی طرف مائل ہوئے تو اس مطالعہ کے دوران علم طبعیات ان کے مطالعہ کا خصوصی محور بنا۔ انہوں نے اس کی ماہیت، ہیئت اور وسعت کا احاطہ کرنے کا فہم حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ "ڈاکٹر عبد الکریم خالد" نے ان کے اس مطالعاتی رخ کا اعتراف اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "انہوں نے خالص سائنس کے براہ راست مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم کرنے کی خالص سائنس جس پرت در پرت اور حجاب اندر حجاب جہان میں محو سفر ہے۔ ادب کا سفر اس سے مختلف نہیں۔ ادب نے جہاں معاشرتی اور سماجی سائنسوں میں مثلاً فلسفے، نفسیات، عمرانیات اور تاریخ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے وہاں اس کا خالص سائنس کے نظریات سے بھی استفادہ خارج از امکان نہیں ہے۔ خالص سائنس کے حوالے سے طبعیات کے میدان میں ہونے والے جدید سائنسی تجربات ڈاکٹر وزیر آغا کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں یہ تجربات کائنات کی بنیادی اکائی تک پہنچنے کی کوشش ہیں۔ یہی بنیادی اکائی ڈاکٹر وزیر آغا کے نظام میں امتیاز کی صورت اختیار کرتی ہے" ("ڈاکٹر وزیر آغا کی فکر کا جہانِ نو" مطبوعہ ماہنامہ آئیڈیل لاہور صفحہ نمبر 9)

بیسویں صدی کے معروف ماہر طبعیات آئن سٹائن نے E= MC2 کی مساوات (Equation) کے ذریعے سائنس کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اس مساوات نے مطالعہ طبعیات کو نئے تحقیقی رجحانات سے روشناس کرایا۔ آہستہ آہستہ طبعیات اور مابعد الطبعیات کے مابین سرحدیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ حیات، کائنات کے آغاز و ارتقاء کے بہت سے مباحث ان سائنسی تحقیقات کی روشنی میں کیے جانے لگے۔ وزیر آغا جیسے خلاق ادیب کا اس علمی رجحان کی جانب متوجہ ہونا ناگزیر تھا۔ سو انہوں نے ادبی مباحث کو نئے سائنسی انکشافات کے آئینے میں دیکھنے کو ترجیح دی۔ یہ سطور پڑھنے والوں کی توجہ اس پہلو پر بھی مرکوز رہنا چاہیے کہ تخلیقی ادب میں قبل ازیں مجید امجد، محبّ عارفی اور حسنین بخاری کے ہاں سائنسی حقائق سے اشارے کا واضح رجحان دکھائی دینے لگا تھا۔ اسی طرح بعد ازاں دو ادیبوں میں "شہزاد احمد" حیاتیات اور نفسیات جیسے سائنسی اور عمرانی علوم کو اردو ادب میں عام فہم زبان میں متعارف کرانے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا یک رخے (Lopsided) دانشور نہیں ہیں ان کا قاموسی علم انہیں اپنے تمام معاصرین سے نمایاں اور ممتاز مقام دلاتا ہے۔ "ڈاکٹر ناصر عباس نیّر" نے ان سطور میں بجا طور پر وزیر آغا کے اس اختصاص اور امتیاز کی نشان دہی کی ہے۔

"وزیر آغا کے مضامین میں یہ اشارہ اکثر ملتا ہے کہ فکری اور علمی منطقوں میں بنیادی ، ریڈیکل نوعیت کی تبدیلیوں کا آغاز طبعیات کے انکشافات سے ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ وزیر آغا Episteme یا روح عصر کی طرز کا کوئی تصور رکھتے ہیں جو مختلف علمی شعبوں میں ہونے والی پیش رفت کے عقب میں موجود ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں وہ کسی شعبے علم کو الگ تھلگ تصور نہیں کرتے۔فکری اشتراک کی ایک نادیدہ زنجیر انہیں باہم جوڑے رکھتی ہے وزیر آغا اس زنجیر کا سرا پکڑنے کی سعی کرتے ہیں۔" (تیموری پر وزیر آغا کے خیالات —— جائزہ مطبوعہ کاغذی پیرہن 2005ء ص67)

درحقیقت ڈاکٹر وزیر آغا امتزاجی موقف کے علمبردار (اصل مسودہ کے صفحہ نمبر 6 کے درمیان دیکھیے) وہ کسی سماجی ، سائنسی اور تنقیدی نظریے کو حرف آخر سمجھتے تھے نہ حرف غلط۔جدید علوم کو اپنے فہم و شعور میں جذب کر کے انہوں نے اپنی تنقیدات کا حصہ بنایا۔طبعیات میں ہونے والی تحقیقات سے استفادے کے باوجود وہ انہیں حرف آخر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بقول طبعیات نے اس کائنات کو صرف ایک مقام تک ہی کھولا ہے۔مگر اس مقام سے آگے "ناموجود" کا وہ منطقہ بھی ہے" جو خالق کائنات کے لاتعداد ابعاد میں سے ایک بُعد ہے۔ (وزیر آغا ، مضمون ، اکیسویں صدی کا تصور بیسویں ن صدی میں ص 205 راوی 2010ء۔گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کا میگزین راوی)

تفہیم حقیقت کے لیے وزیر آغا نے علم کے ہر سمندر کی غواصی کی۔اور اس کی تہہ سے دانش کے جواہر پارے سمیٹ لائے۔چونکہ اس تحریر میں ان کا مطالعہ ء طبعیات زیر بحث ہے۔اسی لیے ہم نے آپ کو ان کے اسی مطالعاتی پہلو تک محدود رکھیں گے۔سائنس کے بے شمار شعبوں میں سے بڑے بڑے شعبے حیاتیات ، کیمیا ، اور طبعیات ہیں۔ان تین علوم کی مزید بہت سی شاخیں ہیں اور ان شاخوں کو مزید کئی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ہمارے پیش نظر وزیر آغا کا مطالعہ طبعیات ہے۔اس لیے مناسب ہوگا کہ سب سے طبعیات کی مستند تعریف درج کی جاتی ہے۔

The study of mas and energy and the mutual relationship between "mas and Energy is called Physics"

یہ طبعیات کی تسلیم شدہ تعریف ہے۔گویا مادہ اور توانائی کا باہمی تعلق اس کا اصل موضوع ہے طبعیات کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1:Newtorian Phy sics

2: Modem Phy sics

3: Conquartum Phy sics

پر ان حصوں کو مزید کئی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔مثلاً Noutonion Physics کو Classical Physics اور Statisical Macenics میں تقسیم کیا گیا ہے Noutonion Physics کائنات کی اُن چیزوں کا احاطہ کرتی ہے جس کی کوئی واضح جسامت ہے۔مثلاً میز ، کرسی ، فٹبال ، زمین ، چاند ، اور سورج وغیرہ جبکہ Quartum Physics انتہائی چھوٹے ذرات اور Waves کو زیر بحث لاتی ہے۔اور ان کے درمیان تعلق کو واضح کرتی ہے۔مثلاً روشنی کو کبھی wave تصور کیا جاتا ہے۔کبھی Partical یا Photan خیال کیا جاتا ہے۔اب یہ دیکھنے والے کا نقطہ نظر ہے کہ اس کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے میگزین راوی میں چھپنے والے ایک مضمون میں وزیر آغا نے لکھا :

جدید طبعیات کے مطابق بظاہر حقیقت کے دو رخ ہیں۔ایک جہت farm بصورت پارٹیکل اور دوسرا مواد Content بصورت wave مگر انسان بیک وقت ان دونوں رخوں کو نہیں دیکھ سکتا جب وہ دیکھتا ہے تو اسے حقیقت کا صرف پارٹیکل "رخ" دکھائی دیتا ہے۔جب نہیں دیکھ رہا ہوتا حقیقت اپنے "دیو رخ" کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے" (وزیر آغا مضمون ، اکیسویں صدی کا تصور بیسویں صدی میں مطبوعہ راوی۔جی۔سی۔یونیورسٹی میگزین 2010ء ص203)

محولہ بالا سطور میں ڈاکٹر وزیر آغا نے Quantam Physics کے ایک بنیادی اصول کا کامیابی سے احاطہ کیا ہے۔یہ بات مشاہدات اور تجربات سے واضح ہو چکی ہے کہ روشنی دو رخی ہے۔مثلاً Compton photo Electric effect روشنی کے پارٹیکل رخ کو واضح کرتے ہے۔کہ Pair Productin اور Interference روشنی کی Wave Nature کو واضح کرتے ہیں اسی مضمون میں انہوں نے مزید لکھا:

واضح رہے کہ آج طبعیات کے سامنے سب سے بڑا قضیہ یہ ہے کہ کس طرح ایک ایسی Unifind Theory پیش کی جائے جو اس بات کو ثابت کرے کہ کائنات کی چار قوتیں یعنی

1:الیکٹرو میکنا ٹوم
2:سٹرانگ نیوکلیئر فورس
3:ویک نیوکلیئر فورس
4:گراویٹیشن۔

درحقیقت ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں۔اور ان چاروں میں کوئی فرق نہیں اب تک ہمارے سائنس دان "ڈاکٹر عبدالسلام" تین قوتوں کو مربوط کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں مگر تا حال کشش ثقل ان کی گرفت میں نہیں آسکی ، جس روز یہ قوت زیر دام آجائے گی تو کائنات کے پس پشت ایک عظیم قوت کا وجود سائنسی سطح پر بھی ثابت ہو جائے گا توقع ہے کہ اکیسویں صدی میں کائنات کا یہ امتزاجی روپ صاف نظر آنے لگے گا" (مضمون ایضاً راوی ، ص203.204)

اس پیرگراف میں وزیر آغا نے سائنسی حقیقت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ چار بنیادی فورسز کو باہم یک جا کرنا سائنسدانوں کے لئے ہمیشہ ایک معمہ بنا رہا ، نیوٹن ، میکس ول ، اور آئن سٹائن نے ان چار قوتوں کو یکجا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔بالخصوص آئن سٹائن نے تو اپنی زندگی کے آخری سال ان چار قوتوں کو Study کرتے ہوئے گزار دیے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔وزیر آغا کے بقول ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کے دو ساتھی پروفیسر گلاشو اور واشن برگ تین قوتوں کو مربوط کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا اپنی آپ بیتی میں رقمطراز ہیں:

"اپنی کائنات کے بارے مجھے معلوم تھا کہ یہ ان گنت کہکشاں پر مشتمل ہے
ہماری یہ کائنات بگ بینگ (Big Bang) سے شروع ہوئی اور اس کا انجام معدومی پر ہوگا۔چاہے یہ معدومی سکڑاؤ یعنی Biocrunch کی صورت میں ہو یا عظیم بکھراؤ Great Disperrsal کی صورت میں ہے۔
ہماری کائنات سے ملتی جلتی بے حساب کائناتیں ستاروں کی شماری ہیں۔ہر کائنات بگ بینگ اور اور بگ کرنچ یا گریٹ ڈسپرسل کے تابع ہے۔
یہ سارے کا سارا منظر نامہ جسے Multi Wave کا نام ملا ہے۔ایک ایسی Steady state میں ہے جس میں کائناتیں پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں۔لیکن پورا Multi Wave اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔اس کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی سطح پر حباب ، ہمہ وقت وجود میں آ رہے ہوں اور پلٹ کر پانی بن رہے ہوں ان کی جگہ نئے بلبلے بن رہے ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ Multi Wave کالی شکتی Dark Energy کے ایک متلاطم سمندر کا منظر نامہ ہے۔جس کی سطح سے ابھرنے والی کائنات کا ازل ہے اور ایک ابد۔لیکن پورے Multi Verse کا کوئی ازل یا ابد نہیں ہے Multi Verse کا اساطیر نظارہ کرنا Astral Feeling کی اشیاء ہیں مگر اس تخلیلی تجربے کے آگے معرفت کا وہ تجربہ بھی Astral Feeling سے بھی یہ گہرا احساس ابھرتا ہے۔کہ پورے کا پورا ملٹی ورس عظیم تر اور منور ترین اسرار کی محض ایک کرن ہے" (وزیر آغا۔شام کی منڈیر سے ، ص288.289)

یہ ہے وہ مقام جہاں طبعیات کی سرحدیں مابعد الطبعیات سے ملتی نظر آتی ہیں۔اور یہ سائنسی مشاہدہ ایک روحانی کیف و سرور میں ڈھل جاتا ہے۔اس روحانی کیف سے تصوف اور ادب کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

اپنی اسی خودنوشت میں ایک مقام پر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"تصورات عشق و خرد لکھتے ہوئے مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ انتہائی رفتار اور انتہائی سکون (ٹھہراؤ) ایک ہی شے کے دو نام ہیں جب میں سائنس کے جدید ترین نظریات سے آگاہ ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سائنس کے مطابق جیسے جیسے Energy اور Mass اپنے انتہائی مراحل کی طرف بڑھتے ہیں تو وحدت کا عمل تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ آخر میں چاروں قوتیں بھی ایک ہو جاتی ہیں۔ اور ایک ایسی صورت وجود میں آتی ہے جو ایک لامحدود ٹھہراؤ ہی کا دوسرا نام ہے۔ مگر میں نے سوچا، کیا ٹھہراؤ اور وحدت صرف تیز تر اور تابندہ ہونے کے نتیجے میں ہی مرتب ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب کائنات ٹھنڈی ہو جائے گی اور پھر Freezing کے اس مقام پر آ جائے گی جو 10/15 GEV کا الٹ ہے تو ایسی صورت وہ بھی سکون اور ٹھہراؤ کے اس مقام تک پہنچے گی جسے "ناموجود" کہا گیا ہے۔ گویا اس زینے کا سب سے اوپر والا قدم اور سب سے نچلا قدم اصلاً ایک ہیں دونوں طرف ناموجود کی بادشاہی ہے"

(وزیر آغا۔ شام کی منڈیر سے، ص 238)

اپنے سائنسی مطالعہ سے وزیر آغا نے یہاں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ مکمل طور پر درست ہے یا نہیں یہ بحث طلب ہے۔ اُن کے بقول جب Energy اور Mass اپنے انتہائی مراحل کی بڑھتے ہیں تو وحدت کا عمل تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تیز ترات تو ٹھیک ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ نقطہ انجماد یا Freezing Point پر آ کر دونوں مکمل طور پر آپس میں مل جائیں یا ختم ہو جائیں۔ کیونکہ Eirsten Theory of Rolativity کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ کوئی چیز انتہائی رفتار سے حرکت کرے Time Delation وقوع پذیر ہوتا ہے۔ Time Delation کا مطلب یہ ہے کہ وقت بڑھ جاتا ہے یعنی اگر کوئی چیز انتہائی رفتار سے حرکت کرے تو اس کی عمر آہستہ سے گزرتی ہے اس عمل کو فزکس کی اصطلاح میں Paradox کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا Mass اور Energy کو باہم یکجا کرنا ٹھیک نہیں۔ Mas اور Energy آپس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بہر حال موجود رہتے ہیں۔ صرف ان کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شے موجود ہے اور اس کی جسامت بھی یعنی اس کا وجود برقرار ہے تو وہ ناموجود میں تبدیل نہیں ہو سکتی فزکس کے ایک نظریے کے مطابق Absolute Zero پر گیس کا حجم ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک تصوری ہے C-277 یعنی Absolute Zero حاصل کرنا عملی طور پر ممکن نہیں اور نہ ہی یہ ابھی تک حاصل کیا جا سکا ہے۔ اگر یہ ٹمپریچر حاصل ہو بھی جائے تو گیس کا حجم شاید ختم ہو جائے لیکن کسی ٹھوس مائع چیز پر اس کا نتیجہ نکالنا کسی طور پر درست نہیں۔

ایک اور جگہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کانٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ کانٹ کے بقول:

"زمان و مکان دونوں کی کوئی حقیقت نہیں یہ فقط ہمارے ذہنوں کی اختراع ہیں" (شام کی منڈیر سے ص 236)

کانٹ ایک فلاسفر ہے وہ سائنس پر اتھارٹی کا درجہ نہیں رکھتا زمان و مکان سائنسی نظریے ہیں۔ جو اپنا وجود رکھتے ہیں۔ آئن سٹائن کا سارا کام Time اور Space سے شروع ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بعد میں آنے والے سائنسدانوں کے کام کی بنیاد بنتا ہے۔ اگر اس بنیادی تصور کو ہی رد کر دیا جائے تو موجودہ سائنس کے تمام قوانین اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔

معمولی فرگزاشتوں کے باوجود وزیر آغا کا مطالعہ طبعیات اس حوالے سے ان کے لیے وجہ امتیاز ہے کہ وہ بنیادی طور پر معاشیات اور ادب کے طالب علم تھے۔ سائنس کے طالب علم نہیں تھے۔ ان کی شاہکار کتاب "تخلیقی عمل" کے بیشتر مندرجات پر ان کے سائنسی مطالعے اور سائنس سے ماخوذ معلومات کی گہری چھاپ موجود ہے۔ وزیر آغا نے ساختیات کی بنیادی بصیرت کو جدید طبعیات اور تصوف کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ جو تنقیدی ادب کے مطالعہ کا بالکل نیا زاویہ ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک مفکر، ادیب، اور فلسفی فنکار تھے۔ جنکی فکر کی نئی نئی پرتیں آنے والے زمانوں میں کھلتی چلی جائیں گی۔ یقیناً اکیسویں صدی "وزیر آغا شناسی" کی صدی ہوگی۔ میانوالی کا جریدہ "تمام"، "کاغذی پیرہن" اور اب "اسالیب" کی یہ اشاعت وزیر آغا کے کام کی تفہیم کے حوالے سے اہم سنگ میل ثابت ہوں گے۔

اخذ و استفادہ

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل مآخذ سے معاونت حاصل کی گئی ہے۔

1: رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا۔ شخصیت اور فن۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

2: ڈاکٹر وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، انتظار سنز اردو بازار لاہور۔

3: راوی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میگزین 2010ء

4: کاغذی پیرہن لاہور (وزیر آغا نمبر) مئی، جون 2005ء
مضمون تھیوری پر وزیر آغا کے خیالات، ایک جائزہ۔ ناصر عباس نیر

5: ماہنامہ آئیڈیل لاہور (فروری 2010ء)
مضمون: وزیر آغا کی فکر کا جہان نو۔ عبدالکریم خالد۔

❖OOO❖

رقص کی زبان، جسم ہے اور جسم، کورے برتن کی طرح ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ رنگ، پتھر اور لفظ کے مقابلے میں جسم ایک کمزور سا وسیلہ ہے، لہٰذا رقص کے مظاہر، جسم کی صورت میں نہیں، پتھر لفظ یا تصویر میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پاکستان میں موہنجوڈرو کے رقص، بھارت میں ایلورا اجنتا کے رقص اور مصر میں اٹھارہویں خاندان کے رقص، پتھروں یا تصویروں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح شاعری نے بھی رقص کی رفعت اور لطافت کو لفظوں میں سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ مغربی شاعری کا ایک شاداب موضوع ہے۔ چنانچہ وہاں کی شعری زبان میں رقص کے مظاہر بڑی خوبی سے اجاگر ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اردو شاعری نے رقص کے موضوع سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہے۔ جدید دور سے قبل تو رقص شاذ ہی اردو شاعری کا موضوع متصور ہوا ہے۔ اس دور میں حفیظ جالندھری کی نظم "رقاصہ" رقص کے بارے میں ایک عام شہری کے ردعمل کی عکاس ہے یعنی اس میں اس بات کا اظہار ہوا ہے کہ رقص بے باکی اور بے حیائی کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے، اس قسم کی نظم اخلاقیات سے متعلق ہے نہ کہ رقص کے موضوع سے ان۔ م۔ راشد کی نظم "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے" میں بھی رقص کی لطافت، رفعت اور جذبے کی تہذیب کا عمل ناپید ہے اور رقص بجائے خود نظم کا موضوع نہیں، کسی دوسری ذہنی واردات کے تابع ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے زمانے کے ایک ایسے برہم نوجوان کو پیش کیا ہے جو زندگی سے بھاگ کر رقص گاہ میں پہنچتا ہے اور پھر اپنی "ہم رقص" سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں پناہ دے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جدید اردو شاعری میں رقص کے موضوع پر غالباً صرف دو خوبصورت نظمیں کہی گئی ہیں ایک یوسف ظفر کی ہے اور دوسری قیوم نظر کی۔

(اقتباس ---- کتاب "تخلیقی عمل" از ڈاکٹر وزیر آغا، ابلاغ پبلشرز، لاہور، اشاعت ششم جنوری 2003ء، صفحہ 134-133)

امتزاجی تنقید: اعتراف اور اعتراض کی کشمکش کے درمیان

ڈاکٹر محمد الطاف

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی سری نگر 190006

ای میل altafurdu@gmail.com

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اُردو کے تنقیدی اُفق پر جن نئے جن مکاتب کا ظہور ہوا اُن میں ہیئتی تنقید، ساختیاتی تنقید، ردِ تشکیلی تنقید، قاری اساس تنقید، اکتشافی تنقید، تانیثی تنقید، بین المتونیت، نو تاریخیت جیسے نظریاتِ نقد کے ساتھ ساتھ امتزاجی تنقید مناسب مقام کی حامل ہے۔ اِن نظریات نے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے انداز میں اُردو ادب کی شعریات کو محسوس و نامحسوس حد تک متاثر کیا ہے۔ پروفیسر وزیر آغا کا یہ تنقیدی نظریہ دہائیوں تک اُردو میں بحث و مباحث کا موجب بنا اور طرح طرح کے سوالات سامنے آئے جن میں سے بیشتر سوالات کے مدلل اور مناسب جوابات پیش کر کے وزیر آغا نے اس نظریہ نقد کی اہمیت اور معنویت کو زندگی کی حرکت و حرارت عطا کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظریہ نقد اس وقت اُردو ادب کے اُفق پر نمودار ہوا جب جدیدیت نے اپنا تار و پود حال ہی میں مکمل کیا تھا اور اس پر الزامات بھی لگائے جانے لگے تھے لیکن امتزاجی تنقید اپنی ماہیت اور دائرہ کار کے تعلق سے مابعد جدیدیت سے مطابقت رکھتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس تنقیدی نظریہ نے مابعد جدید تنقیدی منظر نامے کے رنگا رنگ خانوں میں اپنا ایک خاص رنگ بھر دیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ نقد مابعد جدید دور میں ہی سن بلوغ کو پہنچا۔ یہاں پر امتزاجی تنقید اور مابعد جدیدیت کے درمیان مماثلت اور مشابہت کے رشتوں کو اجمال کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تا کہ اولاالذکر کی صحیح ارتقائی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکے۔

امتزاجی تنقید اپنے دائرہ کار میں ادبی متن کی تشریح و توضیح اور تفہیم و تعبیر اور قدر شناسی میں ان تمام تنقیدی حربوں سے کام لیتی ہے جو ایک مخصوص متن میں مضمر مختلف اور متنوع عناصر کے اکتشافی تفاعل میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ امتزاجی تنقید کسی تنقیدی نظریہ کے جبر پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہر طرح کے کٹر پسندی اور مطلقیت (Absolutism) کے استرداد کا سامان اپنے پہلو میں رکھتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ امتزاجی تنقید کسی بھی تنقیدی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی ہے بلکہ ادب پارے کی تعین قدر میں اُس تنقیدی نظریہ کو کام میں لاتی ہے جو اس کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر تنقیدی نظریہ جبر سے متصف ہوتا ہے کیوں کہ وہ (یعنی تنقیدی نظریہ) اپنی ادعائیت اور مطلقیت کے تحت متن کے ایک پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو عمومی طور پر یک رُخی تنقید کو راہ دیتی ہے۔ امتزاجی تنقید کا یہی اختصاص اسے مابعد جدید تنقیدی نظریات کے حصار میں داخل کر دیتا ہے۔

مابعد جدیدیت بھی اپنی ماہیت میں کسی بھی نظریہ، ازم اور حقیقت کو دائمی اور حتمی متصور نہیں کرتی ہے اور ہر ایک نظریہ کو شک کے دائرے میں داخل کر دیتی ہے اس طرح اس کی چھتر چھایا میں ہر نظریہ پنپ سکتا ہے۔ یعنی ہر نظریہ اپنا تار و پود تیار کر سکتا ہے اور جو کسی دوسرے نظریہ یا ازم کے استرداد کا حامل نہیں ہوگا بلکہ اپنی منطق اور ضروریات کے تحت نمو حاصل کرے گا۔ اس طرح مابعد جدیدیت کے ساتھ امتزاجی تنقید کی مشابہت یوں ہی نہیں ہے بلکہ دونوں کے مزاج اور حدود و امکانات میں کافی حد تک مماثلت کے اشتے اور ایسے عناصر موجود ہیں جو امتزاجی تنقید کو مابعد جدید تنقیدی منظر نامہ کا حصہ قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔ مابعد جدیدیت اور امتزاجی تنقید کے مابین مشابہت کے تعلق سے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> "امتزاجی تنقید کو اہمیت مابعد جدید تنقیدی تناظر میں ہی ملنا شروع ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت ہر قسم کی ادعائیت، مطلقیت، حتمیت اور قطعیت کے خلاف ہے۔ یہ کسی ایک نظریے کو مطلق صداقت کا علمبردار اس لیے نہیں ٹھہراتی کہ اس کا لازمی مطلب باقی نظریات کا رد ہے جبکہ ہر نظریہ تھوڑی بہت سچائی کا حامل ضرور ہوتا ہے اور کم از کم اپنی حدود میں اہم اور مفید ہوتا ہے اور عین یہی موقف امتزاجی تنقید کا ہے۔ امتزاجی تنقید کی رو سے کسی ایک تنقیدی نظریے پر بہ طور واحد اور مطلق صداقت کے اصرار ہرگز مناسب نہیں"۔(۱)

امتزاجی تنقید کی اساس کو وزیر آغا نے اپنے دہائیوں کے مطالعے اور ادبی ذوق و شوق کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اُردو میں کچھ لوگ تنقیدی نظریہ سازی کی یہ کہہ کر شدید مخالفت کرتے ہیں کہ یہ سب نظریات مغربی افکار و اقدار کے چبائے ہوئے نوالے ہیں جو ہر صورت میں مشرقی مزاج اور معیار سے میل نہیں کھاتے۔ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظریات کسی ادب کے مسلسل اور متواتر مطالعے سے سامنے آ جاتے ہیں کیوں کہ دہائیوں کے مطالعہ سے یقیناً کسی نہ کسی سطح پر ادبی بصیرت وجدان کی بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتی ہے، جس کو ۱۹۸۰ء کے بعد مابعد جدید ثقافتی صورت حال کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وزیر آغا اس اعتبار سے مبارک بادی کا استحقاق رکھتے ہیں کہ انہوں نے ادبی تنقیدی نظریات کے مخالفین کا سنجیدہ اور علمی جواب دیا ہے۔ انہوں نے امتزاجی نظریہ نقد کی بابت لکھا ہے:

> "ذاتی طور پر امتزاجی تنقید کا حامی ہوں۔ پچھلے ایک برس کے دوران میں مختلف نظریوں کی حامل تنقید کا رواج رہا ہے۔ مثلاً نفسیاتی، اسطوری، مارکسی، وجودی، ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید کی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ امتزاجی تنقید جو اصلاً لاتحریک تنقید ہے، کسی بھی تنقیدی مکتب کو مسترد نہیں کرتی۔ یہ صرف اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ فقط ایک نظریے یا تحریک کی حامل تنقید، تخلیق کے محض ایک پہلو پر خود کو مرتکز کر کے تخلیق کے دیگر ابعاد سے روگردانی کی مرتکب ہوتی ہے۔ تاہم امتزاجی تنقید بھی محض مختلف تنقیدی تھیوریوں کی حاصل جمع کا نام نہیں کہ اس حاصل جمع سے کچھ زیادہ ہے اور کچھ زیادہ ہونا اس کا تخلیقی پہلو ہے۔ امتزاجی تنقید متن کو از سر نو تخلیق کرتی ہے اور ضرورت کے مطابق ان تنقیدی نظریات سے استفادہ کرتی ہے جن کی طلب خود متن کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یوں یہ تنقید، تخلیقی ادب کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے"(۲)

مذکورہ بالا اقتباس سے وزیر آغا کے تنقیدی مسلک کی وضاحت تو ہوتی ہے مگر یہ سطور کچھ غلط فہمیوں کو بھی راہ دیتی ہیں جیسے یہ کہ امتزاجی تنقید کا سروکار ادب شناسی سے زیادہ تخلیقیت سے ہے۔ وزیر آغا نے منطقی اور استدلالی انداز میں

احتراجی تنقید کی حمایت کرتے ہوئے اس کو ادب کی تحسین اور تعینِ قدر میں اہم راہ نما کی حیثیت سے متعارف اور مقبول کیا۔ اسلم حنیف نے اس زاویہ نظر کی ضرورت کا احساس اس طرح دلایا ہے:

> ''ادبی سطح پر تنقیدی دبستانوں کا عروج و زوال اس حقیقت سے ماورا نہیں ہے لیکن نئی تنقیدی تھیوری نے جہاں نئی تنقید، ساختیات اور پس ساختیات کے تال میل سے تخلیق کے انشراح و تجزیہ کے لیے کھلی فضا کا احساس بیدار کیا ہے وہیں ۔احتراجی تنقید نے سابقہ تمام تنقیدی نظریات اور نئے تنقیدی رجحانات کے اختلافات و تضادات میں ہم آہنگی اور ماضی، حال اور مستقبل کے رشتوں کے درمیان خوشگوار روابط کی بشارت کے چراغ روشن کیے ہیں''(۳)

احتراجی تنقید کے شانِ نزول کو زیر بحث لاتے ہوئے وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''احتراجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر'' میں اپنے اس تنقیدی مسلک کو سائنسی اصول و ضوابط کی روشنی میں پیش کیا۔ انہوں نے سائنسی، ثقافتی، سیاسی، سماجی، لسانی میدانوں میں گذشتہ ربع صدی کے دورانیہ میں احتراجی میلان کی نشان دہی کر کے اپنی تنقیدی تھیوری مرتب کی ہے۔ طبیعات میں انہوں نے Theory of Everything کو احتراج کی ایک صورت قرار دیا ہے۔ اسی طرح لسانیات میں بھی نئی فکریات کو احتراج کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق نفسیات میں بھی فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کے افکار نے احتراجی میلان کی طرف پیش قدمی کر کے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

احتراجی تنقید اپنی اصل میں صرف مختلف اور متنوع تنقیدی نظریات کا حاصل جمع نہیں ہے بلکہ وزیر آغا کے الفاظ میں اس سے کچھ زیادہ ہے اور یہ کچھ زیادہ ہونا ہی اس کا امتیاز ہے۔ وزیر آغا نے اپنے اس تنقیدی مسلک کو نظریہ کے بجائے رویّہ کہا ہے۔ یہاں پر نظریہ اور رویّہ میں فرق واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ وزیر آغا کے تنقیدی رویّہ موسوم بہ احتراجی تنقید کو نظریہ سے الگ ہو کر سمجھا جا سکے۔

نظریہ اور رویّہ دو مختلف اصطلاحیں ہیں جن کے اپنے حدود اور دائرہ کار ہیں۔ نظریہ انگریزی لفظ تھیوری (Theory) کا متبادل ہے۔ جس کو ادبی، سماجی، ثقافتی اور سائنسی علوم میں برتا جاتا ہے اور اس کو واضح کرنے کے اپنے اصول و قوانین ہیں۔ اس کی منطقی اور منضبط اساس ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ اپنے مفروضات کو منوانے کے لیے جبر کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ اس کے برعکس رویّہ انفرادی ذہنی اعمال اور افعال کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ رویّہ نظریہ کے مقابلے میں لچکدار اور ہم آہنگی کی خمیر سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ ''نظریہ اصول و براہین کا ایک نظام ضرور رکھتا ہے۔ جب کہ رویّہ ایک طرزِ عمل ہے جو ذہنی توقعات اور اعمال کے سلسلے میں اختیار کیا جاتا ہے۔۔۔ رویے میں جبریت کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نظریے کی حدود کو ملحوظ قرار دیا جائے تو یہ ساکن اور جامد ہیں، اس لیے نظریے میں جبریت کے در آنے اور سنگلاخیت کے رونما ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں''(۴) احتراجی تنقید کو اس لیے بھی رویہ کہنا ہی مناسب ہے کہ اس نے کسی نظریے کو حتمی اور قطعی (Fixed and Final) قرار نہیں دیا بلکہ ہر تنقیدی نظریے کو متن کی تحسین شناسی کے لیے ضروری قرار دیا۔ اُس کے مطابق بیسویں صدی میں ہر نظامِ فکر احتراج کے توسط سے ظہور پزیر ہوا ہے۔ لسانیات، نفسیات، طبیعات سے لے کر تہذیب و ثقافت اور سماجیات غرض ہر شعبہ علم کی مثال دیتے ہوئے وزیر آغا نے اُن پر احتراج کی صورت حال کے اثرات کو واضح کیا ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے، اس پر بھی اس نے احتراج کی نوعیت کو ابھارا ہے۔ خاص کر حالی اور شبلی کی تنقیدی تحریروں کو اس احتراجی تنقید کی ابتدائی کوشش قرار دے کر اپنے تنقیدی مسلک کو منضبط اور مبسوط بنیادیں فراہم کیں۔

بیسویں صدی کی جن شخصیات کا سکہ اُردو کے ادبی بازاروں میں چل رہا تھا ان میں ایک اہم نام وزیر آغا کا ہے۔ وزیر آغا کی فطری اور علمی تنقید پہ مبنی تحریریں کم و بیش چھ دہائیوں کو محتوی ہیں۔ اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''اُردو شاعری کا مزاج'' ان کے تنقیدی رجحان کا سمت نما ہے۔ جس نے آگے چل کر وزیر آغا کے نام کے ساتھ احتراجی تنقید کا لاحقہ جوڑ دیا۔ متن کی تعینِ قدر میں صرف احتراجی تنقید کو ہی لاگو نہیں کیا جا سکتا بلکہ نقاد کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ احتراجی شخصیت کا حامل ہو۔ غرض احتراجی تنقید ایک نقاد سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ کم و بیش ہر شعبۂ علم پر گرفت رکھتا ہو، تب وہ کسی متن کے اندر مضمر مختلف اور متنوع پہلوؤں کو منکشف کر سکے۔ رہا یہ سوال کہ کیا احتراجی تنقید مختلف نوعیت کے تنقیدی نظریات کی آمیزش (تیل پانی) کے ملاپ کی صورت تو نہیں، اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ احتراجی تنقید کے حوالے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ احتراجی نقاد مختلف تنقیدی نظریوں کو متن پر باری باری آزمانے کا موئید ہے حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دراصل احتراجی تنقید تبھی ممکن ہے کہ پہلے نقاد خود ایک احتراجی شخصیت کا مالک ہو۔۔۔ احتراجی تنقید کے لیے وہی متن کار آمد ہے جو بجائے خود جہات اور ابعاد کی کثرت سے عبارت ہو۔ ایسے متن میں جا بجا روزن (Gaps) ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی مخفی تناظر کی طرف جانے والے راستے ہیں۔ ایسا متن نقاد کو اپنے اندر کے تہہ در تہہ جہان میں در آنے کی دعوت دیتا ہے اور خود نقاد اپنی تحویل میں موجود اوزاروں یعنی Devices کی مدد سے ان روزن کو کشادہ کر کے متن کو کثیر المعنیاتی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک مثال سے اسے یوں بیان کریں گے کہ اگر روشنی کے قمقمے تعداد میں زیادہ ہوں تو جس جسم پر ان کی روشنی کا نزول ہوگا، اس میں سے ان قمقموں کی تعداد کے مطابق ہی سائے برآمد ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جب احتراجی نقاد متن کے روبرو آئے گا تو اس کی فکری اور احساسی جہات کے مطابق ہی متن کے اندر سے معنی کے سائے برآمد ہوں گے۔ مگر یہ دو طرفہ عمل ہوگا: ایک طرف نقاد کا احتراجی روپ ہوگا تو دوسری طرف متن کا احتراجی پیکر''(۵)۔ بچن یا متن شناسی کا یہ عمل تخلیقی عمل کے حدود میں چلا جاتا ہے اسی لیے بعض لوگوں کے نزدیک احتراجی تنقید تخلیقی تنقید کہلاتی ہے جس میں نقاد اپنی تخلیقی اپج اور غیر معمولی خلاقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر متن کے مختلف پہلوؤں کو منکشف کر کے تنقید یا ادب شناسی کا حق ادا کرتا ہے۔

احتراجی تنقید نے اپنے دائرہ کار میں مصنف، متن اور قاری کو یکساں اہمیت دی ہے۔ ان تینوں کے تفاعل سے متن ایک فن پارہ وجود رکھتا ہے۔ اس نے سوانحی و تاریخی اور نفسیاتی تنقید سے مصنف، ہئیتی تنقید سے متن اور قاری اساس تنقید سے قاری کے تصورات اخذ کر کے احتراج کی ایک خوشگوار اور خوبصورت مثال پیش کر کے اُردو کو ایک نیا تنقیدی وژن عطا کیا۔ احتراجی تنقید میں احتراج کن چیزوں کا ہوتا ہے؟ آیا اس میں احتراج عناصر کا ہوتا ہے یا ڈسپلن کا؟ اس سلسلے میں کئی دانشوروں نے اپنی رائے پیش کر کے متعدد سوالات کو جنم دیا ہے۔ اسلم حنیف نے اس حوالے سے وزیر آغا کے قول کا اعتراف کرنے کے باوجود بھی تشنگی کے احساس کو ظاہر کیا ہے، جو احتراجی نقطہ نظر کی استدلالی اور منطقی حیثیت کو مشکوک بناتا ہے (اگرچہ کئی مقامات پر اسلم حنیف نے احتراجی تنقید کو نظری سطح پر رائج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے، مذکورہ سطور میں اس تعلق سے حوالہ بھی پیش کیا گیا ہے) یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر وزیر آغا کا موقف بہت واضح ہے کہ ''فن پارہ اپنے بطون میں اُترنے کے لیے جن انتقادی رویوں کا متقاضی ہو، انہیں رویوں کو بروئے کار لانا ایک احتراجی ناقد کا کام ہے۔'' اس سے مراد تمام مروج تنقیدی رویے نہیں کہ ایک فن پارہ اس کا حامل ہو بھی نہیں سکتا لیکن تحریک پانے والے رویے سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ اس کا اشارہ مختلف تنقیدی عناصر کی طرف ہے یا ڈسپلن کے لیے؟''(۶)

لیکن یہ واضح ہے کہ اس میں احتراجی عناصر کا عمل بڑا ہی فلسفیانہ ہے۔ احتراجی تنقید کا تقاضا یہ ہے کہ نقاد ایک ایک کر کے تمام تنقیدی نظریات کا اطلاق کسی متن پر کر کے احتراجی تنقید کا حق ادا کرے گا جس سے وہ متن کے مختلف اور متضاد عناصر کی تشریح و توضیح کر کے ان میں مضمر فلسفیانہ، علمی اور جمالیاتی بصیرتوں کا ادراک و عرفان حاصل کرے گا۔ ناصر عباس نیر کا ذیل کا اقتباس توجہ طلب ہے جس میں اس کو خالص فلسفیانہ اصول قرار دیا گیا ہے:

"احراج حقیقتاً ایک
"فلسفیانہ اصول" ہے جو اولاً مختلف، متفرق اور متضاد عناصر
کا ادراک کرتا ہے، ثانیاً
ان کی مماثلتوں اور افتراقات اور حدود کو گرفت میں
لیتا ہے اور پھر ایک
ناقابلِ تشریح عمل کے تحت ان کو احراجی رشتے میں
پروتا ہے اور جس کا نتیجہ ایک وژن اور بصیرت ہے
اور یہ بصیرت مذکورہ عناصر کے ریاضیاتی مجموعے
سے زائد ہوتی ہے۔"(۷)

اب یہاں پر ایک بات غور طلب ہے کہ احراجی تنقید کی رُو سے ایک نقاد سے ہم یہ تقاضا کریں گے کہ وہ ایک فن پارہ پر باری باری سے مختلف تنقیدی نظریات کو بروئے کار لا کر اس میں مضمر معانی اور مفاہیم کی مختلف جہتوں اور پرتوں کو بے نقاب کرے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ نقاد تمام تنقیدی نظریات کے بنیادی مقدمات سے واقف ہے؟ کیا وہ مختلف تنقیدی نقطہ ہائے نظر کو ملانے کی صحت مند Approach سے متصف ہے؟ بہ الفاظ دیگر کیا وہ ادبی اور تنقیدی نقطہ نظر سے احراجی شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ احراجی نقاد کا وجود مختلف علوم سے واقفیت سے مشروط ہے (کیوں کہ موجودہ تنقیدی منظر نامہ پر تھیوری کا راست طور پر اثر ہے۔ تھیوری فی نفسہ مختلف معاشرتی، بشریاتی، لسانیاتی، ثقافتی میدانوں میں ہوئی حالیہ تحقیق سے وجود میں آئی ہے) جو احراجی تنقید کو ملانے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔

وزیر آغا کے احراجی زاویہ نظر کو کئی لوگوں نے بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے مگر اس کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ معترضین میں سے اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ احراجی تنقید تمام تنقیدی نظریات کا نچوڑ ہے۔ وزیر آغا نے دیکھا دیکھی میں ایک نئے تنقیدی نظریہ کو سامنے لایا ہے۔ بعض کا اعتراض ہے کہ مختلف تنقیدی نظریات کا تفاعل اور ماہیت مختلف ہوتی ہے اس لیے یہ کیسے ممکن اور مناسب ہے کہ مختلف تنقیدی نظریات کے انضمام کا راستہ اختیار کر کے ادب کی تحسین اور تعین قدر کا حق ادا کیا جائے۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ نے وزیر آغا کے تنقیدی مضمون عصمت چغتائی کے نسوانی کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار دو اعتراضات میں کیا ہے:

'الف: ساختیات موضوعیت، مرکزیت، ماورائیت اور عمومیت کی سخت مخالف ہے، اس لیے اس سے کسی ایسے تنقیدی رویے کا احراج ممکن نہیں جس میں موضوعی معانی پائے جاتے ہوں۔'
ب: ہر نقاد کے ہاں ایک نظریاتی موقف ہوتا ہے جو احراجی رویہ اپنانے سے تحلیل ہو سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں عمومیت یا انتشار پیدا ہوگا، کیوں کہ بعض تنقیدی رویوں میں جوڑ بنایا جا سکتا ہے اور بعض میں نہیں۔"(۸)

وزیر آغا کے مضمون "عصمت چغتائی کے نسوانی کردار" جو کہ احراجی تنقید کا اہم عملی نمونہ تصور کیا جاتا ہے، کی بابت 'صریر' کے مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ:

"بہر کیف احراجی تنقید کے بارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے رائے لی گئی تو دونوں کی رائے یہی تھی کہ تمام "تنقیدی ڈسپلن کا احراج ممکن نہیں ہے لیکن کچھ کا ہو سکتا ہے۔ تقریباً وہی رائے جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش کی تھی۔"(۹)

مذکورہ اعتراضات کا کوئی مدلل اور مبسوط جواب وزیر آغا کی طرف سے نہیں آیا ہے۔ البتہ ناصر عباس نیر نے لکھا ہے کہ پروفیسر نارنگ کا خیال تھا کہ ساختیات کے ساتھ سوائے آر کی ٹائپل تنقید کے کسی دوسرے تنقیدی نظریے کا احراج ممکن نہیں۔ وہ اصلاً اس بات کے قائل ہیں کہ افہام و تفہیم یا بعض فن پاروں کی نوعیت کی وجہ سے ادبی تنقید میں دو یا دو سے زیادہ رویوں کو ملایا جا سکتا ہے، یعنی احراجی تنقید کوئی غیر ممکن چیز نہیں اور یہ امکان خود فن پارے کے باطنی مطالبے سے پیدا ہوتا ہے۔"(۱۰)۔
نیر کی حمایت بھی یک رُخی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ فن پارہ خود تنقیدی زاویوں کے مطالبے کرتا ہے، صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ فن پارہ ہر نقاد سے یہی مطالبہ کرے گا اور ظاہر ہے کہ ہر نقاد متن کے ان تقاضوں کا جواب نہیں دے سکتا ہے۔
اسلم حنیف نے وزیر آغا کے تنقیدی رویہ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بین السطور یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ وزیر آغا کو احراجی تنقید کا موجد اور بانی کار تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ احراجی تنقیدی دبستان کے وجود کے ہی منکر ہیں البتہ اُردو کے جدید ناقدین بشمول وزیر آغا کی تنقیدی خدمات کو وہ "کشادہ تنقید" کے ذیل میں گردانتا ہے کیوں کہ اس کے بقول اُردو کے بیشتر ناقدین کے یہاں احراج کا تنقیدی رویہ نیا نہیں ہے بلکہ یہ اس شعور کا نتیجہ ہے جس کی داغ بیل حالی اور شبلی جیسے وسیع النظر، مفکر، دانشور اور ناقد اردو ادب میں ڈال چکے تھے۔ بہتر ہے اسے احراجی تنقید کے بجائے کشادہ تنقید کہا جائے۔"(۱۱)

اُردو کی تنقیدی تاریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے شروع سے ہی جو تنقیدی نظریات اردو کے ادبی افق پر نمودار ہوئے وہ یا تو مغربی ادب سے حد درجہ متاثر تھے یا ان کی چربہ حالت یہاں تک آ پہنچی ہے کیوں کہ اردو ادیب اور دانشور مغربی حوالے اور پس منظری صورت حال کے بغیر اردو کا کوئی تنقیدی مضمون خاطر میں نہیں لاتے ہیں کیوں کہ یہ عنصر اُردو والوں کا عمومی مزاج بن چکا ہے اور اس کے بغیر ہر تحریر غیر معیاری اور فالتو قرار دی جاتی ہے۔ اسی مغربیت کے غلبے کے سبب بیشتر ناقدین نے احراجی تنقید کو قبول کرنے سے انکار کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں مغربی تنقید کی اصطلاحات اور حوالے نا کے برابر ہیں۔ لیکن احراجی تنقید ایسا تنقیدی رویہ ہے جو خالص مشرقی ہے اور جس کے خمیر میں کلاسیکی روایات و اقدار کی پاسداری ملتی ہے۔ وزیر آغا کی اس کوشش کے پیچھے مشرق کی صوفیانہ طرزِ فکر کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو کثرت میں وحدت کی جستجو کرتی ہے۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو احراجی تنقید خالص مشرقی اندازِ نظر ہے (۱۲)۔ معترضین کا یہ اعتراض کہ احراجی تنقید خالص مشرقی ہونے کے سبب ناقابلِ التفات ہے، بالکل غیر صحیح اور عقلِ عام (common sense) کے خلاف ہے۔

وزیر آغا کی احراجی تنقید پر وارث علوی نے درجنوں صفحات سیاہ کیے ہیں جس میں موخرالذکر نے اپنی چٹخارے والی زبان میں وزیر آغا کی زندگی اور اس کی نظری اور عملی تنقید کو نشانہ بناتے ہوئے ناشائستہ الفاظ استعمال کر کے اس کی توہین کی ہے۔ اس طرح وارث علوی کے اعتراضات کو بے جا قرار دے کر ان کو مضمون نگار کی بکواس اور لچر ذہنیت کا عکاس تصور کیا جائے۔ مثال کے طور پر وزیر آغا کے متعلق وارث کا یہ جملہ کہ "آغا صاحب کی کتاب ایک ایسے اسلوب میں لکھی ہوئی تھی جس کے ہر جملہ کا چہرہ لمبوترا اور ہر لفظ پرائمری سکول ٹیچر کی طرح مسکین اور افلاس زدہ تھا۔"(۱۳)

احراجی تنقید پر جو اعتراضات کیے گئے وہ صحت مند بھی ہیں اور غیر صحت مند بھی لیکن اس نظریہ تنقید کی اہمیت اور ادب شناسی میں اس کی معنویت کا اعتراف کرنے والے دانشوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے۔ ناصر عباس نیر، رفیق سندیلوی، شاہد شیدائی جیسے ناقدین نے احراجی تنقید پر مکالمہ قائم کر کے اُردو تنقید میں نظری سطح پر اس کی طرح ڈالی۔
اپنے معروضات اور مقدمات کی بنیاد پر احراجی تنقید ۱۹۸۰ء کے بعد سامنے آنے والے والے تنقیدی نظریات کے درمیان ایک اہم مقام کی متحمل ہے۔ اس کی مقبولیت اور عصری تنقیدی صورت حال سے اس کی نسبت بھی واضح ہے

جس نے اس تنقید کو بامعنی اور ادب شناسی کی روایت میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اس تنقیدی رویے نے ادب کے تعین قدر کے سلسلے میں متعصبانہ عینک اتار پھینکنے کا ماحول تیار کر کے غیر جانبداری کو راہ دی۔ جس نے تنقیدی نظریات کے جبر کو للکارا اور ان کے مقابلے میں متوازن اور متناسب معیار قائم کر کے اُردو تنقید کو وزن اور وقار عطا کیا۔

حوالے:

۱۔ امتزاجی تنقید از ناصر عباس نیر، مشمولہ شعر و حکمت، کتاب ۳، دور سوم، پنجہ گوٹہ روڈ، حیدرآباد، ص ۱۰۸۔

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک مکالمہ از اسد فیض، مشمولہ ماہنامہ اردو دنیا، جلد ۹، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۷ء، نئی دہلی، ص ۴۰۔

۳۔ امتزاجی تنقید: ایک بحث از اسلم حنیف، مشمولہ ماہنامہ اوراق، فروری، مارچ ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۔۱۲

۶۔ امتزاجی تنقید: مغالطے اور حقیقت، از اسلم حنیف، مشمولہ سہ ماہی استعارہ، جلد دوم، شمارہ ۷، نئی دہلی، ص ۱۰۴۔

۷۔ امتزاجی تنقید: ایک بحث از اسلم حنیف، مشمولہ ماہنامہ اوراق، فروری، مارچ ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۲۰۔

۸۔ بحوالہ امتزاجی تنقید از ناصر عباس نیر، ص ۱۲۰۔

۹۔ امتزاجی تنقید: مغالطے اور حقیقت، از اسلم حنیف، مشمولہ سہ ماہی استعارہ، جلد دوم، شمارہ ۷، نئی دہلی، ص ۱۰۳۔

۱۰۔ امتزاجی تنقید از ناصر عباس نیر، ص ۔۱۲۰

۱۱۔ امتزاجی تنقید: مغالطے اور حقیقت، از اسلم حنیف، مشمولہ سہ ماہی استعارہ، جلد دوم، شمارہ ۷، نئی دہلی، ص ۔۱۱۳

۱۲۔ امتزاجی تنقید از ناصر عباس نیر، ص ۔۱۲۰۔۱۱۹

۱۳۔ وزیر آغا کی تنقید نگاری، از وارث علوی، مشمولہ اظہار ۵، جنوری ۱۹۸۴ء، ممبئی، ص ۹۴۔

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا کی دو خوبصورت نظمیں

ابھی کوندا نہیں اترا

ابھی اک مشت پر ہے، پھڑ پھڑاتا ہے
کسی بند آنکھ میں جیسے
کوئی سپنا ادھورا سا
کوئی آنسو کہ جس کی
ابھی بے نام گنبد کا کلس بننے نہیں پائی
ابھی مرقد کی چادر پر کوئی سلوٹ نہیں آئی

ابھی پانی نے بھاری ابر کا چوغہ نہیں پہنا
ابھی بادل نہیں گرجا
ابھی کوندا نہیں اترا
ابھی سینے کے اندر
رائیگاں جانے کا بس احساس ابھرا ہے
ابھی تو دھند پھیلی ہے
ابھی تو حرف بکھرے ہیں
ابھی حرفوں نے جڑ کر لفظ کی صورت نہیں پائی
قیامت آنے والی تھی
مگر اب تک نہیں آئی!

سمندر میرے سینے میں
ابھی اک استعارہ ہے
ابھی اک بوند ہے، اک لس ہے
اک ''کاش'' ہے
تلوار کی جو دھار بننے سے گریزاں ہے
جو بن جانے کے امکاں سے ہراساں ہے!

وزیر آغا

❖OOO❖

کینوس

یہ کس پاگل مصور نے
زمیں کو کینوس اپنا بنایا ہے
ستاروں کے ہزاروں موقلم ٹوٹے پڑے ہیں
ہزاروں رنگ جس نے
مہرباں خورشید پیلٹ سے لے کر
زمیں کی کھوپڑی پر مل دیے ہیں
جزیرے سرخ
صحرا سبز
قلزم زرد رو جس نے دکھائے ہیں
کلس کیلاش کے جس نے
اندھیروں سے سجائے ہیں
شفق پر جابجا
پنسل کی ٹوٹی چھیاں بکھری پڑی ہیں
گھروندوں میں جدھر دیکھیں
فقط کالک ہی کالک ہے
خدا مالک ہے
کس پاگل کو اس نے
اس زمیں کے حسن کا،
تزئین کا
سب کام سونپا ہے
سفیدی آنکھ میں جس نے بھری ہے
سیاہی سرخ چہروں پر ملی ہے
لہو کا آبِ زر جس نے
کٹیلے خنجروں کی اوک سے گرتا دکھایا ہے۔

وزیر آغا

❖OOO❖

ارضی ثقافتی تحریک، ڈاکٹر وزیر آغا اور اُردو غزل

ڈاکٹر عابد سیال

اُستاد شعبہ اُردو، نمل اسلام آباد

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کے حالات نئی مملکت کے لیے حوصلہ افزا نہ تھے۔ کچھ تو مخالفتوں کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا۔ جب حالات نے ایسا رخ اختیار کیا جس میں پاکستان سے وابستہ خوابوں اور امیدوں کو ٹھیس پہنچنے لگی تو کئی اعتقادات سوالیہ نشان بن گئے۔ تشکیک کی اس فضا میں جو فکری مسائل سامنے آئے ان میں سے سب سے اہم مسئلہ تہذیبی شناخت کا تھا۔ سوال یہ تھا کہ پاکستانی قوم کی تہذیبی جڑیں کہاں ہیں؟ ادب میں اس مسئلے پر بحث نے زیادہ شدت اُس وقت اختیار کی جب بعض ترقی پسندوں نے مذہب کی کھلم کھلا مخالفت کی اور لادینیت کے رویے کو ترقی پسندی کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ اس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا اور یہ کہا گیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اور اس کی شناخت صرف اور صرف اسلام ہے۔ لہٰذا ادب میں ایسے عناصر کی تلاش، فروغ اور تخلیق کی جانی چاہیے جن کی روح اسلامی ہو۔ اس فکری رجحان کا فوری محرک ترقی پسند تحریک کی مخالفت تھی، تاہم آگے چل کر جب ادب میں اسلامی عناصر کی شناخت کی جانے لگی تو اس نے اور کئی سوالات کو جنم دیا۔ یوں یہ سوال اور زیادہ گھمبیر ہو گیا کہ تہذیبی شناخت کن عناصر کی مرہونِ منت ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سوال کے جو جواب سامنے آتے رہے، ان سے تہذیبی شناخت کی تین سمتیں نمایاں ہوئیں۔ پہلے گروہ کے مفکروں کا موقف تھا کہ تاریخ روحانی اقدار سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہ روحانی اقدار جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے بلند اور قیدِ مکاں سے آزاد ہوتی ہیں لہٰذا پاکستانی معاشرے کی تہذیبی جڑیں اس آفاقی معاشرے میں ہیں جس کی تشکیل اسلام کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے زیرِ اثر ہوئی۔ یوں پاکستانی تہذیب اتنی ہی پرانی ہے جتنی اسلامی تاریخ۔ اس مکتبۂ فکر کے لوگوں کے نزدیک زمینی رشتوں کی اہمیت صرف اسی حد تک اہم اور قابلِ قبول تھی جس حد تک وہ ان مذہبی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے موافقت رکھتے تھے۔ دوسرا موقف ان مفکرین کا تھا جن کے نزدیک معاشرت کا وجود مادی حقیقتوں پر منحصر ہے اور زمینی رشتے تہذیبی تعلق کی اساس ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کی تہذیب وہی ہے جو اس سرزمین کی تہذیب ہے اور جو موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کی قدیمی روایات سے پھوٹی اور یہاں کی علاقائی روایات میں رچتی بستی ہوئی ہم تک پہنچی۔ تیسرے گروہ کے مفکرین کا زاویۂ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس سرزمین کی تہذیب نے ایک نئی امتزاجی صورت اختیار کی ہے جس میں اس سرزمین کی قدیم تہذیب کی زندہ روایات بھی شامل ہیں اور اسلامی روح بھی جس میں رچی بسی ہے اور جسے عرفِ عام میں ہند مسلم تہذیب کہا جاتا ہے۔ پاکستانی تہذیب اسی ہند مسلم تہذیب کا تسلسل ہے اور اس کا رشتہ بیک وقت اسلام کی روحانی اقدار سے بھی ہے اور اس مٹی کی بُو باس سے بھی۔ یہ تینوں نقطہ ہائے نظر قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب میں تین ادبی تحریکوں کا باعث بنے جنھیں علی الترتیب اسلامی ادب کی تحریک، ارضی ثقافتی تحریک اور پاکستانی ادب کی تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تینوں تحریکیں اپنے نقطۂ نظر میں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ مخالف ہیں تاہم ان کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی تہذیبی شناخت کا رجحان؛ لہٰذا ان تحریکوں کو 'تہذیبی رجحان کی تحریکیں' کہا جا سکتا ہے۔ ان تینوں تحریکوں کے آغاز کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے یعنی قیامِ پاکستان کے بعد کا دور۔ آگے چل کر فکری بحثوں کے نتیجے میں ان تحریکوں کے موقف میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں بھی ہوئیں تاہم ان کی فکری اساس کے یہی زاویے تھے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔

ارضی ثقافتی تحریک تہذیبی تشخص کے ارضی حوالے کو اہمیت دیتی ہے۔ اس تحریک کے نقوش پہلے سے اردو ادب میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے تاہم ڈاکٹر وزیر آغا نے اس تحریک کو فکری اور نظریاتی اساس مہیا کر کے اسے ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس تحریک کے ابتدائی رجحانات اقبال کے ہاں دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں:

> اردو ادب میں ارضی ثقافتی تحریک کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب علامہ اقبال نے "ہمالہ" ایسی نظمیں تخلیق کرنا شروع کیں اور "گردشِ ایام" کو پیچھے کی طرف دوڑنے کا مشورہ دیا۔ یہ گویا اپنی ثقافتی جڑوں کی تلاش کی ایک کاوش تھی۔ (۱)

اہلِ برصغیر کی آزادی کی تحریک کو بھی ڈاکٹر صاحب وطن دوستی، ارض پرستی، اپنے ثقافتی ورثے اور اپنے ماضی کے ساتھ شدید وابستگی کی صورت میں دیکھتے ہیں جو مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار کے ردِ عمل میں پیدا ہوئی۔

اس رویے کی کامل صورت پہلی بار میراجی کے ہاں ملتی ہے۔ "میراجی اس ارضی ثقافتی تہذیب کا اولین نمائندہ تھا جس نے انکار کی حد تک ہی نہیں، اپنے حلیے اور رویے کی حد تک بھی خود کو مغربی تہذیب سے منقطع کر کے برصغیر کے ماضی سے وابستہ کیا"۔ (۲) ماضی پرستی اور دھرتی پوجا کا یہ رویہ میراجی کے گیتوں، نظموں، غزلوں میں نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔

ارضی ثقافتی تحریک نے وطن دوستی کے رویے کو فروغ دیا۔ اس تحریک کے ناقدین کے مضامین کا مطالعہ کیا جائے تو قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض جگہ ان کے ہاں بھی ترقی پسند تحریک کی مخالفت کے آثار موجود ہیں۔ وہ نظریاتی شاعری کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھتے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ "جو ادیب ۔۔۔ ارضی سطح کو مَس کیے بغیر آفاقیت کی باتیں کرتا ہے، وہ ۔۔۔ کسی نظریاتی مینی فیسٹو کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے"۔ (۳) یہ تحریک اپنے بنیادی نقطۂ نظر میں تخلیقی عمل سے بحث کرتی ہے۔ اس نے زمین کو تخلیق کا منبع قرار دیا ہے۔ اس کے ہاں آسمانی عناصر کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اصل اہمیت زمین ہی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> اس گروہ (ارضی ثقافتی تحریک کے ادبا) نے واضح انداز میں وطن دوستی کے مسلک کو اختیار کیا ہے اور ارض کے حوالے سے انسان کے اجتماعی لاشعور کو تخلیق کا منبع قرار دے کر تخلیقی عمل کا ایک نیا تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے خاص مقاصد پر ارض وطن کو قربان کرنے کے حق میں تھے، اس رجحان سے ہمیشہ ہی ناخوش رہے مگر وہ لوگ جو خاک کے ہر ذرے کو اپنے لیے دیوتا قرار دیتے تھے اس ارضی ثقافتی میلان کو حرزِ جاں بنائے رہے ـــــ اس اعتماد اور یقین کے ساتھ کہ ادب کے سوتے ارض ہی سے پھوٹتے ہیں اور قوم کی پوری ثقافتی تاریخ کے جوہر کو پیش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا تہذیبی اور ثقافتی جڑوں سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہوا میں معلق ہو جانے کے سوا اور کچھ نہیں نکلا۔ (۴)

پاکستانی ثقافت اور ادب کے بارے میں اس تحریک کے ناقدین کا خیال ہے کہ ان کی تشکیل میں اسلام کے نہایت گہرے اثرات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مٹی، ہوا، موسم اور اس کی تاریخ کا بھی ہاتھ ہے۔ اس ثقافت کی ابتدا اسی سرزمین سے ہوتی ہے اور باہر سے آنے والے اثرات نے اس کی بنیاد کو نہیں اکھاڑا بلکہ اس کو مستحکم کیا ہے۔ ان بیرونی اثرات نے اس سرزمین کے مزاج کا حصہ بن کر ثقافت میں نئی نئی پرتوں کو جنم دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مکتبۂ فکر پاکستانی ثقافت کی گہرائی اور تنوع کی نشان دہی کرتا ہے اور آسمانی رشتوں کے ساتھ ساتھ زمینی رشتوں کی اہمیت کا پوری طرح احساس دلاتا ہے۔(۵) پاکستانی ادب کی تحریک نے بھی آسمانی اور زمینی رشتوں کے امتزاج سے ثقافت کے تشکیل پانے کی بات کی تھی۔ لیکن اس میں فرق یہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی ادب کے نقادوں کے ہاں آسمانی عناصر کی حیثیت اساسی ہے اور زمینی عناصر ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ جبکہ ارضی ثقافتی تحریک کے ناقدین زمینی رشتوں کو اولیت دیتے ہیں۔

اس تحریک نے پاکستان قومیت کی تعریف ارضِ وطن ہی کے حوالے سے کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> زمین سے انحراف دراصل جذبۂ حب الوطنی کے منافی ہے اور اس تحریک میں چونکہ زمین سے مراد ارضِ وطن ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی قومیت کو اپنا مقصود نظر قرار دے کر یہ تحریک کسی منشور کی پابندی کے بغیر ہی وطن کی ایک بڑی خدمت سرانجام دے رہی ہے۔(۶)

ارضی ثقافتی تحریک کے اثرات ادب میں موجود تو ہیں لیکن بکھری ہوئی حالت میں۔ میراجی کے بعد ابھی تک کوئی ایسا تخلیق کار سامنے نہیں آتا جو مکمل طور پر اس تحریک کے خدوخال کی نمائندگی کرتا ہو۔ اکثر لوگ جن کے ہاں اس تحریک کے عناصر موجود ہیں، ان کی وابستگی بعض دوسری تحریکوں سے زیادہ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ تحریک ابھی تک کٹھالی(melting pot) میں ہے۔ اس کے اثرات ادب میں پھیل رہے ہیں لیکن نتائج اخذ کرنے کے لیے ابھی خاصی مدت درکار ہے۔(۷) تاہم اردو شاعری اور افسانے میں جہاں جہاں وطن دوستی اور زمین سے جڑنے کا رویہ پیدا ہوا ہے، اسے اس تحریک کے اثرات کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ انشائیے کی صنف میں رسوم و رواج اور عادات و اطوار کے حوالے سے مقامیت کا جو عنصر نمایاں ہوا ہے، اسے بھی اس تحریک کے اثرات کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

جدید دور میں میراجی پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں ہندوستانی ثقافت سے وابستگی کا اظہار واضح اور نمایاں ہے۔ انھوں نے نہ صرف دھرتی کے مظاہر کو علامات کے طور پر استعمال کیا بلکہ ان کے لسانی رویوں میں بھی ہندوستانی مقامیت کے آثار ملتے ہیں۔

آنکھیں کھول کے دیکھ جگت کو رنگ برنگ کی نیاری باتیں
ایک ہی چاند نگر آتا ہے تیری راتوں کو چمکانے
ناامیدی کے آکاش پہ چمکا ہے آشا کا ستارہ
مندر میں اک دیوا داسی سج کر آئی ناچ دکھانے

ہیرن ریت بری دنیا کی آنکھ سے جو بھی ٹپکا موتی
پلکوں ہی سے اٹھانا ہوگا پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

مجید امجد کے ہاں بھی دھرتی سے وابستگی کا رویہ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مقامیت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس سے ایک تازہ رویہ سامنے آتا ہے۔

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں امجدؔ
کھلیں وہ پھول بھی اک مرتبہ جو تو چاہے

پکارتی رہی بنسی بھٹک گئے ریوڑ
نئے گیاہ، نئے چشمۂ رواں کے لیے

ارضی ثقافتی تحریک کے غزل گوؤں میں وزیر آغا کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلیں ایک تو مقدار میں خاصی ہیں اور دوسرے ان کا ذائقہ ان کی معاصر غزل سے الگ بھی محسوس ہوتا ہے، اس لیے قابلِ توجہ ہیں۔ اپنی ادبی نظریہ سازی میں وزیر آغا نے تخلیقی عمل کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان کے ہاں اپنی دھرتی اور اس کے مظاہر سے جڑنے کی خواہش و کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے روزمرہ تجربات و مشاہدات اور تمثالوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر علامات و تلازمات کا ایک الگ نظام قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> وزیر آغا نے نظم کی وحدتِ تخلیق سے غزل کی ریزہ خیالی کی طرف پیش قدمی کی تو ان کے سامنے رنگوں کی نئی جولاں بکھر گئی۔ ان کی غزل بیج کے بارور ہونے اور ایک نئے پیکر کو وجود میں لانے کا تخلیقی عمل ہے۔ انھوں نے غزل کے نئے علائم و رموز پنجاب کے دیہات کی کھلی فضا سے تلاش کیے اور ظاہر کے پسِ پردہ ایک اور جہانِ معنی کی نشان دہی کی۔ ان کی غزل کا علامتی نظام ان کی معاصر غزل سے بالکل مختلف ہے۔(۸)

وزیر آغا کی غزل اپنے مناظر میں کشادگی کا احساس رکھتی ہے۔ اس میں فطرت سے قربت اور اپنی تہذیب و ثقافت سے وابستگی کی لہریں موجزن ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> وزیر آغا کے یہاں چمکدار نظری پیکر کم ہیں لیکن مٹیالے رنگ کی ان تصویروں میں فکری لکیریں گہری ہیں۔ وزیر آغا کے یہاں دیہاتی پس منظر محض کینوس کا کام نہیں دیتا بلکہ اس بنیادی اثاثہ کا امین ہے جس پر ان کے فکر کی عمارت اوپر اٹھتی ہے۔ ان کے یہاں تہذیبی ڈانڈے اور ثقافتی لہریں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔ ان کے پیکر پھیلے ہوئے، مدھم رفتار، مدھم رنگ، اس خاموش دریا کی طرح ہیں جو سب کو اپنے اندر سمیٹے سمندر کی جانب محوِ سفر ہے۔(۹)

سعداللہ کلیم نے 'تحرک' کو وزیر آغا کی غزل کا ایک اہم رجحان قرار دیا ہے۔ حرکت کی مختلف صورتوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ وزیر آغا نے اپنی غزلوں میں حرکت اور اس سے وابستہ قدیم و جدید نظریات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے وزیر آغا کی غزل کی لفظیات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ان (وزیر آغا) کے ہاں بعض ایسے استعارے، علامتیں اور بعض مفرد الفاظ بار بار آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہَوا، خوشبو، شبنم، پرندہ، صدا، سفر، رہوار، کارواں وغیرہ جن کے مفہوم میں 'تحرک' مشترک ہے۔ شاعر کے خیال کا بار بار ایسے الفاظ کی طرف لوٹنا ان کی غزل میں تحرک کے نمایاں رجحان کو ثابت کرتا ہے۔(۱۰)

وزیر آغا کے ہاں یہ تحرک زیادہ تر سیرِ ارض سے وابستہ ہے تاہم ان کی غزل کہیں کہیں ایک صعودی پرواز کا منظر بھی پیش کرتی ہے جس میں شاعر کائناتی سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ لیکن ''زمین سے آسمان کی طرف وزیر آغا کی اس جست یا اس لامتناہی سفر کے باطن میں اتر کر جھانکنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ آسمان سے شاعر کی اس محبت کے پس پردہ بھی درحقیقت اس کی زمین ہی سے گہری محبت کا جذبہ چٹکیاں لے رہا ہے''۔(۱۱) وہ آسمان کے خرابے کو بھی زمین کی طرح آباد دیکھنے کی آرزو کرتے ہیں۔

آئے وہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری
بنجر زمیں پہ میلوں تلک سبز گھاس ہو

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

آہستہ بات کر کہ ہَوا تیز ہے بہت
ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

کواڑ بجتے تھے اور دل مرا لرزتا تھا
میں برگِ سبز تھا لیکن ہَوا سے ڈرتا تھا
وہ ایک شخص کہ تاروں کی لَو تھا جس کا بدن
کبھی کبھی وہ زمیں پر اترنے لگتا
جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

Scanned by CamScanner

اُڑی جو گرد تو اس خاک داں کو پہچانا
کھلا کہ خاک سے تھا سارا خاک داں آباد

آنسو، ستارے، اوس کے دانے، سفید پھول
سب میرے غم گسار سرِ شام آئیں گے
ٹوٹے اگر سفر سے کبھی ہم تو ڈر نہیں
صورت بدل کے آئیں گے، بے نام آئیں گے

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پَر میں تھا

ارضی ثقافتی تحریک نے اردو شاعری میں مقامی عناصر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ ابتدا میں اس کا مرکز ہندوستانی تہذیب تھی لیکن جب یہ رویہ پروان چڑھا تو اس میں پاکستانی مقامیت اور علاقائی حوالے بھی نمایاں ہوئے۔ ارضی مظاہر اور ان سے وابستہ داخلی کیفیات کا بیان اور مقامی زبانوں سے جڑنے کے رویے نے بعد کے شعرا میں فروغ پایا۔ غزل میں اس کی کچھ مثالیں دیکھیے:

ابر نے دھرتی پر پھینکی نور کی چھینٹ اداس اداس
آج کی شب تو اندھی شب تھی آج کدھر سے نکلا چاند
(ابنِ انشاء)

اندر سبھا سے بڑھ کے ہے آشاؤں کی سبھا
آکاش دان دیتی ہے دھرتی پریم کی
(صہبا اختر)

بیتے لمحے دھیان میں آ کر مجھ سے سوالی ہوتے ہیں
تو نے کس بنجر مٹی میں من کا امرت ڈول دیا
(شکیب جلالی)

ہر اچھی صورت کا لوبھی، ہر کھ کا متوالا ہے
صاحب! دل کی بات نہ پوچھو دل کا ڈھنگ نرالا ہے
(حسن عابد)

ہم جوگ لے کے اور بھی برباد ہو گئے
آئی ہیں اپسرائیں بھی چھونے کو اب چرن
(نور بجنوری)

جشنِ وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار
ایک مجھے بس تو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار
(صابر ظفر)

سدا سہاگن گوری کو اس سے بڑی لاج آتی ہے
مست پون کا جھونکا آ کر جب چنری سرکاتا ہے
(تاج سعید)

دن ڈھلا پنچھی اُڑے ہنس بول کر
یار ہوٹل سے اٹھے ہنس بول کر
(ناصر شہزاد)

ڈوبا ہوا ہے حسنِ سخن میں سکوتِ شب
تارِ ربابِ روح میں کلیان کی طرح
(پروین شاکر)

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''نئے تناظر''، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۵۹
۲۔ ایضاً، ص ۶۰
۳۔ وزیر آغا، ''تنقید اور مجلسی تنقید''، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع اول ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۲
۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''نئے تناظر''، ص ۶۰، ۶۱
۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اختلافات''، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۲۸، ۲۹
۶۔ ایضاً، ص ۲۹
۷۔ ایضاً، ص ۳۰
۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۵۰۰
۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''پاکستانی غزل ۱۹۴۷-۱۹۸۱ء''، مشمولہ ''جدید اردو غزل''، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، بھارت، ۱۹۹۵ء، ص ۳۹
۱۰۔ سعد اللہ کلیم، ''محرک، وزیر آغا کی غزل کا ایک رجحان'' مشمولہ ''شام کا سورج'' مرتبہ: انور سدید، ڈاکٹر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۵۶
۱۱۔ جمیل ملک، ''وزیر آغا کی غزل'' مشمولہ ''شام کا سورج'' مرتبہ: انور سدید، ڈاکٹر، ص ۳۶۳

☆☆☆☆☆

ارشد ملک کے مضمون کا بقیہ

انہوں نے علامتوں کے وجود اور نظام کو بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔ صوفی اور فن کار کی بحث بھی دہرائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''آخر آخر دل کے چاک اور گریباں کے چاک میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس مرحلے پر عارف تو حالت جذب میں ہوتا ہے جہاں کثرت کا جہاں مٹ جاتا ہے یعنی زخم مندمل ہو جاتا ہے جبکہ تخلیق کار، ایک متوازی تخلیقی عمل کے ذریعے، خود کو کثرت کے عالم میں، از سرِ نو خلق کرنے لگتا ہے....... گویا اپنے زخم کو ہرا کرنے لگتا ہے........ دیکھو کتنا فرق ہے دونوں میں!

ڈاکٹر وزیر آغا کے اسلوب کی شگفتگی پر تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کے نظریات جدید اور مابعد جدید تنقید و تخلیق پر مشتمل ہیں۔ وہ امتزاجی تنقید کا نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس نے مروج تنقیدی رویوں کو وسعت عطا کر دی ہے۔ وہ الفاظ کو ان کی صوتیات، معنویت اور تہذیبی رچاؤ سمیت تخلیق میں سمونے کی قدرت رکھتے ہیں اور توازن پر زور دیتے ہیں۔ یہی وہ عنصر ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا تمام تر تخلیقات میں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ تنقید و تحقیق، لسانیات، بشریات، طبیعات اور فلسفہ ان کے موضوعات ہیں۔ طبیعات میں خصوصیت کے ساتھ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ''دستک اُس دروازے پر'' ایک بار پڑھنے والی کتاب نہیں ہے۔ اسے بار بار پڑھا جانا ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے

کتنی بار کہا تھا خود سے
مت اِتنا تم تیز چلو
سب چیزیں دونوں جانب کی
پیڑ، پرندے، کھیت اور ٹیلے
ڈر کر تم سے
اُلٹی جانب بھاگ اُٹھیں
اور تم اپنے کیپسول میں بیٹھے
نابینا آنکھوں سے بس بڑھتے ہی جاؤ
ایک بھی منظر دیکھ نہ پاؤ!

پر اب میں نے
جب سے اپنے شل قدموں کے ساتھ
لُڑھکنا سیکھ لیا ہے
بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے
اک اک چیز نظر آتی ہے
مجھ سے باتیں کرتی ہے
تم بھی اپنے
اُڑن کھٹولے کی مٹی سے
باہر آؤ
میرے شل قدموں سے اپنے
قدم ملاؤ
دونوں اِک دوجے کو دیکھیں
اِک دوجے کو
بن دیکھے تو
کتنے زمانے بیت گئے ہیں!

ڈاکٹر وزیر آغا

اوراق اور ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر محمد یار گوندل

شعبہ اردو ۔ سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

رسائل و جرائد کی دنیا میں دو کثیر الجہات شخصیات گزری ہیں ۔ ایک نیاز فتح پوری اور دوسرے ڈاکٹر وزیر آغا۔ اول الذکر ایک نابغہ عظیم تھے انھوں نے اردو زبان کے خط و خال کو سنوارنے میں اپنی زندگی کا ایک اک لمحہ قربان کر دیا اور اُردو اُسلوب کو ایک نئی جہت عطا کی ۔ اردو ادب میں اُن کی حیثیت ایک ادیب، شاعر، تنقید نگار، افسانہ نگار، محقق، انشاء پرداز اور ایک صحافی کی ہے ۔ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں "نگار" جاری کیا جو تادم آخر تک بلاتعطل چوالیس (۱۹۶۶ء) تک شائع ہوتا رہا۔ اُردو ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا تخلیقی فعالیت کا استعارہ ہیں ۔ ان کے تذکرے کے بغیر تاریخ اردو ادب ادھوری ہے ۔ انھوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی اور سر سید احمد خاں کی طرح ہر قسم کی معاصرانہ چشمکوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اپنے علمی و ادبی سفر کو جاری رکھا ۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک ادیب، شاعر، نقاد، محقق، انشائیہ نگار اور مدیر رسالہ کی ہے ۔ انھوں نے جنوری ۱۹۶۶ء میں "اوراق" جاری کیا جو دم واپسیں تک جاری رہا ۔ پاکستانی رسائل و جرائد کی کہکشاں میں "اوراق" ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

وزیر آغا کی باقاعدہ صحافیانہ زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے مولانا صلاح الدین احمد کے ایما سے "ادبی دنیا" کے شریک مدیر کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ ہر چند کہ وہ اس سے پہلے قسیم شاکل پوری کے ساتھ مل کر ایک ماہ نامہ جاری کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور انور گوئندی کے "کامران" میں قلمی معاونت بھی کر چکے تھے لیکن ان کوششوں کو ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ مولانا صلاح الدین احمد ایک ماہر جوہر شناس تھے ۔ وزیر آغا کی مولانا سے ملاقات ان کے بھانجے شمس آغا کے توسط سے ہوئی جو "ادبی دنیا" کے ایک نو عمر افسانہ نگار تھے ۔ وزیر آغا نے خود مولانا سے اپنی ملاقات کو ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے ۔ مولانا نے وزیر آغا کو مضمون نگاری کی طرف راغب کیا تو انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوع "مسرت" پر مضامین لکھنے شروع کیے ۔ "ادبی دنیا" میں چھپنے والے یہ مضامین ۱۹۵۴ء میں "مسرت کی تلاش" کے عنوان سے شائع ہو کر وزیر آغا کو صاحب کتاب ہونے کا اعزاز دلوا گئے ۔ "ادبی دنیا" کے دورِ پنجم کو بعض حوالوں سے یادگار بنانے کا سہرا وزیر آغا کے سر جاتا ہے ۔ "ادبی دنیا" کے ساتھ وزیر آغا کا رشتۂ ادارت تقریباً پانچ برسوں پر محیط ہے ۔ مولانا کے انتقال (۱۹۶۴ء) کے بعد وزیر آغا "ادبی دنیا" سے الگ ہو گئے اور جنوری ۱۹۶۶ء میں اپنا ادبی رسالہ "اوراق" جاری کیا ۔ انھوں نے "اوراق" کو مولانا صلاح الدین احمد کے مسلک ادب کے مطابق چلانے کا اعلان کیا جب ادبی دنیا کا آفتاب غروب ہو گیا تو انھوں نے "اوراق" کی پیشانی کو "مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں" کے الفاظ سے مزین کر دیا جو آج بھی "اوراق" کے سرورق پہ بے لوث عقیدت اور محبت کے اعتراف میں چمکتے نظر آتے ہیں۔

وزیر آغا اپنی ذات میں خود ایک ادبی دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد پانچ درجن سے متجاوز ہے ۔ اوراق میں وزیر آغا کے معاون مدیران میں عارف عبدالمتین (۱۹۶۶ء ۔۔ ۱۹۷۶ء تک)، پروفیسر سجاد نقوی (۱۹۷۶ء ۔۔ ۱۹۸۹ء تک) اور ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۹ء سے) جیسی نامور ادبی شخصیات شریک کار رہی ہیں ۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں جب سالنامہ "اوراق" کی ابتداء ہوئی تو پاکستان کو اپنی بقائے حیات کا معرکہ سر کیے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ۔ لہٰذا وزیر آغا نے مدیر کے طور پر رسالے کا ادبی موقف ارض وطن سے گہری وابستگی اور اس کا تحفظ قرار دیا اور اپنے ابتدائی اداریوں میں نظریہ پاکستان اور ارضی ثقافت کے حوالے سے خیال انگیز بحث کا آغاز کیا ۔ اوراق کے اولین شمارے میں ہی وزیر آغا نے لکھا کہ:

"پچھلے دنوں جب ہمارا وطن ایک زبردست خطرے سے دوچار ہوا تو ہم داخلی قوت کے حصول کے لیے اپنی ذات میں غوطہ زن ہونے پر مجبور ہو گئے اور یکایک یہ بات ہم پر منکشف ہوئی کہ ارض وطن تو ایک مقدس اثاثہ ہے جن کے ناموس کے تحفظ کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا بھی عین سعادت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سترہ روز کے ایک نہایت قلیل عرصے میں حب الوطنی کے صحیح مفہوم سے آگاہی ہوئی ہے اور ہم نے نظریاتی سطح سے نیچے اتر کر زمین کی بو باس کو سونگھا اور مس کے لمس کی حرارت کو محسوس کیا ۔ گویا اس طوفان سے پہلے ہم محض ہوا میں معلق تھے، لیکن طوفان کی یورش سے بچنے کے لیے مادر وطن کی آغوش میں اتر آئے اور ہمیں پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ آغوش کس قدر گرم، گداز اور حرارت بخش ہے یہی اس جنگ کا روشن ترین پہلو ہے"

اسی بنا پر اُن پر "دھرتی پوجا" کا الزام بھی لگا، لیکن ادب میں اس کے اثرات دور رس ثابت ہوئے اور آنے والے ادبا نے اپنی تخلیقات کو اپنے مخصوص تاریخی، معاشرتی، زمینی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنا شروع کیا ۔ اس تحریک کے اثرات اردو افسانے اور شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں ۔ افسانے میں یہ اثرات غلام الثقلین نقوی، صادق حسین، رشید امجد، مشتاق قمر اور فرخندہ لودھی کے ہاں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ فرخندہ لودھی کا افسانہ "پارہتی" جو اوراق کا اولین افسانہ بھی ہے اس تحریک کے ادبی رویوں کی تشہیر بھی ہے ۔ فرخندہ لودھی کے اولین افسانوی مجموعے "شہر کے لوگ" کے اکثر افسانوں کے کردار دھرتی کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں ۔ اسی طرح غلام الثقلین نقوی کا افسانوی مجموعہ "نغمہ و آگ" "مسعود مفتی کا رگ سنگ"، "ممتاز مفتی کا "پاکستان"، اے حمید کا "جاگتے رہنا" شہزاد منظر کا "یوٹوپیا" اور احمد ندیم قاسمی کا "کپاس کا پھول" اسی ارضی ثقافتی تحریک کے ادبی مسلک کا اجاگر کرتے ہیں ۔ ناول میں غلام الثقلین نقوی کا "میرا گاؤں"، عنایت اللہ کا "بی آر بی بہتی رہے گی"، انتظار حسین کا "بستی" اور چاند گرہن" سید انور کا "ایک اور سومنات" اور اختر جمال کا "پھول اور بارود" اسی ادبی رویے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شاعری میں جن شعراء کا کلام "اوراق" کی زینت بنتا رہا ان میں اختر ہوشیار پوری، شہزاد احمد، باقی صدیقی، ظفر اقبال، افتخار عارف، انور سدید، بشیر سیفی، انور محمود خالد، خورشید رضوی، کیف انصاری، افضل منہاس، شکیب جلالی، جون ایلیا، غلام جیلانی اصغر، مرتضیٰ برلاس، ریاض مجید، شاہد شیدائی، صبا اکرام، پروین شاکر، خالد اقبال یاسر، عابد سیال، ارشد ملک، عابد خورشید، افضل گوہر، شفیق آصف، اور اختر رضا سلیمی شامل ہیں۔

وزیر آغا کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنی تخلیقی فعالیت اور فکر و عمل سے اپنے ماحول پر گہرے اور دور رس مرتب کرتے ہیں انھوں نے بطور مدیر اوراق کی ادبی جہات متعین کرنے کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ادبی رجحانات و میلانات کی نمائندگی بھی کی ۔ "اوراق" نے جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور غیر منصفانہ نظامت سیاست کو بھی ہدف تنقید بنایا اور ساتھ ہی ایسے ادب کا خیر مقدم بھی کیا جو حیات انسانی میں مثبت اور تعمیری تبدیلیاں لانے کا سبب بنتا ہے ۔ وزیر آغا نے علمی و ادبی مباحث میں استدلال کو جذبات پر ترجیح دی اور ادبی

مباحث کو ادبی اسلوب میں پیش کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ اوراق نئے ادبی مباحث، تحریکات اور عصری ادب کے جدید رجحانات کا نمائندہ جریدہ ہے اس نے خرد افروزی، جدیدیت اور ارضی ثقافتی تحریکات کی آبیاری کی ہے۔ ارضی ثقافتی تحریک دوسری ادبی اصناف کے مقابلے میں "اردو نظم" میں زیادہ واضح انداز میں سامنے آئی۔ یوں اردو نظم میں حب وطن کا موضوع شامل ہوا۔ اس تحریک کے اثرات میراجی، وزیر آغا، بلراج کومل، جیلانی کامران، اور یوسف ظفر کی نظموں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

خرد افروزی کی تحریک کو پروان چڑھانے میں" اوراق" کے مدیر کا کردار نمایاں ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا نے مباحث کا ایک سلسلہ بعنوان "سوال یہ ہے" شروع کیا۔ اس مستقل عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا نے اپنے اداریے میں لکھا "سوال یہ ہے" اوراق کا ایک مستقل فیچر ہے۔ ہمارا طریق یہ ہے کہ ہم کسی ادیب کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ادب کے کسی اہم مسئلہ کے بارے میں اپنا سوال مرتب کرے۔ تب ہم اس سوال کی نقول ان ادباء میں تقسیم کر دیتے ہیں جو اس مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں یوں بحث ایک مربوط اور مرتب صورت میں ابھر آتی ہے۔"

یوں تنقید اور شاعری پر معیاری مباحث کا آغاز ہوا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نیا افسانہ، نئی نظم، انشائیہ، جدیدیت، ہائیکو اور ماہیے کے موضوعات پر بھی گراں قدر تنقیدی مقالات شائع ہوئے۔ ان مباحث میں شریک بحث اور "محرک" اردو ادب کی نامور شخصیات رہی ہیں جن میں افتخار جالب، سجاد باقر رضوی، غلام جیلانی اصغر، شہزاد احمد، صدیق کلیم، صلاح الدین ندیم، نظیر صدیقی، جمیل ملک، جیلانی کامران، بلراج کومل، عرش صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ابن فرید، انور سدید، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سلیم اختر، سلیم آغا قزلباش، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، عطاالحق قاسمی، صابر لودھی، وزیر آغا اور سجاد نقوی وغیرہ شامل ہیں۔ "سوال یہ ہے" کے موضوع میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں موضوع زیر بحث کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی جاتی تھی۔ چند ایک موضوعات کے عنوان یہاں درج کیے جاتے ہیں تا کہ اس سلسلے کی اہمیت واضح ہو سکے۔ نظم اور نثر کا فرق، اسلوب، جدید شاعری، تخلیقی عمل، افسانہ، تنقید اور اس کا فن، انشائیہ، پاکستانی ادب کا تشخص، جدیدیت، نثری نظم، ادب میں یاسیت پسندی، پاکستانی کلچر اور تہذیب، سفرنامہ، تحریک کیا ہے، علامتی افسانہ وغیرہ۔

تحقیق و تنقید کی دنیا میں "اوراق" نے نئے نئے گوشے وا کیے۔ اس ضمن میں چند کلیدی مقالات بھی شائع کیے گئے جن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" اور "ادبی تنقید اور اسلوبیات" وزیر آغا کا "حالی سے اقبال تک"، "ساختیاتی تنقید"، "مغرب میں نئی تنقید" اور "ساختیات اور پس ساختیات"، ڈاکٹر انور سدید کا "اسطوری تنقید" شامل ہیں۔ انشائیہ کی تنقید میں جمیل آذر کا مقالہ "انشائیہ کا ایک لطیف صنف ادب" اور انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک"، سجاد نقوی کا "اردو انشائیے کے خدوخال"، انور سدید کا "یورپ میں انشائیہ کی روایت"، اکبر حمیدی کا "انشائیہ کیوں اور کیسے؟" اور ڈاکٹر بشیر سیفی کا "کتابیات انشائیہ" نمایاں مقالات ہیں۔

"ہائیکو نگاری" کے عنوان کے تحت ہائیکو شاعری کے علاوہ ہائیکو نگاری پر تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے رہے جن میں ڈاکٹر پرویز پروازی کا "ہائیکو میں فکری وحدت" ڈاکٹر محمد امین کا "جاپانی ہائیکو"، قرۃ العین طاہرہ کا "اردو ہائیکو ایک نئی صنف سخن" خاور اعجاز کا "اردو ہائیکو کی شناخت" اور شارق جمال ناگپوری کا "جاپانی صنف سخن ہائیکو" اہم مضامین ہیں۔ علاوہ ازیں وزیر آغا نے اپنے اداریوں میں بھی شاعری کی اس صنف پر بطور خاص روشنی ڈالی ہے۔ اوراق کے صفحات پر جو شعراء ہائیکو نگاری کے حوالے سے سامنے آئے ان میں بشیر سیفی، نصیر احمد ناصر، اظہر ادیب، نسیم سحر، جمیل ملک، مناظر عاشق ہرگانوی، اور ناصر بشیر شامل ہیں۔

وزیر آغا نے عملی تنقید، جس میں افسانہ، انشائیہ اور نظم شامل ہیں "تجزیاتی مطالعہ" کے عنوان سے ایک سلسلہ قائم کیا۔ اس بارے میں اوراق کے شمارہ اول کے اداریہ ثانی میں عارف عبدالمتین نے لکھا کہ "نظم کا تجزیاتی مطالعہ" ہمارا وہ مستقل عنوان ہوگا جو جدید شاعری کی تحریک کو فروغ دینے اور نظم جدید کی افہام و تفہیم کی راہیں متعین کرنے کا فریضہ انجام دے گا۔" اس ضمن میں پچاس سے زائد نظم گو شعراء کی نظمیں تنقید تجزیے کے سان پر چڑھائی گئیں۔ تجزیہ نگاروں مجید امجد، جمیل ملک، سلیم اختر، شکیب جلالی، یوسف ظفر، عرش صدیقی، قیوم نظر، ڈاکٹر انور سدید، وزیر آغا، رشید امجد، جمیل آذر، سجاد نقوی، گوپی چند نارنگ، اور نصیر احمد ناصر وغیرہ شامل ہیں۔ اس عنوان کے تحت ستر سے زائد نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا جس میں شہزاد احمد کی "بلیک آؤٹ کی پہلی رات"، قیوم نظر کی "طوفان کے بعد"، ن۔م۔ راشد کی "تمنا کے تار" علی سردار جعفری کی "شعور" مجید امجد کی "موانست" اور صاحب کا فروٹ فارم، امجد اسلام امجد کی "ماندگی کا وقفہ" خورشید رضوی کی "جنت" اور "طلوع"، شکیب جلالی کی "پاداش" فیض کی "دست تہ سنگ آمدہ" اور "تنہائی"، مجاز کی "آوارہ"، میراجی کی "رقیب" اور "کلرک کا نغمہ محبت"، منیر نیازی کی "ایک آسیبی رات" اور وزیر آغا کی "اوراب سنا ہے" شامل ہیں۔ اوراق نے جولائی، اگست ۱۹۷۷ء میں جدید نظم نمبر بھی شائع کیا۔

اردو انشائیہ اور ڈاکٹر وزیر آغا لازم و ملزوم ہیں۔ وہ نہ صرف باقاعدہ اردو انشائیے کے بانی ہیں بلکہ انشائیے کی تنقید کی خشت اول بھی اپنے دست کمال سے رکھی۔ لہٰذا بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ "اوراق" پاکستان کا وہ واحد ادبی جریدہ ہے جس نے انشائیہ کے فروغ، اس کے خدوخال اور مزاج کو سنوارنے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ وزیر آغا نے اپنے اداریوں میں اس صنف ادب پر ہر زاویے سے روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اصناف نثر میں انشائیہ ایک مستقل صنف ادب ہے جو مضمون سے الگ تھلگ ہے۔

انشائیہ کے ضمن میں "اوراق" نے اپریل مئی ۱۹۸۵ء میں انشائیہ نمبر شائع کیا جس میں غیر ملکی انشائیوں کے تراجم بھی شائع ہوئے۔ مترجمین میں انور سدید، سلیم آغا قزلباش، ممتاز احمد خاں، خالد صدیقی، وقار النساء آغا شامل ہیں۔ تا حال ایک سو کے قریب انشائیہ نگاروں کے پانچ سو سے زائد انشائیے اوراق کی زینت بن چکے ہیں مشتاق قمر اور جمیل آذر کی انشائیہ نگاری کی مشاطگی میں وزیر آغا کا براہ راست کردار نظر آتا ہے۔ مذکورہ انشائیہ نگار وزیر آغا کے تربیت یافتہ ہیں۔ ثقہ ادباء کے ساتھ ساتھ نو واردان ادب کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔

اردو افسانے کے فروغ میں بھی اوراق کا کردار نمایاں رہا ہے۔ اب تک ایک ہزار کے قریب افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوی ادب کی شخصیات پر بھی تقریباً چالیس مضامین و مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں غلام الثقلین نقوی، ممتاز مفتی، مشتاق قمر، رشید امجد، منشا یاد، فرخندہ لودھی وغیرہ شامل ہیں۔

"اوراق" پاکستان کا پہلا جریدہ ہے جس نے نئی تنقید اور بالخصوص ساختیات اور پس ساختیات کے تنقیدی مباحث پر جامع مقالات شائع کیے ہیں۔ جدید تنقید وزیر آغا کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع پر خود وزیر آغا نے عالمانہ مقالات تحریر کیے جن میں "ساختیاتی تنقید"، "مصنف، متن اور قاری" وغیرہ شامل ہیں۔ دیگر اہل قلم میں ریاض صدیقی کا "ساختیات منظر اور پس منظر" قاضی قیصر الاسلام کا "پس ساختیات اور تنقیدی نظریہ" اور ناصر عباس نیر کا "ساختیات اور ساختیاتی تنقید" اور "ساخت شکنی کیا ہے" شامل ہیں۔

پاکستانی رسائل و جرائد کی تاریخ میں "اوراق" کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کے دو مستقل عنوانات، "سوال یہ ہے" اور "اداریے" کتابی صورت میں بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اوراق کی سبھی کامرانیوں کا سہرا اس کے مدیر کے سر جاتا ہے جس نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر رسائل کی دنیا میں اوراق کو نمایاں مقام دلوایا۔

❖OOO❖

دستک اور دروازہ

ارشد ملک

ڈائریکٹر پبلی کیشنز یونی ورسٹی آف سرگودھا k Z

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی بیش قیمت تصانیف سے موجودہ اُردو ادب کے دامن کو تفکر اور تحیّر سے بھر رکھا ہے۔ زمانہ قدیم کے حکماء علم و دانش کے بہت سارے شعبوں میں دسترس رکھا کرتے تھے۔ اور اکثر طب و حکمت کے ساتھ ساتھ فلسفہ و منطق، ادیانِ عالم اور ریاضی کے علم میں یکتا ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تاریخ جغرافیہ اور ستاروں کی چالوں تک سے عالمانہ واقفیت اُن کے سلسلۂ علم و حکمت کی کڑیاں ہوتی تھیں۔ ایک اُستاد پوری یونیورسٹی کا درجہ رکھا کرتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اسی طرح کی نابغۂ روزگار ہستیاں خال خال نظر آنے لگیں۔ استدادِ زمانہ سے یہ تعداد گھٹتے گھٹتے معمولی رہ گئی اور قحط الرجال جیسی صورت پیدا ہو گئی۔ اب سپیشلائزیشن کے اس دَور میں وہ ''آل اِن ون'' کا زمانہ فیری ٹیلو کی طرح کا دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا اہم ترین پہلو اُن کے مطالعے کی وسعت ہے۔ وہ قدیم حکماء کی طرح بہت سے علومِ قدیم و جدید پر اُسی طرح دسترس رکھتے ہیں۔ جس طرح اُردو ادب پر۔ وہ بیک وقت شعر و ادب، بشریات اور طبیعیات کے علوم میں مہارت رکھتے ہوئے لسانیات کے بڑے عالم کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ دورِ موجود کے نقد و نظر میں اُن جیسا دوسرا موجود نہیں ہے کہ اُن کا تعلق شعر و ادب کے ساتھ ہی نہیں فنونِ لطیف کے تقریباً ہر شعبے کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ وہ مصوری کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں جتنا شعر و ادب کے، وہ رقص اور سُر ودو کے اور پردہ سیمیں کے بھی اتنے ہی 'جانو' ہیں جتنے تنقید و تخلیق کے ہیں۔ تنقید کے لیے وہ حرفِ آخر ہیں تو تخلیق کو تخلیق کائنات سے بھی بہت پہلے کا جانتے ہیں۔ گویا انہوں نے اتنے سارے علوم و فنون کو گھول کر پی رکھا ہے۔ خصوصاً جدید علوم میں ان کی مطالعاتی وسعت کا تقابل، عصرِ حاضر کے کسی بھی بڑے عالم سے کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے اوصاف میں سے چند ایک بڑے وصف تلاش کیے جائیں تو کچھ اس طرح کا منظر نامہ بنتا ہے۔

اُن کی مطالعاتی وسعت میں درجنوں علوم کا ذکر آتا ہے۔ نقطۂ نظر میں تنقید کے نئے پُرانے تمام مکتبہ ہائے فکر سے وہ کماحقہٗ واقف ہیں اور اپنا نقطۂ نظر بھی رکھتے ہیں۔ تخلیق میں اُن کے میدان کئی ہیں۔ مثلاً تخلیقی تنقید، جدید ترین نظم، جدید غزل، انشائیہ، فکری مضامین، طویل ترین نظم، سوانح عمری، سفرنامہ، صحافت وغیرہ وغیرہ تحیّر وہ خصوصی عنصر ہے جو وہ علوم کی ایک دوسرے پر تطبیق کے بعد اُن کی تحریروں میں ایک مسرت بخش کھلکاری کے طور پر موجود رہا ہے۔ حکیمانہ طرزِ تفکر کے ساتھ وہ کائناتی رشتوں کا ادب کے ساتھ تقابل کرتے رہے ہیں۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ نتائج حاصل کرتے ہیں اور طفلانہ تحیّر کے ساتھ اپنے نتائج پر خندہ بر لب نظر آتے ہیں۔

''دستک اس دروازے پر'' کی بظاہر سادہ لسانیات اور عمومی زندگی سے متعلق موضوعات کے پیچھے ایک گہری اور عارفانہ فکری نظام کی موجودگی ایک ایسے تخلیق کار کا ہیولا تراشتی ہوئی نظر آتی ہے جس پر تصوف کے اثرات ہیں مگر وہ صوفی نہیں ہے۔ جس پر فلسفہ کا اثر بہت گہرا ہے مگر وہ فلسفی نہیں ہے جس کی اسطور کے ساتھ رغبت ہے مگر وہ اساطیری عارفین سے مختلف ہے۔ جس کو ویدانت کی گھٹی ہے مگر وہ ویدانت سے آگے نکل کر سوچتا اور لکھتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی ایک کتاب کی تلاوت ہی سے وضاحت پذیر ہوتا ہے۔ کچھ تو ہے جو اُنہیں فلسفے کے گہرے اثرات کے باوجود فلسفی نہیں ہونے دیتا، تصوف کے عمدہ جان کار ہونے کے باوجود صوفی نہیں ہونے دیتا۔ اساطیر کا تھری ڈائمنشنل علم رکھنے کے باوجود مائتھالوجسٹ نہیں کہلانے دیتا، اُردو، انگریزی، پنجابی اور فارسی لسانیات پر گہری نظر بھی انہیں ماہر لسانیات کے طور پر سامنے نہیں لاتی، طبیعیات کا شاندار علم بھی انہیں ماہر طبیعیات نہیں بننے دیتا تو پھر وزیر آغا کیا ہیں؟ .... یقیناً ایک تخلیق کار ایک بڑے تخلیق کار۔ پور پور میں گندھی ہوئی تخلیقی توانائی کے بیش قیمت پیش کار — اس کتاب میں انہوں نے تخلیقی توانائیوں کی حیرت انگیز مثال پیش کی ہے۔ ان توانائیوں کے عقب میں رواں دواں حیرتِ مسلسل کو بیان کر دیا ہے اور پھر اس حاصل تحیّر کو خندۂ زیرِ لب کی صورت میں دکھایا ہے جو فلسفی کے ہاں مفقود ہوتا ہے ورنہ فلسفہ کے معانی و مطالب کو دیکھا جائے تو یہ اُس تلاشِ حقیقت کی بات ہوتی ہے جو تجربے اور مشاہدے کے بعد اور گہرے غور و فکر کے بعد اصول اخذ کرنے پر ختم ہوتی ہے۔ یونانی فلسفیوں کے ہاں خدا، صفاتِ خدا اور زمان و مکاں کے علاوہ کائنات، خیر و شر، روح و عقل، حیات و ممات اور خوشی و غم کے مسائل زیرِ غور رہے ہیں۔ طبیعیات بھی ان کے غور و فکر میں شامل رہی ہے۔ یونانی فلسفیوں نے ہی زمین پر پانی اور پھر نباتات، جمادات اور حیوانات کے ظہور کا فلسفہ دیا تھا تو یہ کائناتی مسائل کی تہہ در تہہ حقیقت کو تلاش کرنے کا نتیجہ تھا۔ لغت میں بھی اسے تلاشِ حقیقت کے معنی ہی میں لیا گیا ہے۔ یونانی فلسفیوں میں کئی طرح کے لوگ تھے۔ ایک تو دہریے تھے جو خدا کے وجود سے منکر تھے۔ دوسرے وہ جو حرکت و تغیر اور کائنات کے تخلیقی عناصر پر بحث کو اہم سمجھتے تھے پھر وہ بھی تھے جو خدا اور خدا کی صفات پر غور و خوض میں مصروف رہتے تھے۔ گویا یہی وہ بنیادی مسائل تھے جو فلسفیوں کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ پاپلیس، زینو، فیثا غورث وغیرہ کو الہام سے واسطہ نہیں تھا مگر مسلمان فلسفیوں امام غزالی، کندی، فارابی، سینا وغیرہ وغیرہ کے اپنے گروہ تھے جن کے نزدیک الہام و مراقبہ کو بھی مسائلِ حیات کا حل سمجھا جاتا تھا مراقبے، کشف اور عبادات کو بھی نگاہوں سے پردے اُٹھانے کے ذرائع کے طور پر جانا اور مانا جاتا تھا۔

''دستک اُس دروازے پر'' بھی ان مسائل پر بات کرتی ہے۔ مشاہدوں اور تجربوں کو پرکھنے کا عالمانہ انداز آسان فہم پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ بالکل ویسا ہی ہے، جیسا رازی، آمدی، زحل بغدادی اور صدرا شیرازی وغیرہ کے ہاں ہے۔ جنہوں نے محض یونانی فلسفہ کی شرح کی اور اپنی طرف سے کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا بھی کائناتی اور معاشرتی مسائل کی صحیح شرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اکثر اوقات نتیجہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ البتہ وزیر آغا ایک تخلیق کار فلسفی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

فلسفی یہ نہیں بتاتا کہ زندگی بسر کیسے کرسکتے ہیں۔ بلکہ یہ بتایا ہے کہ زندگی کہتے کس کو ہیں۔ روشنی سے کام لینا اچھی بات ہے مگر یہ روشنی ہوتی کیا ہے؟ یہ وزیر آغا بتاتے ہیں۔

''دستک اُس دروازے پر'' کا مطالعہ کرتے ہوئے ان میں صوفیانہ، فلسفیانہ اور عالمانہ مباحث کے علاوہ ان کا وہ سائنسی نکتہ نظر بھی سامنے آتا ہے جس کی تطبیق جدید ترین ماہرین طبیعیات پر ہوتی ہے۔ ''دستک اُس دروازے پر'' ایک ایسی کتاب ہے جو فلسفے، تصوف اور سائنس کو معاشرتی و تہذیبی علوم کے ساتھ نہ صرف جوڑتی ہے بلکہ بشریات کے حوالے سے گہرے فکری مطالعے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب کو کل نو دنوں پر تقسیم کیا ہے اور یہ نو دن دراصل ایک مکمل عرصۂ حیات پر مشتمل ہیں۔ اگر اُن کے

ایک دن کو ایک دہائی تصور کر لیا جائے تو یہ وہ دو کم نوے سال ہیں جو انہوں نے دنیائے موجود میں اپنی وسعتِ مطالعہ کے جلو میں گزارے۔ ان کی تصور پسندی، صوفی مزاج طبیعت اور سائنسی طرزِ فکر نے نو دہائیوں کو نو دنوں میں سمیٹ لیا ہے۔ مسائل سارے تہذیبی و معاشرتی مدّ و جزر کے ہیں۔ گزرے ہوئے کل سے جڑے ہوئے معاملات ہیں۔ امروز کے طلوع و غروب کے مناظر ہیں اور آنے والے کل کی وہ تہذیبی جھلکیاں ہیں جو سائنسی اُتار چڑھاؤ کے دَور کی جدت پسند عکاسی کرتی ہیں۔ ان نو دنوں کا مطالعہ دراصل اُن کے زندگی بھر کے تجربات کا حاصل جمع ہے۔ مَن و تُو کے مکالمے تو عرصۂ قدیم سے حکما میں مروّج ہیں مگر یہاں مَن و تُو کا پیشِ منظر وسیع تر ہے۔ رنگ رنگ کے مدّ و جزر تصویر کرنے کی ایک عمدہ کوشش کے طور پر یہ کتاب بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ موضوعات سادہ اور پُرکار ہیں اور بظاہر ایک سادے سے جملے کے پیچھے بہت سا فلسفہ قطار اندر قطار رکھا ہوا ہے۔ آیئے اس کتاب کا جائزہ نو دنوں کی تقسیم سے کرتے ہیں۔ نو دنوں کو نو سال میں، نو دہائیوں میں یا پھر نو صدیوں میں دیکھا جاسکتا ہے جو جتنا دیکھ سکتا ہو، وہیں تک دکھائی دیتا ہے۔

پہلے دن کے موضوعات شعور، موسیقی، رقص، آزادی، آزاد روی اور تخلیقی عمل کے ہیں۔ گاؤں اور شہر کا تقابل بھی اپنے طبعی خال و خد کے ساتھ موجود ہے۔

شہر کے شور اور بڑھتی ہوئی رفتار کو وہ بیسویں صدی کو لگی ہوئی بیماری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں بڑھتی ہوئی رفتار نے شور شرانگیز پیدا کر دیا ہے۔ ''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے پوری بیسویں صدی چلا رہی ہے۔ اس نے تو آسمان سر پر اُٹھا لیا ہے (۱۴)۔ وہ جنریشن گیپ کو بھی اسی رفتار کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں ''........ تم سُست رفتار اور خاموش طبع زمانے کی پیداوار، یہ لوگ صبا رفتار اور بلند آہنگ زمانے کے باسی'' (۱۵)۔ رقص و موسیقی کے مکالمے میں وہ لکھتے ہیں۔ ''موسیقی کو دیکھو، کیا وہ سُر کا رقص نہیں؟ اور رقص کو دیکھو، کیا وہ جسم کی موسیقی نہیں؟ رقص اور موسیقی ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ دونوں کی گرامر ایک ہے (۱۶)۔ دل کی دھڑکن کو طبلے کی تھاپ سے مشابہہ قرار دیتے ہیں اور لفظ 'کُن' کو دستک سے۔

دوسرے دن کا مکالمہ نیند کے نہ آنے سے، نیند کی گولیوں اور نشہ آور اشیاء سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ''........ جب کسی شخص کی رفتار معمول سے زیادہ ہو جاتی تو وہ بھنگ یا افیون سے اپنی رفتار کم کر لیتا مگر نئی پود تو رُکنے یا ٹھہرنے پر مائل ہی نہیں۔ اُسے تو کوئی ایسا نشہ درکار ہے جو اُسے مزید متحرک کر سکے'' (۲۲)۔ تیز رفتار کھیل، سُپر سانک جہاز اور بیسویں صدی کو آزادی کی علامت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ بڑے ممالک کا چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تبدیل ہونا حتیٰ کہ خطوط، مصوری اور نظم کے اندر تشبیہ واستعارہ اور اُس سے تجریدی علامتی انداز کا ظاہر ہونا بھی آزادی گردانی گئی ہے۔ اسی طرح نیوٹن کی طبیعات کی بجائے کوانٹم تھیوری کے آجانے پر بات کی گئی ہے جو حقیقت کو مرکز سے آزاد سمجھتی ہے۔

وہ تخلیق، کوڈ، ڈی کوڈ، این کوڈ اور آخر میں آزادی کی پابندی پر بات کرتے ہیں۔ جیسے ''ہر آزاد عمل اپنے گرد ایک نئی پابندی کا ہالہ تعمیر کرتا ہے۔ یہی فن کا چلن ہے'' (۳۴)۔ اس باب میں نشہ آور اشیاء، آزادی، آرٹ، شاعری اور پابندی پر بات کی گئی ہے۔ وہ شعر کو کلیشوں سے آزاد اور جذبے کی طرح نیم دیکھنا چاہتے ہیں مگر مادر پدر آزاد نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر تخلیق کی پابندی نہ ہو تو آوازیں شور میں، رنگ دھبوں میں اور خطوط گنجلک میں تبدیل ہو جائیں گے گویا انہوں نے آزادی اور پابندی کے ضمن میں سُروں، رنگوں اور خطوط کی بات بھی کی ہے۔

تیسرے دن کے مکالمے میں نیند اور بیداری کی جزوی اور مکمل صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اجتماعی لاشعور کا ذکر ہے گویا جدید نفسیاتی علوم بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ دائیں اور بائیں دماغ، Being اور Becoming اور دونوں دماغوں کے درمیان کے کوریڈور کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ سب معاملات جدید فزکس اور جدید سائیکالوجی کی مدد سے سمجھائے گئے ہیں۔ اس شاندار فکری مکالمے میں چھوٹی چھوٹی اور چیزیں جیسے شہر کو بیدر تسبیہ پادیکھنا، سگریٹ کو Erotic Pleasure کے طور پر لینا، سانس لینے کے عمل کو کائناتی عمل سے تشبیہ دینا، زمان و مکاں، میٹر اور اینٹی میٹر، ستارے، کہکشائیں، سیارے اور بلیک ہول سمیت سانس لینے کے عمل اور دل کی کارکردگی کا موازنہ کرنا گویا مکالماتی انداز میں اشیاء کا فکری و فنی تجزیہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ فزکس کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی انتہائی دلچسپی اور فزکس میں ہونے والی تیز ترین تبدیلیاں اُن کے مطالعہ کا اہم حصہ رہی ہیں۔

اسی مکالمے میں دماغ کے دونوں حصوں یعنی پُرانے دماغ اور نئے دماغ کے درمیان کے کوریڈور 'کارپس کلوسم' کو اور تخلیقی توانائیوں کے حصول کو طبیعات کی تھیوری کی روشنی میں دیکھنا صرف ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ ہے۔ وہ اس کو الیکٹرون، پروٹون اور الیکٹرو میگنیٹک فورس کے طور پر لے کر صوفی اور تخلیق کار کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''صوفی اندر کے جہان کو صورت پذیر نہیں کرتا........ وہ بُت تراش نہیں ہے........ جب کہ فن کار قوت کو صورتوں، شبیہوں اور سُروں میں ڈھال کر ایک متوازی تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرتے دیکھے گئے۔ اسی لیے شاعر کو تلمیذ الرحمان کا لقب ملا ہے کہ وہ ہمیشہ تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرتا ہے جبکہ صوفی خوشہ چین اور تقسیم کار ہے'' (۴۰)۔ اس باب کے آخر میں دی گئی نظم 'سمندر اگر میرے اندر گرے' بھی معنی خیز ہے۔

چوتھے دن کے آغاز کا مکالمہ گزشتہ رات کی پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند سے شروع ہوتا ہے۔ ''وہی چماروں کی دلہن والا قصہ ہُوا، مبارک باد! اب تم آوازوں کے ساتھ رہنا سیکھ گئے ہو'' (۴۵)۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر میں شگفتگی کا عالم اسی طرح برقرار رہتا ہے جس طرح ان کی محافل میں موجود ہوا کرتا تھا۔ مثلاً یہاں چماروں کی دلہن کا قصہ ہے۔ پہلے دن کے مکالمے میں ایک جملہ ''گویا تمہارے علاوہ بھی شہر میں کچھ قابلِ دید مقامات ہیں'' اور دوسرے دن کے مکالمے میں ''میں نے آج تک کسی گھوڑے، بھینس، پرندے یا دیہاتی کو نیند کی گولی لیتے نہیں دیکھا'' یہ ساری تحریریں اُس شگفتگی کو نہ صرف برقرار رکھتی ہیں۔ بلکہ تسلسل کے ساتھ خندۂ زیرِ لب کے طور پر موجود رہتی ہیں۔

مکالمہ اخبارات، خبر اور اُس کی چیرہ دستیوں سے شروع ہوتا ہے۔ ٹریفک کے بے پناہ شور کا اخبار کی خبروں کے شور میں دب جانا اور اخبارات کے فوائد و نقصانات پر گفتگو کی ابتداء کی گئی ہے مگر کائنات کے گورکھ دھندے کو طبیعات کے تناظر میں دیکھے جانے کے بعد جسم کی زبان یعنی رقص پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اخبارات سے ہیجان خیزی، شور، سنسنی، گلے اور اجتماع کی بھیڑ چال، فیشن کا طلوع و غروب، تعمیری تخریبی رویے، جذبات واحساسات کے اجتماعی جزر و مد اور غیر معیاری معلومات وغیرہ سے ہوتے ہوئے وہ cell اور انسانی دماغ کی کارکردگی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ تکوین کی بات بھی ہوتی ہے تخلیقِ کائنات کے چار مادوں یعنی آگ پانی ہوا اور مٹی کی بات بھی ہوتی ہے پروٹون، نیوٹران اور الیکٹران کی تھیوری بھی بیان ہوتی ہے جو DNA تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق میں چار کے ہندسے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ چار اطراف، چار موسم، چار عناصر حتیٰ کہ قصہ چہار درویش اور مادہ کے چار بنیادی پارٹیکلز۔ وہ ایٹم کے سوشل گروپ کی بات بھی کرتے ہیں اور باہمی رشتوں کے جال کی بھی۔ وہ کوارکس کے، ایٹم کے سوشل گروپس کا عالمانہ تجزیہ کرتے ہوئے، مادہ کے مراحل پر بات ختم کرتے ہیں۔ سیل، ایٹم، نیوکلس اور انرجی کو نبض کی ٹک ٹک، طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار تک لے جاتے ہیں اور نبض یا تال کو بالآخر کائناتی رقص کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ہیئت اور مواد کے فرق کو انہوں نے پورے فکری انہماک کے ساتھ تازہ ترین سائنسی حوالوں سے پیش کیا ہے۔ اُن کے خیال میں:

انرجی رقص ہے اور مادہ رقاص

پرانا دماغ رقص ہے اور نیا دماغ رقاص

ہیئت رقص ہے اور مواد رقاص

مکان رقص ہے اور زمان رقاص اسی طرح انہوں نے تخلیق کاری کے تین کرداروں کی بات کی ہے یعنی کوزہ گر، گِل کوزہ اور وہ شبیہہ جو کوزہ گر بناتا ہے۔ یونانی مائیتھالوجی، صوفیا، تقلیب اور نقل کا فرق بھی اسی مکالمے میں وضاحت کے ساتھ

بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں کلاسیکی رقص، مخلوط بدن اور جسم کے دائروں، مثلثوں اور دست و بازو کی استعاراتی زبان سے ہوتی ہوئی کلاسیکی رقص کی اقسام پر فن کارانہ تبصرے اور "نشرگاہ" کی استعاراتی نظم پر یہ گفتگو، اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

پانچویں دن کا مکالمہ کے شروع میں ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ "ہر فن دیگر فنون کی حاصل جمع سے "کچھ زیادہ" ہوتا ہے۔ اور یہ "کچھ زیادہ" ہونا جو اُس فن کی پہچان ہے، ایک پُراسراری شے ہے" (۶۸)۔

پانچواں مکالمہ گذشتہ دن کے رقص دیکھنے کی یادداشتوں سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے رقص کے دوران رقاصہ کو درمیان میں سے گم ہوجاتے دیکھا۔ مثلثیں، دائرے، قوسیں اور رقص و موسیقی کا انجذاب دیکھا خوشبو، رنگ اور شکلیں ایک دوسرے میں ضم ہوتے دیکھیں حتیٰ کہ شاعری اور مصوری بھی رقص کا حصہ ہو گئیں۔ آہنگ کو انہوں نے وسیع تر معنوں میں سمجھایا پھر کارخانہ قدرت کا تانا بانا فزکس کے ماہر کی نظر سے دیکھا اور دکھایا۔ میٹر اور انرجی میٹر کی جوڑی۔ ظلمت و نور، شب و روز، آفتاب و ماہتاب، شور و خاموشی Being اور Becoming اور ہر طرف جوڑے ہی جوڑے، اور یکجائی و دوئی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ توازن کی بات خصوصیت کے ساتھ سمجھائی گئی ہے۔ اس تمام گفتگو میں عمومی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی بڑے سادہ و پُرکار انداز میں سمجھا دیے گئے ہیں۔ روزبارہ گلاس پانی پینا چاہیے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا یہ مرکب کیوں ضروری ہے۔ ہائیڈروجن کی اور آکسیجن کی سائنسی تخلیق کیا ہے؟ ویو (wave) اور پارٹیکل کیا ہیں؟ ساتھ ساتھ وہ فرد، معاشرے، اجتماع، گروہ، سپرمین، مردِ مومن سپر ریس، سپر نیشن وغیرہ کی اصطلاحوں کی تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ خیر و شر کیا ہے؟ اور خیر و شر کی اکیسویں صدی میں کیا صورت ہو گی یہ بھی انہوں نے اسی پانچویں گفتگو میں بتایا ہے۔ حجری دور کی قوت ماناٗ، روحانیت اور Psychokinesis کے ڈانڈے بھی ملائے ہیں۔ گویا بشریات، نفسیات اور طبیعیات پر حکیمانہ عبور کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی، معاشرتی اور تہذیبی رویوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ "مراجعت" پانچویں مکالمے کے آخر میں دی گئی نظم ہے۔

چھٹے دن کا آغاز "جانتے ہو باہر کی گڑگڑاہٹ ختم کرنے کا آسان طریقہ کیا ہے........ یہ کہ تم اندر کی آوازیں سننا شروع کر دو" (۹۱)۔ اور "........ مگر علم بہرحال عرفان کے سفر میں محض ایک مرحلہ ہے۔ بقول شخصے، کچھ دور تک صوفی ہرن کے نقوش پا دیکھ دیکھ کر چلتا ہے، پھر وہ نافۂ آہو کی خوشبو سے بندھا آگے بڑھتا ہے۔ یہ نافۂ آہو والا مرحلہ دراصل اندر کی آوازوں کا مرحلہ بھی ہے۔ "اندر بوئی مشک مچایا" (۹۳)۔ وزیر آغا بتاتے ہیں کہ تین ہزار سال پہلے انسان اندر کی آوازوں سے جُڑا ہوا تھا اور انہی آوازوں کو دیوتاؤں کی آوازیں سمجھا کرتا تھا۔ یہی آوازیں اب فنونِ لطیفہ کے ذریعے اپنا اظہار کرنے لگی ہیں" (۹۳)۔

چھٹے دن کے مکالمے میں Fault یا شگاف سے برآمد ہوتی ہوئی مصورانہ، شاعرانہ اور فنکارانہ کاوشوں کا ذکر ہے پھر زلزلوں اور tectonic plates کی بات کی گئی ہے۔

چھٹے مکالمے میں جولین جیمز، فرانس کے ڈریڈا، پھر سوشیور، برگساں، ایلیٹ، فرائڈ، درکھیم، کارل مارکس، شپنگلر، سوروکن، ٹائن بی، جیکب سن، رچرڈز، ایمپسن، لیوس، جان کرو رینسم، ایلن ٹیٹ، کلینتھ بروکس وغیرہ کے نظریات کو آسان لفظوں میں سمجھا دیا گیا ہے۔ مگر اس طویل فہرست میں لسانیات، نفسیات، بشریات اور طبیعیات کے انکشافات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

پھر یہ بحث، کُن، کے spoken word سے شروع ہو کر، ہندوؤں کی "سرتی" سے ہوتی ہوئی تقلیب و تجسیم تک اور پھر عہد نامہ قدیم سے قرآن کریم کی آیات تک سے وضاحتیں لیتی ہوئی اور پر دیے گئے فلسفیوں کے اقوال تک جا پہنچتی ہے۔ فرائڈ کی نفسیاتی اُلجھنوں سے، برگساں کے serial time تک، آئن سٹائن کے space continum سے parole اور langue تک ایک وسیع تفکرانہ تسلسل کو گرہ در گرہ کھول دیا گیا ہے۔ کیا ویدانت، کیا تصوف، کیا تخلیق اور کیا فن، علم کا دریا ہے جو ٹھاٹھیں مارتا چلا جاتا ہے اور اس مَن و تُو کے درمیان قاری کا کام، بہے چلے جانے کا رہ جاتا ہے لُبِ لباب یہ کہ اندر کی آوازوں کے انسلاک کے بغیر تخلیق کرنا ممکن نہیں رہتا۔

ڈاکٹر وزیر آغا بھی تمام تر دراج کو بالآخر سمری پر ہی لے آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے تفکر میں سائنس کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ تخلیقی نظام کو وہ اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں جبکہ ایک صوفی جیسا، وید جیسا یا قدیم حکماء جیسا رویہ ان کے طرزِ زندگی میں خصوصیت کے ساتھ سامنے آتا ہے تصوف، مذہب، سائنس اور فنِ تخلیق کے اس عالمانہ آمیزے سے وہ کُل گوزہ تشکیل پاتی ہے جس سے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکری پیکر کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔

ساتواں دن انسانوں کی باہمی آویزش میں نسلی منافرت کے کردار سے شروع ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسانوں کی باہمی آویزش کا دوسرا روپ مذہبی آویزش کی صورت میں ظاہر ہوا اور منافرت کا تیسرا روپ ثقافتی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جس میں زبان کا فرق بھی شامل ہے۔ نسل، مذہب اور رنگ کے علاوہ نظریات میں اختلافات بھی باعث نفرت ٹھہرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چاہیے تو یہ تھا کہ بیسویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے، انسان اپنی باہمی آویزش کو نسل، مذہب، زبان اور نظریے کی سطحوں سے اوپر اُٹھا کر فکری سطح پر لے آتا مگر ہوا یہ کہ بیسویں صدی میں انسانی آویزش کے آخری ایام کے سارے سابقہ پرت ازسرِنو متحرک ہو کر سامنے آ گئے ہیں اور انسان نے بیک وقت سب سطحوں پر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا ہے"۔

عالمی طاقتوں کے توازن، بڑی طاقتوں کا نظم کی طرح ہونا اور عالمی یونٹس کا غزل کی طرح محض ردیف قافیے قافیے کی وجہ سے جڑے رہنا، بڑی بڑی تنظیمیں، ملٹائی نیشنل کمپنیاں، موسمی حالات، شاک ایکسچینج، مشترکہ منڈیاں اور عصر حاضر کا منظرنامہ ساتویں مکالمے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے اور اسی تناظر میں وہ امتزاجی تنقید کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی، نارتھ روپ فرائی، شوپنہار، ٹائم، سپیس اور بیسویں صدی کے ربع آخر کی تنقید کا فلسفے کی سطح پر پہنچ جانا اس گفتگو کے اجزاء ہیں۔

نئی تنقید، پھر نارتھ روپ فرائی اور بعد میں ساختیاتی تنقید سے ہوتے ہوئے وہ بیسویں صدی اور ڈارون تک پہنچتے ہیں اور تاریخی سوانحی تنقید کا ذکر کرتے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کو انہوں نے ایک جملے میں سمیٹ دیا ہے۔ "انیسویں صدی زماں یعنی سٹیم انجن کی صدی تھی۔ بیسویں صدی، مکاں یعنی کمپیوٹر کی صدی ثابت ہوئی" (۱۲۷)۔ یہیں پر نفسیات کے یونگ سے لے کر لسانیات کے سوشیور تک، فلسفے کے برگساں تک اور فزکس کی دریافت ذرّے کے اندر بے مرکز ساخت تک کے علوم سے ہوتے ہوئے وہ ساختیاتی تنقید کی حدود میں پہنچ جاتے ہیں یہ گفتگو centripetal اور centrifugal کا ذکر اور Binary Opposites، لسانیات میں "انتخاب" اور "ارتباط" اور "اُفقی" اور "عمودی" نوعیت کی پیش رفت سے ہوتی ہوئی دو ورق کی بات کہ شاعری میں "زبان" خودکشی کرتی ہے، تک پہنچ جاتی ہے اور وزیر آغا بھی یہی کہتے ہیں "شاعری کی مملکت میں داخل ہوتے ہی زبان ایک "چیزے دیگر" بن جاتی ہے........ اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے" (۱۳۱)۔ "سو شاعری کا اپنا دیار ہے اور نثر کا اپنا۔ دونوں کا آہنگ بھی مختلف ہے اور چال ڈھال بھی نثر نپے تلے قدموں سے چلتی ہے جبکہ شاعری خرامِ ناز کا منظر دکھاتی ہے" (۱۳۲)۔ سوشیور کے "پارول" اور "لانگ" کو انہوں نے نفسیات کے "شعور" اور "لاشعور" سے اور "پرانے دماغ" اور "نئے دماغ" سے درست طور پر متماثل قرار دیا ہے۔ نوم چومسکی اور لیوی سٹراس اور رولاں بارت کی باتیں بھی سمجھائی گئی ہیں۔ تاریخی، سوانحی تنقید، نئی تنقید اور ساختیاتی تنقید کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

آٹھویں دن وہ بوٹی (بھنگ) پینے والوں اور ہپیوں میں مماثلت تلاش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ہپی، بھی اصلاً بھنگ Breed ہے۔ ہمارے دیہاتی ہپی" صرف بوٹی پر اکتفا کرتے ہیں جبکہ مغرب کے ہپی دولت مند ملکوں کے شہری

ہونے کے باعث زیادہ مہنگی نشہ آور چیزوں کی طرف راغب ہیں...... غالب بہت بڑا شاعر تھا۔ تخلیق کار تھا۔ یہی چیز اُسے بچا لے گئی ورنہ وہ اردو ادب کا سب سے بڑا ہپی تھا" (۱۴۵)۔اسی ضمن میں انشا، ابن انشا، میر، یگانہ اور میراجی کا ذکر بھی آیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق اندرون کے تخلیقی دباؤ نے ان کے بیرون کو تار تار کر دیا تھا۔ مشاعرے کی بات چل نکلی تو انہوں نے کہا کہ مشاعرہ اب تربیت گاہ کی حیثیت سے نکل کر Performing Art کے زُمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ایک جملہ قابل قدر ہے کہ "فن اُس وقت وجود میں آتا ہے، جب انسان اندر سے پگھل جاتا ہے" (۱۴۸)۔ بات چلتے چلتے ہسرل، ہائیڈگر اور جنیوا اسکول سے ہوتی ہوئی روح، جسم، جوہر، ہمویت اور پھر حواس خمسہ، وجد، عرفان، Finite اور Infinite، ارتکاز (Intentionalit) اور ارتکاز کی حالل داخلیت تک جا پہنچتی ہے۔ ساخت کے حوالے سے ساختیاتی، اسطوری، مارکسی، نفسیاتی اور مظہریاتی تنقید کی بات ہوتی ہے۔نفسیات اور لسانیات پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاتا ہے۔ سوشیور اور لاکان، دال اور مدلول، Synchomy اور Diachomy زیر بحث آتے ہیں۔ "علموں بس کریں اور یار، کا مطلب بھی یہیں سمجھ میں آیا کہ برتر علم کی تلاش کرو۔ مارکسی تنقید اور ساختیاتی رویے کے اختلاف کے باوجود التھو سے اور ماشیرے اس تصور سے مستفید ہوئے۔ لیوکاکس، گولڈ مان کے نظریات بھی اس گفتگو میں موجود ہیں ہیلس ملر، رابرٹ جاس، وولف گینگ آئزر، انگارڈن، شیٹنش اور ان سے منسلک مماثلت اور اختلاف کی تقریباً تمام جہات پر ڈاکٹر وزیر آغا نے گفتگو کی ہے حتیٰ کہ ہمبرٹو ایکو اور جوناتھن کلر کا موقف بھی پیش کیا ہے۔ دریدا کے yale critics کے گروپ کے پال ڈی مین، ہیلس ملر اور جیفرے ہارٹ مین کے نام بھی شامل کیے گئے ہیں مگر ان کے مخالفین میں اسطوری نقاد، فرائیڈ اور یونگ والے اور ساختیات والے، نئی تنقید والے اور سٹن فورڈ کے اخلاقی نقطہ نظر والے بھی شامل تھے۔

انہوں نے سارترے کے نظریہ ہست Being In itself کو صوفیا کے عرفان کی صورت میں دیکھا ہے۔ Being In itself کے دہانے پر ہمہ وقت موجود غنودہ حالت ٹوٹتی ہے تو انسان چند لمحوں کو مکمل بیداری کی حالت میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق یہی جھلک ہمارے صوفیا کے راستے کی ایک منزل ہے۔ صوفیا اس جھلک کو دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ عالم تحیر میں پہنچے اور عالم وجد میں پہنچ گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"......... یہ مشرق اور مغرب کے دیکھنے کا فرق بھی ہے۔ وہی تجربہ، جس سے گزر کر، مغرب والے بے معنویت کی زد پر آئے اور مشرق والے ایک برتر معنی کے دریا میں داخل ہو گئے! مغرب والوں کو اس تجربے میں متلی اور کرب اور دہشت کا سامنا کرنا پڑا جبکہ مشرق والوں کو حیرت اور وجد اور شانتی ملی"۔

ساختیات اور ساختیات شکنی کے فکری اختلاف کی وضاحت میں انہوں نے چار نکتے بیان کیے۔ ساخت کا ربط اور ساخت شکنی کا گورکھ دھندا، ساختیات گہرے پانی کی غواصی کی خواہاں اور ساخت شکنی پورے سمندر کا تلاطم، ساخت کوڈ، ڈیزائن یا سسٹم کی تابع اور ساخت شکنی موجود کی حادثاتی نوعیت کی قائل، ساختیات منضبط نظام کی حامل جبکہ ساخت شکنی Free Play کی صورت، اس طرح انہوں نے دونوں مکتبہ ہائے فکر کی تفریق کو آسانی سے اُجاگر کر دیا۔ دریدا اور سوشیور کے نظریات اور انیسویں اور بیسویں صدی کے تنقیدی رویوں پر وضاحتی گفتگو کی۔ "گویا سو برس کے اندر اندر مغربی فکر نے ایک دائرہ مکمل کر لیا ہے۔ اس نے تاریخ کے تصور سے انکار کر کے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اب پورے دائرے میں گھوم کر دوبارہ تاریخ کی طرف آ گئی ہے" (۱۷۴) مگر انہوں نے نئی تاریخیت کو پرانے تاریخی تصور سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ ہندوستان کی بھول جانے کی عادت اور مصر والوں کی تاریخ کو یاد رکھنے کی عادت کی مثالوں سے نئی تاریخیت کے ماشیرے، التھو سے، اور فوکو کے نظریات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اس باب کے آخر میں نظم جب آنکھ کھلی میری درج کر دی گئی ہے۔

نواں مکالمہ اس کتاب کا آخری باب ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ فن کار کا تخلیقی عمل، کائنات کے تخلیقی عمل سے مشابہ ہے۔ اور انہوں نے ہمیشہ انسانی تخلیقی عمل کو کائناتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فزکس کے تناظر میں گفتگو آغاز کرتے ہیں کہ ابتدا singularity تھی جس میں کائنات کی چاروں قوتیں موجود تھیں۔ زمان و مکاں کا وجود نہیں تھا۔ Energy اور Mass ایک تھے۔ خالی پن تھا مگر کچھ بننے کی خواہش تھی اور خواہش اندر سے خالی ہوتی ہے۔ بدھ مت کے پیروکار اسے Sunytta یا زندہ خالی پن کہتے تھے۔ یہ بے آواز Space کی ہی صورت تھی۔ "پھر بے وجود کے اندر سے ایک جست نمودار ہوئی اور یہ جست "زماں" کی تھی (۱۸۴) وزیر آغا اسے کائناتی تخلیق کا پہلا مرحلہ کہتے ہیں پھر پہلے مرحلے کے اندر سے نیوکلیس اور ساخت، ریاضی اور اقلیدس، کھائیاں اور راستے، لکیریں اور قوسیں، ضابطے اور کلیے اُبھر آئے یہ کائنات کے تخلیقی عمل کا دوسرا مرحلہ تھا" (۱۸۵)۔ اس کے بعد کائنات ٹھنڈی ہوتی گئی، کہکشائیں اور ستارے اور سیارے، رنگ اور آوازیں اور صورتیں نظر آنے لگیں۔ گویا ایک تہہ در تہہ نظام کائنات وجود میں آ گیا (۱۸۶)

انسان کے تخلیقی عمل کو انہوں نے تھرکن سے آغاز ہوتا دکھایا ہے اور پھر اس تھرکن میں گھماؤ کی صورت اور اس کی تندی کا ذکر کیا ہے اور پھر اسی تندی سے گھومتے ہوئے بھنور کی آنکھ میں اُترنے کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"......... سو وہ دم بہ دم صورتوں کو عبور کرتے ہوئے، خلیوں اور کھائیوں میں ڈھلتا ہے، پھر انہیں عبور کر کے اُس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے طبیعات نے Disorder کہا ہے اور جو مجسم رقص ہے........ ایسا رقص جو رقص کے قوانین سے بھی بالا ہے"۔

وزیر آغا کہتے ہیں کہ صوفی اس میں ضم ہو کر مستانہ وار محدود سے لامحدود میں ڈھل جاتا ہے۔ مگر فن کار اسے چھو کر تخلیق کو جنم دیتا ہے یہاں وہ ہندوؤں کی امرت منتھن والی اسطورہ سے بھی اس کی مماثلت بیان کرتے ہیں۔ وہ یہاں بھی یونگ کے Archetypes اور فلسفے میں وجود اور موجود کے معاملات سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تخلیق کے تین مدارج کو انہوں نے یوں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بے ہیئتی، تراج، خالص رقص اور Disorder

۲۔ بے ہیئتی پر لکیروں، کھائیوں، اصولوں، قاعدوں اور کلیوں کا خاکہ چپکانا

۳۔ خاکے میں رنگ بھرنا اور صورتیں بنانا

وہ تخلیق، تخلیق کار اور قاری تینوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

اور گفتگو میں اِن تینوں پر ایک سیر حاصل مکالمہ جاری رہتا ہے۔ وہ متن کے حوالے سے تفصیلی منظر نامہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مغربی ذہن تجزیاتی ہے۔ وہ چیز کو کھول کر، الگ الگ کر کے سمجھنا چاہتا ہے جبکہ مشرقی ذہن اسے کلیت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ مغرب سورج کی چندھیا دینے والی روشنی کی طرف راغب ہے جبکہ مشرق کو جھٹپٹے کا عالم پسند ہے (۱۹۴)۔

نظم کی جمالیاتی تسکین اور مختلف سطحوں پر اُس کی قرأت کی بات سمجھائی گئی ہے۔ آہنگ، تال تھاپ اور لفظیات کے صوتی بہاؤ کا ذکر پُر اثر انداز میں کیا گیا ہے کہ اسے وہ پہلی سطح کہتے ہیں۔ دوسری سطح وہ تمثیلوں، تشبیہوں، استعاروں اور لفظی تراکیب کے موزوں استعمال کو سمجھتے ہیں اور اس کے لیے متعدد مثالوں سے انہوں نے قرأت کے مختلف مکاتب کی احتراجی صورت پیش کی ہے۔

علامتوں کے باب میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ وزیر آغا کے ہاں علامت اپنا ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ "اصلاً علامت ایک طرح کی درز یا شگاف یا Rupture یا Fault ہے جو بند ساخت میں نمودار ہوتا ہے اور جو ساخت کے متعین معنی میں ایک نئے بُعد کا اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ گویا چوتھی کھونٹ ہے جس سے متعین معنی کی سرحدیں ٹوٹتی ہیں اور معنیاتی توسیع وجود میں آ جاتی ہے" (۲۰۰)۔

اس مضمون کا بقیہ حصہ صفحہ 73 پر دیکھیں

تنقیداتِ وزیر آغا کی سائنسی جہت

محمد رفیع ازہر
مستقل پتا : کورنگی نمبر ۳، رحیم آباد، کراچی نمبر ۳۱
عارضی پتا : ایم ایس جی، انفنٹری اسکول، کوئٹہ کینٹ

"سائنس" کا لفظ اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ لوگ اس لفظ سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ عامی شخص کا ذہن بھی اسے سن کر کسی مشاہداتی یا تجرباتی علم کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ اہلِ علم کے ہاں اس لفظ کا کینوس زیادہ وسیع ہے۔ کیوں کہ اس لفظ کو بولتے ہی مغرب کی ساری مادی ترقی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ "سائنس" کی تقسیم عام طور پر دو حصوں میں کی جاتی ہے۔ ایک کا تعلق نظریاتی سائنس سے ہے، جب کہ دوسرے کا اطلاقی یا تجرباتی سائنس سے، تو جن علوم میں نظریاتی مباحث ہوں، اس کا تعلق نظریاتی سائنس سے ہوا اور جن علوم کی بنا پر تجربہ گاہوں میں تجربات کیے جائیں وہ اطلاقی سائنس کے زمرے میں آتے ہیں۔ تجربہ گاہوں کے علاوہ بھی بعض علوم اطلاقی سائنس کے حامل ہیں۔ ان میں آثارِ قدیمہ کی چھان پھٹک اور اعداد و شمار وغیرہ کا اکٹھا کرنا شامل ہیں۔ قرآن مجید میں جس سائنسی علم کا ذکر ہے، اس سے مراد نظریاتی یا مشاہداتی ہے۔

یہاں ڈاکٹر وزیر آغا کی سائنسی جہت کا تعلق دراصل نظریاتی اور مشاہداتی سائنس سے ہے۔ ان کی تحریروں میں جا بہ جا سائنسی نظریوں کے حوالے موجود ہیں اور بعض اوقات وہ اپنے تنقیدی اصول کو بھی کسی نہ کسی سائنسی نظریے سے ہی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی سائنسی اور مادی ترقی نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے۔ جہاں لوگوں کے معیارِ زندگی اور معیارِ رہائش میں گوناگوں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، وہیں لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے کے طریقِ کار میں بھی فرق آ گیا ہے۔ ادب بھی چوں کہ زندگی ہی سے مربوط ہوتا ہے، اس لیے ممکن نہیں کہ اس حوالے سے یہ بے اثر رہ جائے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:-

> "جب خالص سائنس میں کوئی پیش رفت ہوتی ہے، تو سب سے پہلے معاشرتی سائنس اس سے استفادہ کرتی ہے۔ پھر مختلف فنون اسے اپناتے ہیں۔ ادب اور ادبی تنقید کی باری آخر میں آتی ہے۔" [۱]

اس اقتباس میں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ سائنسی دریافت یا سائنسی ترقی کی وجہ سے انسانی زندگی متاثر ہوتی ہے تو لامحالہ تخلیقی ادب میں بھی اس کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ اور شاید اسی کا نام ارتقا ہے کہ انسان ہمیشہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ اسے یوں بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انسان ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں جست بھر لیتا ہے، لیکن قدیم انسانی زندگی میں یہ ارتقا سست روی کا شکار تھا۔ جب کہ اس میں تیزی اس وقت آئی جب ٹھوس مادی وجود کے نظریے پر جدید سائنس نے کاری ضرب لگائی:-

> "پہلے یہ عام خیال تھا کہ ہر شے اپنا ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ جدید طبیعیات نے اس بات کو مسترد کر دیا اور کہا کہ شے کو اس 'رشتے' کے حوالے سے ہی جانا جا سکتا ہے جو اس نے دیگر اشیا کے ساتھ قائم کر رکھا ہے۔ جب الیکٹران دریافت ہو گئیں، مگر اب یہ اشیا قدیم اشیا کی طرح مادے کی ٹھوس اکائیاں نہیں تھیں بلکہ صرف رشتوں کی گرہیں تھیں اور رشتوں کے باہر ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔" [۲]

یہ وہ بنیادی پیش رفت تھی کہ جس نے پورے نظامِ حیات میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذکورہ سائنسی دریافت سے قبل انسانی زندگی جتنا سفر طے کر چکی تھی اس کی بنیاد نہ صرف مادے کے مرکزی وجود پر ہی تھی، بلکہ کئی مذاہب بھی کائنات کے مرکز کے نظریے پر ہی قائم تھے:-

> "بیسویں صدی سے قبل مرکز یعنی Centre کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اسے مختلف علوم اور مذاہب میں مختلف نام ملے تھے۔ مثلاً Logos, Essence, Presene اور Being وغیرہ فلسفے میں، 'دھرما کیہ' بدھ مت میں، 'تاؤ' تاؤ مت میں، 'برہم' ہندو مت، 'اہرن اکرن' زرتشت کے نظریے میں وغیرہ۔ اصل نظریہ یہ تھا کہ تغیرات کی حامل اس کائنات کے عقب یا بطون میں حقیقتِ عظمیٰ یا جوہر یا تاؤ موجود ہے، جو ازلی وابدی ہونے کے باعث زمان و مکان سے ماورا ہے۔ بیسویں صدی کی طبیعیات نے یہ نظریہ پیش کیا کہ 'مرکز' کسی ٹھوس حقیقت کا نام نہیں۔ بلکہ وہ تو محض ایک سٹرکچر ہے جو رشتوں کے جال سے عبارت ہے۔" [۳]

یہ بات بے حد اہم ہے کہ مذکورہ دریافت سے قبل قدیم معاشرہ بنیادی طور پر مذاہب میں ہی منقسم تھا۔ ہر علاقے اور خطے کی تہذیب و ثقافت کی تار و پود میں اگر ایک طرف اس خطے کے رسمی لوازمات شامل تھے تو دوسری طرف اس کی بُنت میں مذاہب بھی دخیل تھے۔ اسی لیے قدیم معاشرے سے پھوٹنے والے جتنے بھی علوم ہیں ان میں کسی نہ کسی طرح مذاہب کے حوالے ضرور ملتے ہیں۔ مذاہب کی بنیاد پر ہی حکومتیں بنتیں بگڑتیں اور اسی بنیاد پر جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے یہ سائنسی دریافت ایک غیر معمولی نوعیت کی تھی۔ بہر حال اس دریافت سے علم کے دیگر شعبے بھی متاثر ہونے لگے:-

> "بیسویں صدی کے آغاز میں 'آئن سٹائن' کے نظریۂ اضافت اور 'پلانک' کے کوانٹم طبیعیات کی شروعات ہوئی اور Atomism کی جگہ رشتوں کے جال (Web of Relation) نے لے لی تو اس سے نفسیات، علم الانسان، لسانیات، موجودیت، تاریخ حتیٰ کہ سیاست تک متاثر ہوئی۔" [۴]

یہاں جن متاثرہ علوم کا ذکر ہوا، اگر غور کیا جائے تو یہی زندگی کی بنیادی اکائیاں ہیں۔ نفسیات، علم الانسان، لسانیات، موجودیت، تاریخ اور سیاست، یہی وہ علوم ہیں جس سے کسی بھی خطۂ زمین پر بسنے والے معاشرے کا سب سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان علوم کے بنیادی نظریات میں جب تبدیلیاں رونما ہوئیں تو لامحالہ اس کے اثرات معاشرے پر پڑنا شروع ہو گئے۔ اور صدیوں پرانی کئی مضبوط روایتیں رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئیں۔ نتیجتاً: ادبیات نے بھی پینترا بدل لیا:-

> "ادب اور فن کی نشاۃِ ثانیہ، احیاء العلوم کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ انیسویں صدی میں 'ڈارون' اور 'سپنسر' کے نظریات نے بھی ادب کو بہت متاثر کیا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ 'کوپرنیکس' اور 'نیوٹن' سے لے کر ڈارون اور پھر آئن سٹائن تک جتنے انقلابی سائنسی نظریات آئے، ادب نے ان سے اثرات قبول کیے۔ ادب نے علوم سے ہی نہیں، متوازی فنون کی تحریکات کی بھی خوشہ چینی کی ہے۔ مثلاً: تجریدیت سے لے کر کیوبزم تک مصوری کی ہر تحریک کے متوازی ادب کی تحریک بھی دکھائی دیتی ہے۔" [۵]

اس اقتباس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادب ہر فن اور ہر علم میں آنے والی تبدیلی سے متاثر ہوا۔ یہاں بات تخلیقی ادب کی ہو رہی ہے کہ آزاد فضا میں سانس لینے والے ادیبوں نے

اپنے فن پاروں میں، تغیر پذیر معاشرے کے اثرات کا غیر شعوری طور پر اظہار کیا ہے۔ "تنقید" چوں کہ ادب کو ہی پرکھنے کا فن ہے لہٰذا اسے بھی سائنس کے تابع ہونا پڑا۔

"جدید طبیعیات کے دریافت شدہ 'رشتوں' کے اس تصور نے جدید لسانیات کو بھی متاثر کیا اور لسانیات کے ذریعے ادبی تنقید کو بھی، چناں چہ تنقید میں وہ قدیم تصور پس منظر میں چلا گیا جو ادب کو زندگی کا عکس قرار دیتا تھا اور لفظوں اور مظاہر کا ربط باہم ہی ادب کا امتیازی وصف قرار پایا۔ یہ گویا 'شے' سے سٹرکچر کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اتنا ہی اہم جتنا کوپرنیکس (Copernecus) کا، جس نے یہ کہ کر انسان کے زاویۂ نگاہ کو تبدیل کر دیا کہ زمین کے بجائے سورج اس نظامِ شمسی کا مرکز ہے۔" [۶]

اس اقتباس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے فنِ تنقید کے بارے میں ایک نہایت لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ فنِ تنقید کی تکنیک میں غالب تبدیلی اس وقت آئی جب لسانیات نے سائنسی اثرات قبول کیے۔ لسانیات کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو کسی بھی زبان کا ایک جملہ خود کئی الفاظ کے باہم رشتے پر مشتمل ہوتا ہے اور پھر جملے سے جملہ نکلتا اور جملہ در جملہ بنتا چلا جاتا ہے۔ تو ان لفظوں اور جملوں کے انسلاک کو اگر "رشتوں" پر محمول کر لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن لسانیات نے جو سائنس سے اثرات قبول کیے وہ اس سے یک سر مختلف تھے۔ دراصل راقم کا استدلال نظری (Visual) صورتِ حال سے ہے کہ الفاظ اور جملوں میں انسلاک اور ربطِ باہم بہ ظاہر نظر آنے والی چیز ہے لیکن لسانیات نے تو کوانٹم تھیوری سے اثرات قبول کیے تھے۔ اس کا مطلب ایسے رشتے (Web of Relations) کہ جو موجود تو ہیں لیکن نظروں سے اوجھل ہیں۔ بہ قول سوسیور: "زبان ایک ہیئت یا Form ہے، موجود بالذات Substance نہیں ہے۔" [۷]

اب تک ڈاکٹر وزیر آغا کے اُن اقتباسات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے، جس سے اُن کی سائنسی تاریخ اور سائنسی دریافتوں کی تفہیم کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں غور طلب پہلو یہ ہے کہ جو نقاد لحظہ بہ لحظہ سائنسی دریافتوں سے ہونے والی ترقی، اس کے معاشرے پر پڑنے والے اثرات اور اس سے ادبیات میں آنے والی تبدیلیوں سے اس قدر آگاہ ہو، وہ یقیناً سائنسی نظریات کے ساتھ ادبی برتاؤ (Treatment) کرنے کی اچھی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے تو ممکن ہے کہ ان کی سائنسی جہت کا ارتباط مغربی نقادوں سے ہی ہو اور بہ قول سانت بیو (۱۸۰۴ء-۱۸۶۹ء):-

"نقاد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ مصنف اور اس کی تخلیق کو پھر سے تخلیق کرے۔ اسی لیے نقاد میں شاعری کی صفات بھی ہونی چاہئیں اور سائنس دان کی بھی، تنقید، تحقیق و تلاش میں سائنس کی طرح ہے اور تخلیق میں شاعری کی طرح۔" [۸]

اس اقتباس میں "سانت بیو" نے ایک نقاد کے دو اہم اوصاف کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ تحقیق و تلاش میں سائنس کی طرح ہو۔ اس حوالے سے راقم ڈاکٹر وزیر آغا کی تحقیقی جہت کا پانٹینشیل ذکر کر چکا ہے، جہاں ڈاکٹر وزیر آغا کے تحقیق و تنقید کے باہم مربوط ہونے اور خاص تحقیق میں ذوقِ نظر سے کام لینے اور نئے نتائج نکالنے کا حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے، جو یقیناً روایتی تحقیق و تلاش سے مختلف ہے۔ دوسرا وصف اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نقاد کی تخلیقی شاعری کی طرح احساساتی ہو تو اس میں بھی وہ پورے اترتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک نقاد کی تنقید "سائنس" سے صرف اتنی ہی ہم آہنگ ذہنی چاہیے کہ اسے احساساتی طور پر محسوس کیا جا سکے نہ کہ وہ سائنس کے فارمولائی نظریوں میں ہی کھو کر رہ جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایک نقاد سائنس سے استفادہ ضرور کرے مگر حدِ اعتدال سے ہرگز نہ بڑھے۔ ورنہ فنِ تنقید، بوجھل ہو کر عوام الناس سے دور اور بے وقعت ہو جائے گا۔ اس بات کو تاریخی حوالے سے بہ قول ڈاکٹر وزیر آغا بھی سمجھا جا سکتا ہے:-

"چارلس ڈارون (Charles Darwin) اور سپنسر (Spensor) کی تحقیقات نے سائنس اور مذہب میں تصادم کو ہوا دی تھی اور تنقید کے معاملے میں یونی ورسٹیوں کی مساعی سے جو Specialization ہوئی اور تاریخی سوانحی مواد کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ اس سب نے تنقید کو عوام الناس سے الگ کر دیا تھا۔" [۹]

اس اقتباس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک معلوم حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ادب خاص طور پر تنقید کو سائنسی علوم سے اتنا بوجھل یا ثقیل نہ کر دیا جائے کہ جسے عوام الناس ہضم ہی نہ کر سکیں۔ ادب میں لوگ زیادہ تر شاعری سے ہی مانوس ہوتے ہیں، اس لیے بہ قول "سانت بیو" تنقید، تخلیقی بھی شاعری کی طرح احساساتی ہو تو وہ زیادہ دل چسپ اور قابلِ فہم ہوگی۔ مذکورہ بحث کی روشنی میں اب ہمیں یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا سائنسی نظریات کو تنقید نگاری میں برتنے کا کیا انداز ہے؟

"میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ادب کو فنون اور معاشرتی سائنسوں کے ساتھ براہِ راست بھی خالص سائنس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اپنے طور میں نے اس سلسلے میں ایک آدھ معمولی سا قدم اٹھایا ہے۔ مثلاً 'تخلیقی عمل' کتاب میں حیاتیات کے نظریۂ تقلیب (Mutation) کو برتا ہے یا Bicameral mind کے تصورات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔" [۱۰]

گو کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہاں اس بات کی وضاحت پیش نہیں کی کہ ادب کو خالص سائنس اور معاشرتی سائنسوں سے استفادہ کرنے کے لیے اعتدال کے کس خطِ امتیاز کا لحاظ رکھنا چاہیے تاہم انھوں نے جو دو مثالیں دی ہیں وہ قابلِ غور ہیں اور وہ مثالیں بھی ان کی عملی تنقید کی ہیں۔ پہلی مثال نظریۂ تقلیب (Mutation) کی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء میں "ڈی ورائز" (De Vries) نے دریافت کیا تھا کہ زندہ اجسام میں موروثی تبدیلی غیر مسلسل جستوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس عمل کو اس نے Mutation کا نام دیا تھا۔ [۱۱] ڈاکٹر وزیر آغا نے اس نظریے کی یوں وضاحت کی ہے:-

"دراصل تقلیب خلیے کے اندر کروموسومز کی ایک انقلابی تبدیلی سے نمودار ہوتی ہے اور یہ انقلابی تبدیلی ہمیشہ کسی داخلی عمل کے تحت وجود میں آتی ہے۔" [۱۲]

اصل میں، اس نظریے سے انھوں نے اپنے تخلیقی نظریۂ جست کے لیے بنیادی طور پر روشنی حاصل کی تھی جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کے لاشعور میں کئی گہرے مشاہدات اور تجربات جمع ہوتے رہتے ہیں جو بعد ازاں کسی خاص لحظۂ تخلیق میں شعوری خیالات سے متصادم ہو کر انتشار (Chaos) کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ پھر اچانک، تخلیق ایک جست (Jump) بھر کر برآمد ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیے کہ بہ ظاہر تخلیقی عمل میں ایک سائنسی نظریے سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس سے کسی قسم کا بوجھل پن پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک گونہ اس میں دل چسپی کا سامان اور لطیف احساس موجود ہے۔ اسی طرح Bicameral Mind کا قصہ ہے کہ انسانی دماغ بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دایاں دماغ وہبی قوت کا مالک ہے جو پرانا دماغ کہلاتا ہے۔ بایاں دماغ ایک نیا دماغ ہے جو منطقی طاقت رکھتا ہے۔ ان دونوں کے بیچ ایک پردہ یا دیوار ہے جسے "کوریڈار" کہتے ہیں۔ اس دیوار کو عام آدمی تو عبور نہیں کر پاتا البتہ ایک تخلیق کار یا صوفی عبور کر جاتا ہے۔ دیکھیے اس میں بھی احساساتی اندازِ فکر موجود ہے جو دراصل نقد و ادب کا متقاضی ہے۔ رہا یہ سوال کہ خالص سائنس کے نظریوں میں تو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے لہٰذا اس سے نقد و ادب میں ایک غیر یقینی صورتِ حال بھی تو پیدا ہو سکتی ہے؟ اس کا مدلل اور معقول جواب ڈاکٹر وزیر آغا نے دیا ہے:-

"ادب اور Pure Science کا رشتہ روشنی کے حصول کی حد تک ہے۔ خالص سائنس کا کوئی نظریہ اس کائنات پر جس حد تک روشنی ڈالے گا، ادب بھی اسی حد تک اس سے استفادہ کرے گا۔ کل جب خالص سائنس کوئی بہتر نظریہ پیش کرے گی جو کائنات کو ایک نسبتاً بڑے دائرۂ نور میں رکھ کر دیکھے گا تو ادب اس سے بھی استفادہ کرے گا۔" [۱۳]

یہاں پر ایک بات وضاحت طلب ہے کہ خالص سائنس اور معاشرتی سائنس میں آخر کیا فرق ہے؟ دراصل کوئی بھی سائنسی دریافت خالص سائنس (Pure Science) کی صورت میں ہی سامنے آتی ہے جیسے نیوٹن کا نظریۂ ثقل اور آئن سٹائن کا نظریۂ اضافت وغیرہ، نیز ایکسرے ان کی دریافت اور کوانٹم کا نظریہ بھی
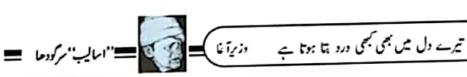
خالص سائنسی نظریے ہیں۔ پھر ان کے اثرات رفتہ رفتہ معاشرے کے دوسرے علوم پر پڑتے ہیں جن میں سماجیات، لسانیات، اقتصادیات، معاشیات، اور سیاسیات وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح معاشرتی سائنسی نظریے وجود میں آتے ہیں جن کے معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے پھر نقد وادب کے لیے اخذ و اکتساب کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور ادبا اپنی تخلیقات میں شعوری یا لاشعوری طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ ادبا کو شعوری سطح پر بھی خالص سائنس کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنانا چاہیے:-

"دراصل ادب تخلیق کرنے والے معاشرتی علوم سے زیادہ متعلق ہونے کے باعث Pure Science کے تعقلات سے براہِ راست استفادہ نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے۔ میرا موقف یہ ہے، انھیں ایسا بھی کرنا چاہیے۔ خود میں نے زیادہ تر خالص سائنس کے بجائے معاشرتی سائنسوں کے حوالے سے کام کیا ہے۔ مگر . . . میں نے کہیں کہیں خالص سائنس سے براہِ راست بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔" [۱۴]

اس سے پہلے کہ ہم ڈاکٹر وزیر آغا کی معاشرتی سائنس سے عملی تنقید میں استفادے کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کی طرف بڑھیں، یہ بات زیرِ نظر رہنی چاہیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا بہ حیثیت نقاد خالص سائنسی نظریوں پر بھی تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے اور وہ انھیں حقیقت کی کسوٹی پر ضرور پرکھتے ہیں۔ اس کا تفصیلاً ذکر تو ان کی اجتہادی جہت کے تحت کیا گیا ہے البتہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ جدید سائنس کے لامرکزیت کے نظریے کے بالکل حامی نہیں ہیں:-

"بیسویں صدی کی طبیعیات نے یہ نظریہ پیش کیا کہ 'مرکز' کسی ٹھوس حقیقت کا نام نہیں بلکہ وہ تو محض ایک سٹرکچر ہے جو رشتوں کے جال سے عبارت ہے، جہاں ہر دھاگے کا وجود، دوسرے دھاگوں سے مشروط ہے۔ اس کی اپنی کوئی مقصود بالذات حیثیت نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر مرکز یا جوہر کے وجود کا قائل ہوں اور میں اپنے بعض مضامین میں اپنے نظریات اس سلسلے میں پیش کر چکا ہوں۔" [۱۵]

ڈاکٹر وزیر آغا معاشرتی سائنس سے استفادے کی طرف بڑھتے ہیں تو مرکزیت پر یقین کے اپنے اس موقف سے پیچھے ہٹتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ معاشرتی سائنس نے چوں کہ نظریہ لامرکزیت سے ہی اثرات قبول کیے تھے، اس لیے ان کے ہاں مرکز گریز رجحانات پروان چڑھے، اسی وجہ سے نطشے نے (معاذ اللہ) خدا کی موت کا اعلان کیا لیکن ڈاکٹر وزیر آغا معاشرتی سائنس سے استفادہ کرتے ہوئے جگہ جگہ اجتہاد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ زیرِ بحث مغرب کے نظریات میں سے ہی ایسے نکات تلاش کر لیتے ہیں جس سے کسی نامعلوم مرکز کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔ اپنے اس مرکز مائل رجحان کی بدولت وہ بعض اوقات اس حقیقتِ عظمیٰ پر محکم استدلال قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ جس کا وصف ہی بے حد و انتہا اور لامتناہی ہے اور جس کا علم بردار صرف اسلام ہے۔ بہر کیف مغرب اپنے سائنسی علوم کے زعم میں جس خدا کا انکار کر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انھی کی سائنسی موشگافیوں کے بطون سے انھیں حقیقی خدا کا ادراک کروا دیا۔ اس حوالے سے تفصیلی وضاحت ان کی فکری جہت میں بھی موجود ہے۔ آئیے اب دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرتی سائنسوں کے مباحث میں کس طرح حقیقتِ عظمیٰ کا ادراک کرتے ہوئے باریک بینی سے کام لیتے ہوئے:-

"بیسویں صدی میں کوانٹم طبیعیات نیز لسانیات سوشیولوجی اور نفسیات میں ہونے والی پیش رفت نے ایک ایسی ساخت کا تصور ابھارا جو لامرکزیت کی حامل تھی یعنی ایک ایسی ساخت جو رشتوں کا ایک جال تھی اور جس کا ہر نقطہ ہی مرکزہ تھا۔ یہ ایک طرح کا وحدۃ الوجودی نظریہ بھی تھا جو جُزو کو کُل سے الگ تصور نہیں کرتا۔ اگر فرق تھا تو بس یہ کہ تصوف نے کل اور جز کے رشتے کو دجلہ اور قطرہ یا چکنی مٹی اور ظروف کا رشتہ مانا تھا۔ جب کہ بیسویں صدی کی ساختیات نے لانگ اور پیرول کا رشتہ قرار دیا ہے۔" [۱۶]

دیکھیے یہاں ڈاکٹر وزیر آغا نے ساختیات کے مرکز گریز نظریے کا رخ اپنی مرکز مائل ذہنی قوت سے ۱۸۰ ڈگری پر گھما کر سیدھا کر دیا ہے جہاں حقیقتِ عظمیٰ کے انکار کی بجائے اس کا ادراک ہو رہا ہے۔ اور بین السطور انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ لانگ اور پیرول کا مغربی ساختیات کا یہ تصور، مشرقی نظریہ تصوف کا ہی زائیدہ ہے۔ جسے مغرب آج زیرِ بحث لا کر بغلیں بجا رہا ہے اور اپنے زعم میں شاید کوئی نئی دریافت کر ڈالی، ہمارے ہاں تو یہ قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ کیوں کہ جز اور کل کا لانگ اور پیرول سے تقابل کرنے میں فرق سرِ مو بھی نہیں۔ جس طرح "جز" ایک واضح حقیقت کا نام ہے اسی طرح پیرول بھی ایک واضح حقیقت ہے لیکن جس طرح ساختیات والے "لانگ" کو ایک غیر واضح شے بلکہ اسے رشتوں کے ایک جال پر محمول کرتے ہیں، اسی طرح تصوف میں "کل" کا وجود بھی واضح نہیں بلکہ وہ لامتناہی اوصاف کا حامل ہے اور انھی لامتناہی اوصاف کو "رشتوں کے جال" پر محمول کیا جا سکتا ہے:-

"مغرب میں ساختیات کے نظریے سے قبل سوچ کا وہ انداز رائج تھا جو علت و معلول کو اہمیت دیتا ہے۔ سوچ کا یہ انداز اس سائنسی مفروضے پر قائم تھا کہ شے اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ ہر عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہے اور نئے عمل کا محرک بھی! یوں کائنات اور زندگی کے جملہ مظاہر ابتدا اور انتہا کے درمیان ایک سیدھے خط پر سفر کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی جدید طبیعیات نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا اور کہا کہ شے بجائے خود رشتوں کی ایک اکائی ہے نیز یہ کہ شے کو اس 'رشتے' کے حوالے سے ہی جانا جا سکتا ہے جو اس نے دیگر اشیا کے ساتھ قائم کر رکھا ہے۔" [۱۷]

مذکورہ اقتباس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اس جڑ (Root) کی نشان دہی کی ہے جس سے بعد ازاں دیگر علوم کی پیوندکاری عمل میں آئی۔ اور وہ بڑھتے بڑھتے ایک ایسے نامیاتی کل کی شکل اختیار کر گیا جسے لانگ اور پیرول کا بدلا ہوا روپ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ معاشرتی علوم میں سے ہر ایک کے اندر وہ دوئی در آئی جس سے ایک نامعلوم حقیقت کی نشان دہی ہونے لگی، بہ حیثیت مجموعی جستجو کو مہمیز ملنے لگی اور حیرت و استعجاب کے دروازے کھلتے گئے۔ ساختیاتی جڑ (Root) سے کن کن علوم کی پیوندکاری ہوئی اس کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں کی ہے:-

"ساختیات کا یہ نظریہ محض طبیعیات تک محدود نہیں رہا۔ نفسیات، لسانیات، فلسفہ، علم الحیات، علم الانسان اور دیگر علوم میں بھی اسے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً لسانیات کے ضمن میں سوسیور نے کہا کہ عام گفتگو یعنی Parole کے پس پشت زبان یعنی Langue بہ طور ایک سسٹم یا گرامر موجود ہوتی ہے جس کے مطابق ہم گفتگو کرتے ہیں (نوام چامسکی نے گفتگو اور زبان کے لیے Competence اور Performance کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو زیادہ برمحل ہیں) اسی طرح برگساں نے مرورِ زماں (Serial Time) کے مقابلے میں مسلسل یعنی Duration کا نظریہ پیش کیا ہے جس میں سارے زمانے رشتوں کی صورت میں بہ یک وقت موجود ہوتے ہیں۔ فرائڈ نے شعور کی فعال دنیا کے پس پشت لاشعور کی موجودگی کا انکشاف کیا اور ژونگ نے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا جو Archetypes سے عبارت ہے یعنی ان غیر مرئی کھائیوں پر مشتمل ہے جو طبعی رجحانات کی Structuring کر کے انھیں تخیلہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ادب کے حوالے سے ایلیٹ نے روایت کا نظریہ پیش کیا جو ایک ایسا ساختیہ ہے جس کے حال میں پورا ماضی مضمر ہوتا ہے۔" [۱۸]

اس اقتباس میں جہاں ڈاکٹر وزیر آغا کی عمیق نظری کے لانگ (Langue) میں ان کی سائنسی جہت کا بہ خوبی اظہار ہوتا ہے، وہیں انھوں نے ساختیاتی تکنیک کو لاشعوری طور پر برتتے ہوئے مغربی فن تنقید کی تاریخی روایت کو رشتوں کے جال کے طور پیش کیا ہے۔ مغربی تنقید کا ہر نظریہ اپنے پیش رو اور پیش آئندہ نظریوں کے ساتھ مل کر بنت کاری کا منظر پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا کی اختراعی

جہت میں بھی کی گئی ہے۔

یہاں تک ہم نے ڈاکٹر وزیر آغا کی سائنسی جہت کے حوالے سے یہ جانا کہ وہ خالص سائنسوں کی دریافتوں سے نہ صرف بہ خوبی آگاہ ہیں بلکہ ماقبل دریافتوں کے ادب کا اصل چہرہ اور بعد ازاں اس پر پڑنے والے اثرات اور معاشرے کا سارا منظر نامہ بھی ان کے سامنے ہے۔اس کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، جو جو علوم سائنس سے متاثر ہوئے انہیں اس کی لمحہ بہ لمحہ خبر ہے۔ اس پورے تناظر میں فنِ تنقید نے کس حد تک سائنس سے استفادہ کیا؟ اس کا بھی انھوں نے گہرا مشاہدہ کر رکھا ہے۔علاوہ ازیں خالص اور معاشرتی سائنس سے فنِ تنقید کو کس قدر اثر قبول کرنا چاہیے؟ اس کی وضاحت بھی انھوں نے کردی۔ مزید برآں انھوں نے خود جن سائنسی نظریات کو تنقید سے ہم آہنگ کیا ہے، اس کی طرف بھی انھوں نے واضح اشارے کیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ جب بھی عملی تنقید کی طرف بڑھتے ہیں تو کما حقہ، مختلف سائنسی نظریوں سے استفادہ ضرور کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کے ذیل کے شعر:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب !
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

کی ڈاکٹر وزیر آغا نے اختراعی نظریے کی روشنی میں تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:-

"یوں لگتا ہے کہ جیسے غالب نے تمنا کو وہی اہمیت دی ہے جو نیوٹن کی طبعیات نے کششِ ثقل کو دی تھی۔ تمنا اندر سے خالی ہوتی ہے اور جو جگہ اندر سے خالی ہو اس میں باہر کی اشیا کو اپنی طرف کھینچنے کی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے ۔ گویا تمنا بجائے خود کششِ ثقل ہے۔" [۱۹]

غور کیجیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے "تمنا" کے لیے کشش ثقل کا استعارہ استعمال کر کے "تمنا" کو ایک محاکات کی شکل دی ہے۔ اس طرح قاری کے ذہن میں لفظ "تمنا" کی واضح تفہیم کے ساتھ ساتھ ایک نئی معنویت بھی پیدا ہوئی ہے۔ کشش ثقل کی تمثال پر "تمنا" کا اطلاق اور بھی دل چسپ صورت حال اختیار کر جاتا ہے کہ جب نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل کا سبب بننے والا اہم واقعہ بھی ذہن میں لایا جائے۔ جب سیب کے درخت تلے نیوٹن لیٹا ہوا تھا اور اچانک ایک سیب اس کے اوپر آ گرا۔ اب ذرا سیب کو تمنا اور کشش ثقل کے بیچ میں رکھ کر بھی دیکھیے جب کہ بھوک بھی شدت سے لگی ہو۔ گویا کشش ثقل کی تمثال نے تمثیل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح اس مضمون میں انھوں نے اور بھی سائنسی مثالیں دی ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے مذکورہ شعر کے "پہلے قدم" کو دیکھنے کے لیے دو کائناتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کو کائناتِ اکبر کا نام دیا ہے اور دوسری کو کائناتِ اصغر کا۔ کائناتِ اکبر کے حوالے سے انھوں نے کائنات کے آغاز و ارتقا پر بحث کی ہے ۔ جہاں سے زماں و مکاں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ اس جگہ انھوں نے "پلانک" کے GEV 10^{-33} کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جہاں ابھی مادی دنیا کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے:-

"طبعیات کے مطابق جب زماں اور مکاں ایک دوسرے کے روبرو آئے تو زماں نے 'ایک بعد' کا جب کہ مکاں نے 'نو ابعاد' کا مظاہرہ کیا مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے مکاں کے تین ابعاد باقی رہ گئے اور باقی چھ ابعاد مکاں کے اندر Curlin ہو گئے، یعنی غیب میں چلے گئے گویا پہلا قدم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔" [۲۰]

اسی طرح انھوں نے کائناتِ اصغر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کوانٹم طبعیات کا ذکر کیا ہے کہ جب کائنات کے سب سے چھوٹے ذرے "ایٹم" کے اندر جھانکا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے اندر تو ایک باقاعدہ ساخت موجود ہے جس کا ایک مرکزہ یا نیوکلینس بھی ہے:-

"اس مرکزہ کے باہر Leptons ہیں جو ناقابل تقسیم یعنی Elementary Particles ہیں جب کہ مرکزہ کے اندر Hadrons ہیں جو Composite Particles ہیں۔ ان میں سے ہر ہڈرون 'تین کوارکس' پر مشتمل ہے اور یہ کوارکس کوئی مادی وجود نہیں رکھتے بلکہ Harmonics یا Colours ہیں ۔ بعد ازاں سٹرنگ تھیوری نے کہا کہ کائنات کنہ دھاگوں یا Strings سے عبارت ہے اور ہر سٹرنگ کے سرے پر ایک طرح کی گرہ یا Knot موجود ہے۔ تمام پارٹیکل اصلاً گرہیں یا گانٹھیں ہیں، جن میں سے ہر گرہ کی لمبائی پلانک کے 10^{-33} cms کے برابر ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سٹرنگ کی اس مخصوص وضع سے ذہن ایک بار پھر تخلیقی جرثومے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو وحدت کا سمبل ہے گویا گرہ یکتائی کی مظہر ہے۔ یہی وہ اولین قدم ہے جس کی طرف مشرقی دانش نے اختراعی طریق کے تابع ہو کر سفر کیا تھا، مگر جس کی طرف کوانٹم طبعیات نے استقرائی طریق کے تحت سفر کیا ہے تاہم وہ تجربہ کی سطح پر اس قدم کے پہلے پاؤں کو ابھی چھو نہیں سکی۔" [۲۱]

دیکھیے اس اقتباس میں ڈاکٹر وزیر آغا نے پہلے قدم کی معنوی توسیع اور انشراح کرتے ہوئے کوانٹم طبعیات کے سائنسی نظریے سے کس خوبی کے ساتھ استدلال کیا ہے۔ دوسرا انھوں نے مغرب کے اس لامرکزی نظریے سے بھی وحدت اور یکتائی کا نقطہ برآمد کر لیا ہے۔ اسے کہتے ہیں نقطہ آفرینی! جو ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہاں انھوں نے اپنی ذہانت اور دور اندیشی سے مغرب کی جدت کو مشرق کی قدامت کے سامنے زیر بھی کر دیا ہے۔ اس اقتباس کی روشنی میں ان کی ایک یہ خوبی بھی سامنے آتی ہے کہ وہ جس بھی کسی سائنسی نظریے کا استدلال لاتے ہیں اس کی وضاحت ضرور کر دیتے ہیں تا کہ قاری کسی ابہام کا شکار نہ ہو۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے "میراجی" کی تخلیقی زندگی اور غیر طبعی موت کو بھی ایک سائنسی کلیے کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:-

" میراجی ایک ایسا ہی مسافر تھا، جس نے اپنی تیز رفتاری کے باعث نہ صرف اپنے زمانے کی باعصمت سوسائٹی کے لیے مسائل پیدا کر دیے، بلکہ جو خود اپنی ذات کے لیے خطرہ بھی بن گیا اور بالآخر اس جٹ ہوائی جہاز کی طرح جو آواز کی رفتار سے زیادہ تیز اڑنے کی خواہش میں اپنے لیے ایک ساؤنڈ بیریئر (Sound Barrial) پیدا کر لیتا ہے۔ میراجی نے بھی ایک ایسی ہی رکاوٹ خود اپنے ہاتھوں تعمیر کر لی، پھر جب اس نے اس ساؤنڈ بیریئر کو عبور کرنے کی کوشش کی، تو ایک دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔" [۲۲]

دیکھیے یہاں ڈاکٹر وزیر آغا نے میراجی کی پوری زندگی کو سائنسی حقیقت کے آئینے میں ایک تمثیل بنا کر پیش کر دیا ہے۔ سائنسی نظریہ ایک جیٹ ہوائی جہاز سے لیا گیا ہے، جسے دوران پرواز میں اپنی ہی آواز کی پیدا کردہ رکاوٹ (Sound Barriar) کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ایک حد رفتار میں رہنا پڑتا ہے جو آواز کی رفتار سے ہرگز تجاوز نہ کرے۔ بصورت دیگر جب جہاز ساؤنڈ بیریئر سے ٹکراتا ہے تو ایک زوردار دھماکا ہوتا ہے، نتیجتاً جہاز تباہ ہو جاتا ہے۔ اس سائنسی تمثیل کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میراجی اپنی تخلیقی زندگی کے اعتبار سے موجودہ روایت سے آگے نکل گئے تھے اور بالآخر جیٹ جہاز کی طرح تباہ ہو گئے۔ اس ضمن میں اور بھی مثالیں موجود ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انھیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی سائنسی جہت کے حوالے سے اب تک جو بھی بحث کی گئی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا ذیل کا قول حرف بہ حرف صادق آتا ہے:-

"وزیر آغا ندرتِ بیان، ندرتِ ادا، اور ندرتِ اظہار پر مہارت رکھتے ہیں، لسانیات، منطق اور ریاضیات سے مدد لے کر انھوں نے نفسیات کو نئی فکری سطح دی ہے اور اس میں دانشورانہ شدت اور صلابت (Intellectual Rigou) پیدا کی ہے، جو کسی بھی سائنسی علم کا طرۂ امتیاز ہے۔" [۲۳]

ڈاکٹر وزیر آغا کی سائنسی جہت پر اس بحث کا اختتام کرتے ہوئے خیال آیا کہ اگر ان کی اس جہت کے حوالے سے کوئی نظریاتی اعتراض سامنے ہو تو اس کی وضاحت بھی راقم کے ذمہ ہی واجب ہے۔ تلاش بسیار کے بعد وارث علوی کے ذیل کے قول پر نظر پڑ گئی:-

" تعجب ہوتا ہے کہ آغا صاحب تنقید میں پامال تصوراتِ نقد اور فرسودہ خیالی سے زندگی بھر نجات حاصل نہ کر سکے۔" [۲۴]

تنقید و تحقیق میں ایک مبتدی کی حیثیت سے راقم نے مذکورہ بالا اقتباس کو کئی بار پڑھا، بار بار سوچا، مبادا کتابت میں غلطی ہوگئی ہو، پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، وارث علوی صاحب نے مضمون لکھ کر دے دیا ہو، کسی نے شرارت سے یہ اقتباس شامل کر دیا ہو۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ علوی صاحب جن وزیر آغا کی بات کر رہے ہیں یہ کہیں انڈیا میں کوئی دوسرے ادیب نہ ہوں۔ بہر کیف راقم نے اس پس منظر سے قطع نظر صرف اقتباس پر اپنی نظریں مبذول کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وارث علوی کی مذکورہ عبارت اگر واقعی ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ہے تو یہ ہرگز تحقیق پر مبنی نہیں، اسے "تنقید" کہنا بھی مناسب نہیں، البتہ اسے "تنقیص" پر محمول کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی تنقیصِ ناقص۔ ورنہ تنقیداتِ وزیر آغا کے ضمن میں تو راقم کی طرف سے پیش کردہ متنوع جہات کی تقسیم ہی بہ طور دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ مزید کہ ان کے خیالات و نظریات میں نہ صرف تنوع ہے بلکہ اس کے ساتھ جدت اور مسلسل ارتقا بھی ہے۔ آخری بات یہ ہے: دراصل ان کی تنقیدات بھی رشتوں کی اکائی (Web of Relations) کا منظر نامہ پیش کر رہی ہیں۔ سو، انھیں سمجھنے کے لیے کو انٹم تھیوری کو سمجھنا ضروری ہے۔

OOOOO

حوالہ جات

[۱] "مکالمات (وزیر آغا سے)"، مرتب: ڈاکٹر انور سدید، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، بار اوّل: ۱۹۹۱ء، ص: ۲۲۷

[۲] "تنقید اور جدید اردو تنقید" ڈاکٹر وزیر آغا، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، بار اوّل: ۱۹۸۹ء، ص: ۴۷

[۳] "مکالمات (وزیر آغا سے)"، ص: ۲۲۷، ۲۲۸

[۴] ایضاً، ص: ۲۲۷

[۵] "وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام"، مرتب: ڈاکٹر انور سدید، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، بار اوّل: ۱۹۸۵ء، ص: ۱۰۷

[۶] "تنقید اور جدید اردو تنقید"، ص: ۴۷

[۷] "سوسیور کا نظامِ فکر"، مشمولہ: "معنی اور تناظر (مقالات)" ڈاکٹر وزیر آغا، سرگودھا، مکتبہ نردبان، بار اوّل: ۱۹۹۸ء، ص: ۹۹

[۸] "ارسطو سے ایلیٹ تک" ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۵

[۹] "تنقید اور جدید اردو تنقید"، ص: ۲۸

[۱۰] "مکالمات (وزیر آغا سے)"، ص: ۲۲۸

[۱۱] "تخلیقی عمل" ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور، ابلاغ پبلشرز، بار ششم: ۲۰۰۳ء، ص: ۳۲

[۱۲] ایضاً، ص: ۳۳

[۱۳] "مکالمات (وزیر آغا سے)"، ص: ۲۲۸، ۲۲۹

[۱۴] ایضاً، ص: ۲۲۸

[۱۵] ایضاً، ص: ۲۲۷، ۲۲۸

[۱۶] "تکھاری، تکنیک اور قاری"، مشمولہ: "معنی اور تناظر (مقالات)"، ص: ۱۹۶

[۱۷] "ساختیات اور سائنس"، مشمولہ: "معنی اور تناظر (مقالات)"، ص: ۸۳

[۱۸] ایضاً، ص: ۸۳

[۱۹] "تمنا کا دوسرا قدم" ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ: "اسالیب"، سرگودھا، سہ ماہی، سلسلہ نمبر ۲، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص: ۶

[۲۰] ایضاً، ص: ۷

[۲۱] ایضاً، ص: ۷

[۲۲] "میرا جی"، ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ: "شجرہ"، خوشاب، سہ ماہی، جلد: ۱۲، شمارہ: ۱، ۲، جنوری تا جون، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۸

[۲۳] "وزیر آغا کی احتراجی نظریہ سازی" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، راولپنڈی، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی، طبع اول: ۱۹۹۶ء، ص: ۱۸

[۲۴] "ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری"، مشمولہ: "خندہ ہائے بے جا"، وارث علوی، کراچی، سٹی پریس بک شاپ، اشاعت: ۲۰۰۰ء، ص: ۲۰۰

☆☆☆☆☆

عابدہ بتول کے مضمون کا بقیہ

ہمیشہ انھیں اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا رہا ہے۔ وزیر آغا نے نہ صرف مخالفین کی تمام تر تنقید کو صبر سے برداشت کیا بلکہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور ان کے انشائیوں کی اصلاح بڑی عمدگی اور فراخ دلی سے کی اور ان کی تحریر کو ہر طرح کی درستی اور کمی بیشی سے قابل مطالعہ بنایا۔ ان کے انشائیے قارئین اور بالخصوص نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ان کے انشائیے اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ ان میں گہرے اور سنجیدہ فکری مسائل کو ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے جو قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے۔ انھوں نے زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو بظاہر ہماری روزمرہ زندگی میں ملتے ہیں مگر بہت سے لوگ ان کی وسعت تک نہیں پہنچتے۔ ان کے انشائیوں میں ایک مفکر اور حساس شاعر بھی نظر آتا ہے کیونکہ شاعرانہ تشبیہوں اور استعاروں کو جا بجا نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے جو موضوع کو دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ موضوعات اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے انشائیہ کی روح اور ان کے یہاں ملتی ہے اسی لیے انھیں جدید انشائیہ نگاری کا امام کہا جاتا ہے۔

موت آ جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے (بشیر بدر)

ارم ہاشمی کے مضمون کا بقیہ حصہ

اندھی، بہری بھیڑ کا منصب مجھے کسی صورت بھی قبول نہیں۔۔۔ کیا آپ کو قبول ہے!"

("کچھ ضرب الامثال کی مخالفت میں" از "چوری سے یاری تک")

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا دلکش انداز بیان اور پیرایہ اظہار ہے۔ ان کی سوچ قاری کو زندگی کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ موضوعات کی تلاش میں ادھر ادھر نہیں بھٹکتے بلکہ اپنے آس پاس کے واقعات اور معاملات کو انشائیوں میں ڈھالتے۔ جو ہماری نظروں کے بالکل سامنے ہیں مگر ہم ان سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

"جب میں بسنت کے موقع پر آسمان میں پتنگوں کو اڑتے دیکھتا ہوں تو میرا تخیل متحرک ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر میں رہتے ہوئے انسان تنگ و تاریک گلیوں سے شاذ ہی کبھی باہر جھانکتا ہے۔ رہا آسمان تو اس کی جانب دیکھنے کی اسے نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی خواہش۔ مگر بسنت کے موقع پر گلی اور محلے کا یہ کیڑا شاید سال بھر کے بعد مکان کی چھت پر آتا ہے۔ پھر وہ پتنگ اڑاتا ہے تو پتنگ کے ساتھ اس کی نظریں بھی گویا اڑنے لگتی ہیں۔ اس کی نظریں پتنگ کو عبور کر کے آسمان پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور وہ حیرت سے دیکھتا ہے کہ زمین کے اوپر ایک آسمان بھی ہے۔ پتنگ کی خوبی یہ ہے کہ وہ فلک کی بات کو زمین کے محرم تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان منافقتوں، نفرتوں اور دکھوں کی زد پر آئی ہوئی اپنی چھوٹی سی زندگی سے اوپر اٹھ کر آسمان کی فراخ اور بے داغ دنیا کا باسی بن جاتا ہے۔"

("بسنت" از "دوسرا کنارہ")

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے صرف رسمی حقیقت نگاری نہیں، تلخ و ترش حقائق کا مرقع ہیں۔ اور ان میں دکھائی دیتا معاشرہ، ہماری سچائی، ہمارے شعور اور ہماری سادگی کو ہڑپ کر لینے کی فکر میں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی مکتوب نگاری

محمد کامران شہزاد رانجھا

J$u O»¶gg$%$% Š Z

خطوط نگاری ایک ایسا شعوری عمل ہے جس کے ذریعے کسی بھی تخلیق کار کی نجی (ذاتی) داخلی، ذہنی (نفسیاتی) اور فکری واردات و کیفیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ شخصی خطوط لاشعوری طور پر ادیب یا شاعر کی ذاتی شخصیت اور تخلیقی سطح پر فنی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ خطوط نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں جہاں نجی بحثیں ہوتی ہیں وہاں ادب کا پرتو بھی جھلکتا ہے۔ خطوط نگاری کے عقب میں تخلیق کار بہت سارے موضوعات کو ایک ساتھ جگہ دیتا ہے دنیا کی ہر زبان اس فن سے شناسا ہے کیوں کہ پیغام رسانی کے بغیر انسانی شعور کا ارتقاء مکمل نہیں ہوتا۔

اردو میں یہ صنف فارسی کے مرہون منت آئی۔ فارسی میں یہ صنف درباروں میں پروان چڑھی تھی اس وجہ سے اردو میں یہ صنف نثر میں مروج ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک اہم خطوط نگاروں میں رجب علی بیگ سرور، تپش دہلوی، راسخ عظیم آبادی اور مرزا غالب شامل ہیں۔ اس عہد میں اردو نثر میں اسالیب کے دو نمونے سامنے آئے ایک کی نمائندگی "رجب علی بیگ سرور" نے کی جس نے خطوط میں فارسی آہنگ، پرتکلف، مسجع مقفی اسلوب صنائع بدائع اور عبارت آرائی کو اپنایا جس کی مثال "انشائے سرور" ہے جب کہ دوسرا اسلوب جس میں بے ساختگی اور ادبی چاشنی موجود ہے اس کی نمائندگی خطوط غالب کرتے ہیں اور خطوط غالب اردو نثر کا اہم ترین سنگ میل ثابت ہوئے۔ غالب نے اس صنف کو ادبی درجے پر فائز کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

غالب کے بعد اردو میں کئی قد آور شخصیات کے مکاتیب سامنے آ چکے ہیں جن کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، امیر مینائی، مولانا شبلی نعمانی، خواجہ حسن نظامی، نواب محسن الملک، الطاف حسین حالی، مولوی عبدالحق، مہدی افادی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، چوہدری محمد علی ردولوی، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، سعادت حسن منٹو، ابن انشاء، محمد خالد اختر، محمد حسن عسکری، داؤد رہبر، پطرس بخاری، قراۃ العین حیدر اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل ہیں۔ ان سب ادبا کے خطوط اپنی اپنی انفرادیت کی بناء پر اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں اور اردو کے لئے بیش بہا سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تخلیقی شخصیت کا معروف حوالہ نظم، تنقید اور انشائیہ ہے جدید نظم کے معمار شاعر اور انشائیہ جیسی صنف کو متعارف کرانے کے بعد ان کی تخلیقی زندگی کو سمجھنے کے لئے خطوط بھی معاون ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی حیثیتیں نظم نگار، انشائیہ نگار، نقاد اور خود نوشت سوانح نگار کے محاکے پر مشتمل ایک کتاب "ڈاکٹر انور سدید" نے "شام کے سورج" کے عنوان سے مرتب کی۔ اس کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مختلف مشاہیر کے نام ۳۴ خطوط بھی شامل ہیں۔ سر دست ان خطوط کے تجزیے سے مکتوب نگاری کی صنف میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نمایاں خصوصیات کو دیکھا جائے گا۔ مکتوب الیہان کے نام کچھ یوں ہیں:

۱۔ کنھیا لال ۲۔ شاد امرتسری
۳۔ ممتاز مفتی ۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی
۵۔ حمایت علی شاعر ۶۔ جوگندر پال
۷۔ ستار طاہر ۸۔ انور جمال
۹۔ گوپی چند نارنگ ۱۰۔ منظر علی خان منظر
۱۱۔ اکبر حمیدی ۱۲۔ رشید امجد
۱۳۔ بلراج کومل ۱۴۔ اطہر ناسک
۱۵۔ رشید نثار ۱۶۔ عرش صدیقی
۱۷۔ رضی الدین رضی ۱۸۔ فکر تونسوی
۱۹۔ مشفق خواجہ ۲۰۔ نظام صدیقی
۲۱۔ ریاض صدیقی ۲۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۳۔ مظفر علی سید ۲۴۔ رب نواز مائل
۲۵۔ ساقی فاروقی

ان خطوط میں ایک طرف ان کے روابط کا علم ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ خطوط ان کے طرز فکر، طرز احساس اور علمیت کا خوب صورت امتزاج ہیں۔ ان کے خطوط میں ان کی تخلیقی شخصیت کا پرتو جگہ جگہ نظر آتا ہے جس سے بہت سارے مخفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

شخصی خطوط کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مکتوب نگار کی جذباتی وابستگی کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے جیسے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں گاؤں کی آزاد فضا اور اس سے جذباتی وابستگی کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ اردو ادب کی دیگر تحریکوں کی طرح ارضی و ثقافتی تحریک کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے اس تحریک کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا ادب کی تمام اصناف میں اسی تحریک کے زیر اثر لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال ان کے خطوط میں نظر آتی ہے جس سے قاری بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کو اپنی دھرتی سے کتنا دلی لگاؤ ہے جس کا اظہار وہ "شمس الرحمٰن فاروقی" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں

"میں یکم اکتوبر کو ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوا اور پھر دس روز تک صاحب فراش رہنے کے بعد جب بستر سے طلوع ہوا تو نقاہت کا یہ عالم تھا کہ چلنا بھی مشکل تھا اس کے بعد گاؤں چلا گیا۔ وہاں کی کھلی فضاء، اچھا پانی اور خوراک کی فراوانی۔ ان سب چیزوں نے جادو کا اثر کیا"۔ (۱)

اسی طرح "ممتاز مفتی" کے نام خط میں اپنے گاؤں کی فضا کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"آپ نے میرے حلقہ احباب کا ذکر چھیڑا ہے بات یہ ہے کہ میں تو زیادہ وقت اپنے گاؤں میں گزارتا ہوں جہاں میرے حلقے میں درخت پرندے اور کسان شامل ہیں"۔ (۲)

ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط میں جو بنیادی نقطہ نظر ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت ہے۔ انہوں نے معروضی انداز میں مکتوب الیہ کی کتب اور انشائیوں کا تجزیہ کیا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اس انداز سے جانچا ہے کہ قاری ان کی تنقیدی بصیرت کو بخوبی جان اور سمجھ سکتا ہے۔ وہ خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کے ساتھ تخلیق کار کے لئے اصلاحات پر مبنی تجاویز بھی دیتے ہیں۔ "کنھیا لال کپور" کے نام خط میں ان کی کتاب کا تجزیہ کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میری نظروں سے آپ کی کتاب 'سنگ وخشت' بھی گزر چکی ہے۔ کم از کم میں ان الفاظ پر یقین نہیں لا سکتا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجموعے کے مضامین نشتر راج، مداح، تعاقب اور بے تکلفی بہت اچھے ہیں لیکن اس کتاب کا ایک مضمون بھی غالب اور جدید شعراء یا چینی شاعری یا اس قبیل کے ایک دو اور بلند پایہ مضامین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بقیہ مضامین تشنہ اور کمزور سی تخلیقات ہیں"۔ (۳)

"رضی الدین رضی" کے نام خط میں ان کے

انشائیہ کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"آپ کے انشائیہ کا اسٹائل اچھا ہے اور آپ انشائیہ کے مزاج سے بھی واقف ہیں۔ اسلوب میں مزاج کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی ہے جس سے تحریر قابل مطالعہ ہوگئی ہے البتہ اس انشائیہ کا آخری پیراگراف ایک خاص صورت حال سے متعلق ہے اور انشائیہ میں اجنبی سے لگتا ہے لہٰذا اسے حذف کر دیں"۔ (۴)

ڈاکٹر وزیر آغا نے صنف انشائیہ کو اردو میں متعارف کروایا اگرچہ ان سے پہلے سرسید، عبدالرحمٰن بجنوری اور مہدی افادی کے ہاں انشائی انداز کے رجحانات ملتے ہیں مگر باقاعدہ صنف کے طور پر رائج نہ ہو سکے۔ اس حوالے سے اولیت کا تاج ان کے سر ہے اس صنف سے ان کی محبت کا اظہار ان کے خطوط میں بھی جھلکتا ہے مثلاً "رشید نثار" کے نام خط پڑھنے سے ان کی انشائیہ سے دلچسپی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جس کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

"خوشی ایک زاویہ نگاہ کا نام ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے جو مسرت ملتی ہے وہ اکثر بڑی بڑی فتوحات سے حاصل نہیں ہوتی بس میں لیٹنا، کوئی اچھی نظم لکھنا، یا پڑھنا، کسی عزیز دوست کو خط لکھنا یا اس کا خط حاصل کرنا، پرندوں کو آسمان میں اور بچوں کو صحن میں کھیلتے ہوئے دیکھنا، کوئی مزیدار چیز کھانا یا کسی کو کھاتے ہوئے دیکھنا، کتنی معمولی معمولی باتیں ہیں مگر مسرتوں میں ڈوبی ہوئی۔ اسی لئے انشائیہ مجھے اچھا لگتا ہے کہ بڑی بڑی نام نہاد اور مستند اور بورژوائی مسرتوں کے بجائے چھوٹی چھوٹی عوامی خوشیوں کو HIGH LIGHT کرتا ہے"۔ (۵)

ان خطوط کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بعض خطوط میں انشائیہ جیسی موضوعاتی سنجیدگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اگر ہم بعض خطوط کے آغاز اور انجام کو حذف کر دیں تو وہ بالکل انشائی تحریریں معلوم ہوتی ہیں یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خطوط میں بھی صنف انشائیہ کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے جس کا اظہار وہ "شاد امرتسری" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"لڑکیوں کے بارے میں آپ کے نظریات دلچسپ ہیں۔ غالب مرحوم نے تو کہا تھا کہ میٹھے ہوں اور بہت ہوں لیکن میرے ایک بھتیجے صاحب تو غالب سے بھی ایک قدم آگے نکل گئے انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ نجانے کیوں انہیں سب لڑکیاں پیاری لگتی ہیں اب آپ کے خطوط میں اس کائناتی سوال کو پھر اٹھایا گیا کہ لڑکیاں خوبصورت کیوں ہوتی ہیں! صاحب اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ وہ خوبصورت ہوتی ہیں یا یہ کہ وہ شاید خوبصورت نہیں ہوتیں آپ کی تشنگی انہیں خوبصورتی بنا دیتی ہے۔ (۶)

ڈاکٹر وزیر آغا ادیب اور ادب کی آزادی کے قائل ہیں مگر کچھ اخلاقی ذمہ داریوں کو نبھانا بھی ادیب کا فریضہ قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں بے جا آزادی کے نام پر کسی کی دل شکنی کو اوچھا ہتھکنڈا سمجھتے ہیں۔ یہی حال جنسی موضوعات کے حوالے سے بھی ہے اس ضمن میں "اوراق" کا کردار فعال رہا ہے اس بات کا اظہار بھی ان کے خطوط کا اہم پہلو ہے جس کو "جوگندر پال" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"آپ نے 'اوراق' کے لئے بطور خاص یہ کہانی روانہ کی جس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ لیکن خالدہ کے کردار، نام اور مذہب کے پیش نظر بعض حلقے شاید اعتراض کریں اور میں اس معاملے میں بہت محتاط ہوں کہ کسی گروہ یا طبقے کی دل آزاری نہیں ہونی چاہیے، دوسری بات یہ کہ بیا اُن طبقے کے احتساب کے پیش نظر افسانے کے بعض تیز جنسی! اشاروں کو مدھم کر دینے کی ضرورت بھی ہے 'اوراق' کے مخصوص حلقے کے بعض تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر میں نے یہ بات کہی ہے ورنہ ادیب اصولی طور پر آزاد ہے امید ہے آپ میری مجبوریوں کے پیش نظر افسانے میں ضروری تبدیلیاں لے آئیں گے"۔ (۷)

ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک کتاب "نظم جدید کی کروٹیں"، جو نظم گو شعرا کے مستند اور معتبر تجزیوں پر مبنی ہے اور انہیں جدید نظم کے ناقدین میں بھی اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا ثبوت انہوں نے اپنے خطوط میں بھی جا بجا پیش کیا ہے مثلاً مجید امجد کے ابتدائی ناقدین میں وزیر آغا ایک اہم حوالہ ہیں اور "اوراق" وہ رسالہ ہے جس میں مجید امجد کے حوالے سے ابتدائی مضامین شائع ہوئے جس میں بہت سے مضامین ڈاکٹر وزیر آغا کے قلم کی دین ہیں مجید امجد سے ان کے عشق کی انتہا یہ بھی ہے کہ اپنے خطوط میں بھی ان کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مجید امجد کی نظموں کے اہم حوالوں کا تذکرہ "اطہر ناسک" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

"مجید امجد اصلاً حال کے لمحے کا شاعر ہے وہ حال کے نقطے کو ایک لبالب بھرے ہوئے پیالے سے تشبیہ دیتا ہے اکثر لوگ یا تو ماضی میں رہتے ہیں یا مستقبل میں، مجید امجد نے اصل زندگی حال کے اس لمحے کو گردانا ہے، جس میں دکھ اور خوشیاں باہم مدغم ہو کر انمول سے میں ڈھل جاتی ہے۔ (۸)

جدید نظم کے معمار ہونے کے ناطے ڈاکٹر وزیر آغا نے ان خطوط میں 'اردو شاعری کے مزاج کی توسیع کی ہے اور شعر کو پڑھنے کے چند اصول واضع کئے ہیں وہ موسیقیت کو شاعری کا ایک جز قرار دیتے ہیں کیوں کہ موسیقیت کے بغیر شاعری سے لطف حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ وہ شاعری کو نثر کی طرح پڑھنے کو ظلم قرار دیتے ہیں جس کو "حمایت علی شاعر" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"شاعری کو بھی لوگ باگ نثر کی طرح پڑھتے ہیں۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے شاعری کو تو قاشوں میں، ٹکڑوں میں، ٹھہر ٹھہر کر، دم لے لے کر پڑھنا چاہیے۔ ایک دن میں چار پانچ صفحات سے زیادہ کسی شعری مجموعے کو پڑھا جائے تو شاعری نثر کے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ شاعری سے لطف اندوز اس وقت تک ہونا ممکن ہے جب تک اندر کی موسیقی برقرار رہے" (۹)

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان خطوط میں مضمون کے حوالے سے بھی اپنا نقطہ نظر بیان کیا کہ کسی بھی مضمون یا تحریر کو دلکش بنانے کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جس کا برملا اظہار "شمس الرحمٰن فاروقی" کے نام خط میں کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مضمون ابھی ختم کیا ہے۔ سبحان اللہ! بہت خوبصورت مضمون ہے آپ کا استدلال مطالعہ، گہری سوچ اور متوازن انداز نظر اس کی ہر سطر سے آشکار ہے ایک اچھے مضمون کی یہ سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ ذہن میں سوالات کا کہرام برپا کر دے اور قاری کو قدم قدم پر اپنے نظریات کو ٹٹولنے اور مضمون نگار سے متفق ہونے یا اس سے جھگڑنے پر آمادہ کرے"۔ (۱۰)

عام طور پر خطوط نجی تحریریں ہوتے ہیں اس لیے ان خطوط میں بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ مکتوب الیہ کے خط کا جواب دیتے وقت سب سے پہلے اپنی نجی زندگی کی مصروفیات اور مسائل کا تذکرہ اکثر خطوط میں کرتے نظر آتے ہیں۔ "گوپی چند نارنگ" کے نام خط میں اپنے ذاتی معاملات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اسی دوران میں میری بیٹی کی شادی ہوگئی اور صاحبزادے کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کر لیا یوں ہم میں بیوی سرگودھا میں اکیلے رہ گئے لہٰذا ہم نے بھی نقل مکانی کی اور لاہور آ گئے" (۱۱)

مندرجہ بالا خطوط بہت سی اسلوبیاتی خصوصیات کے حامل ہیں ڈاکٹر وزیر آغا نے ان خطوط میں سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا۔ بعض خطوط میں انگریزی حروف کی کثرت، محاورات اور تراکیب کے استعمال سے اسلوب زیادہ دلکش بنتا نظر آتا ہے القاب و آداب بھی سادہ اور بے تکلف لکھے ہیں۔ وہ خط کے آغاز میں مکتوب الیہ کا نام زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

"برادرم" اور "محترم" کا لفظ اکثر و بیشتر دکھائی دیتا ہے۔ خطوط کا اختتام "والسلام" پر کرتے ہیں۔ یہ سب الفاظ اطافت و اپنائیت کے نمونے ہیں جو قاری کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مندرجہ بالا تجزیے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دوسری اصناف نظم، انشائیہ، تنقید اور سوانح کی طرح خطوط نویسی کی روایت میں بھی ایک انفرادیت حاصل ہے۔ یہ خطوط ذات کے انکشاف کے ساتھ، خارج کے مظاہر کو بھی جس طرح اپنی دسترس میں لیتے ہیں اردو میں اس کی مثال مفقود ہے اگر رجب علی بیگ سرور کے خطوط رنگین اسلوب کے نمائندہ اور غالب کے خطوط سادہ بیانیہ کے ساتھ عصری اور ذاتی شعور کے نمائندہ ہیں تو ڈاکٹر وزید آغا کے خطوط باطن کے ساتھ معاصر ادبی صورت حال کے عکاسی ہیں ان خطوط کی ایک نمائندہ خصوصیت جو اسے انفرادیت سے ہمکنار کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ناقدین ادب اور مورخ کو بیسویں صدی کے نصف آخر کے ادب کے مطالعہ کے لیے ان سے رجوع کرنا پڑے گا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام شمس الرحمٰن فاروقی، مشمولہ شام کا سورج، مرتب ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۵

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام ممتاز مفتی، ایضاً، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام کنہیا لال، ایضاً، ص ۱۴۹

۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام رضی الدین رضی، ایضاً، ص ۱۷۷

۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام رشید نثار، ایضاً، ص ۱۷۵

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام شاد امرتسری، ایضاً، ص ۱۵۱

۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام جوگندر پال، ایضاً، ص ۱۵۹

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام اطہر ناسک، ایضاً، ص ۱۷۴

۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام حمایت علی شاعر، ایضاً، ص ۱۵۷۔۱۵۸

۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام شمس الرحمٰن فاروقی، ایضاً، ص ۱۵۵

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط بنام گوپی چند نارنگ، ایضاً، ص ۱۲۵

❖○○○❖

وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

عابدہ بتول پی ایچ ڈی سکالر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

انشائیہ نگاری اردو ادب میں نئی صنف سخن کے طور پر اُبھری اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔ جدید نقاد اسے جدید ترین دور کی پیداوار قرار دیتے ہیں جبکہ اکثر ناقدین اس کے ابتدائی نقوش قدیم دور سے دکھانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ البتہ سر سید احمد خان کے ہاں اس کے ابتدائی نقوش سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کیونکہ مغربی علوم سے واقفیت کی بنا پر انھوں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا اور اردو میں مضمون نگاری کے حوالے سے عہد سرسید کو کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی نام "Essay" ہی سے اخذ کردہ نام مضمون اردو ادب میں شامل ہوا۔ مضمون نگاری سے جنم لینے والی صنف انشائیہ نگاری ادب میں اپنی الگ پہچان کے طور پر سامنے آئی تو اسے بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی اسے مضمون کی ایک خاص شکل قرار دیا گیا تو کبھی اس کے مترادف نئی صنف نثر...... ہر چند یہ صنف مضمون ہی کی طرح کا نثر پارہ ہے مگر جب مضمون اور انشائیہ کی خصوصیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ مضمون سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ انشائیہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے اس میں کسی صورت بھی شخصیت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا انشائیہ ادب برائے ادب کا قائل ہے۔ انشائیے میں مختصر سے مختصر موضوعات بھی ہوتے ہیں اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی نقطۂ نظر واضح کیا جاتا ہے۔ انشائیے میں اسلوب کی شگفتگی اور تازگی کو بالخصوص مدِ نظر رکھا جاتا ہے جب کہ مضمون میں اس کے برعکس اصلاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ مضمون ادب برائے زندگی کا قائل ہوتا ہے۔ مضمون میں دلائل سے بات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ موضوعات سنجیدہ اور فکری ہونے کی وجہ سے خارجی حقائق پر نظر رکھی جاتی ہے۔ انشائیے کا براہ راست تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ اسی لیے اسے موضوع کی ندرت اور تکنیک کی جدت کے اعتبار سے اردو کی تمام نثری اقسام سے مختلف قرار دیا جاتا ہے۔

جدید دور کے انشائیہ نگاروں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے۔ وزیر آغا نہ صرف معروف شاعر بلکہ منفرد نقاد کے طور پر سامنے آئے اور اپنی تنقید کے حوالے سے اپنی الگ پہچان بنائی۔ انشائیہ نگاری کو پروان چڑھانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا مگر اس حوالے سے ان کی شخصیت کافی متنازعہ رہی۔ مگر انشائیہ نگاری کو متعارف کرانے اور اسے ایک تحریک کی صورت دینے میں جو خدمات پیش کیں وہ اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیے طویل ادبی مباحث سے گزر کر اردو ادب میں باقاعدہ صنف کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کے انشائیوں کو باقاعدہ کتابی شکل میں سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا گیا جو کہ "خیال پارے" کے نام سے لاہور سے طبع ہوئے۔ دوسرا انشائی مجموعہ "چوری سے یاری تک" ۱۹۶۶ء میں جدید ناشرین لاہور اور تیسرا مجموعہ "دوسرا کنارہ" ۱۹۸۲ء میں مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع ہوا۔ اسی ادارے نے ان کا چوتھا مجموعہ "سمندر اگر میرے اندر گرے" کو ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ بعد میں ان تمام انشائی مجموعوں کو یکجا کر کے ایک کلیات کی صورت میں "پگڈنڈی سے روڈ رولر تک" کے عنوان سے مکتبہ نردبان سرگودھا سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ کلیات کا نام بظاہر قاری کو ایک لمحہ کے لیے روک کر سوچنے پر مجبور کرتا ہے مگر یہ نام انھوں نے اپنے سب سے پہلے اور آخری انشائیے کے نام کو ملا کر رکھا ہے کہ ماضی اور حال کی تمام داستان موضوعات میں ایسی سمودی گئی ہے جو ایک علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

جدید انشائیہ نگاری میں وزیر آغا نے گراں قدر خدمات پیش کیں اور تخلیق کو تنقید کے شانہ بشانہ فروغ دینے میں سرگرم عمل رہے۔ تخلیق بھی تنقید کی طرح مطالعہ وسعت کی متقاضی ہوتی ہے اور انشائیہ نگاری کی کامیابی کا دارومدار بھی لکھنے والے کی تخلیقی اختراع اور وسعت مطالعہ پر مبنی ہوتا ہے۔ بلاشبہ وزیر آغا نے جو انشائیے لکھے وہ تمام کے تمام قارئین سے داد وصول کرتے رہے۔ یہ کامیابی بحیثیت مجموعی جتنی وزیر آغا کے حصے میں آئی اتنی کسی اور کے حصے میں نہ آ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مختلف حوالوں سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کے مخالفین ان کے انشائیوں میں سنجیدگی کے عنصر کو حاوی قرار دیتے ہیں۔ شگفتگی اور بے ساختہ پن سے عاری دینے والے نقاد اگر ان کا ابتدائی انشائی مجموعہ "خیال پارے" کا ہی مطالعہ کر لیں تو انھیں ان کی بہت سے سوالوں کا نہ صرف جواب مل جائے گا بلکہ انشائیہ نگاری کی مروجہ روایت بھی نظر آئے گی۔ وزیر آغا کے انشائیے حسن بیان، تازگی فر اور رمز و ایمائیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید لکھنے والوں میں انشائیہ نگاری کو فروغ دینے میں وزیر آغا کے انشائیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں پر ہونے والی تنقید ادبی کم اور شخصی و ذاتی نوعیت کی زیادہ ہوئی کیونکہ ادبی گروہ بندیوں کی زد میں

اس مضمون کا بقیہ صفحہ 84 پر ملاحظہ کریں

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید

پروفیسر شرافت علی
شیخ عماد کہنہ، تحصیل وضلع قصور،
0321-6502955

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

ہر انسان بنیادی طور پر تحقیق وجستجو کی فطری صلاحیتیں رکھتا ہے وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس میں مزید بہتری کے پہلو تلاش کرتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ نئی جہات تلاش کرتا ہے اور تنقید کی کئی نئی جہتیں ہیں۔ نئی تنقید ان تمام جہتوں سے آشنا ہو کر محض چونکا دینے والی تحریر کے سہارے پروان نہیں چڑھی بلکہ زبان و بیان کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب کا حصہ بنی۔ الفاظ کے مناسب استعمال سے خیال کی ترسیل نے تنقید کی مختلف گتھیاں سلجھائی ہیں اور بہت سے ناقدین جنھوں نے مختلف موضوعات پر بحث کرتے ہوئے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے ہر فنکار نے اپنے انداز میں فن کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ناقدین ان تمام فنکاروں کے فن کی انفرادیت کا احترام کرتے ہوئے اپنی تنقیدی بصیرت سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔

جس طرح ہر فنکار اپنے مخصوص انداز فکر اور طرز احساس کی بنا پر پہچانا جاتا ہے اسی طرح نقاد بھی مختلف مکتبہ فکر کا تجزیہ یا مشاہدہ اپنی فنی بصیرت سے کرتے ہیں تنقید کا میدان مختلف رجحانات اور دبستان میں تقسیم ہو چکا ہے اور ہر نقاد اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی تنقید کے میدان میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ ان کے تنقیدی نظریات کی وسعت میں نہ صرف دیگر زبان وادب کے علوم سے متاثر ہو کر ان کی روایت کا مطالعہ شامل ہے بلکہ اس مطالعہ کے باوجود ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے تمام علوم کو پس منظر بنا کر اردو ادب میں تنقید نو کی ہے۔ کیونکہ کسی ملک کی زبان کی تنقید سے براہ راست فیض یاب ہونے کے بجائے مختلف علوم کو اساس بنایا ان کے ہاں تنقید کا جو نظام ملتا ہے وہ ان کا دیگر تنقیدی ادب کا عمیق مطالعہ ہے جس سے انھوں نے نئے نتائج مرتب کر کے اپنا نیا تنقیدی نظام وضع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کی تنقید کو اپنا خاص نظریہ اور طرز نقد کی داعی قرار دیا جاتا ہے۔

تاریخ، فلسفہ، نفسیات، معاشیات، حیاتیات، ساختیات، اور پس ساختیات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی نظریات میں اس ماحول کا بہت عمل دخل ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے کئی شب و روز گزارے تھے۔ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی اپنے عروج پر تھی۔ اسی لیے وہ اپنی زمین اور فضا سے استعارے اور علامتیں مستعار لے کر تنقید کو عام قاری کے لیے تمدنی اور ثقافتی حوالے سے وسیع النظر اور اصولی بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا نے ثقافت کو زمین کی پیداوار قرار دیا تھا۔ وزیر آغا پر تنقید کرنے والوں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح ایک تخلیق نگار اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنا الگ نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس سے اس کا اسلوب یہاں بھی دوسروں سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح ہر نقاد بھی چیزوں کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور اسے اپنے انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تخلیق کو پہلے اپنے اندر جذب کر کے نئی دریافت کرتا ہے تو اسے تنقیدی ادب میں اپنا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی یہی کیا اور اپنی تنقید کو تخلیقی تنقید نگار کی حیثیت سے پیش کیا۔ یوں تو ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں ہیں مثلاً وہ شاعر، انشائیہ نگار اور تخلیق کار بھی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ تنقیدی سرمایہ ان کی ایک الگ پہچان ہے جو انھیں ناقدین کی صف میں ممتاز کرتا ہے۔ ان کے تنقیدی سرمائے پر نظر ڈالیں تو ہمیں مختلف موضوعات کے حوالے سے بہت سی کتابیں ملتی ہیں جو ان کے تنقیدی نظریات کو بڑی عمدگی سے واضح کرتی نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب جو تنقیدی حوالے سے ملتی ہے وہ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے ۱۹۵۹ء میں اکادمی پنجاب لاہور نے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے عنوان سے شائع کیا۔ "نظم جدید کی کروٹیں" ۱۹۶۳ء میں اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۶۵ء میں "اردو شاعری کا مزاج" جدید ناشرین لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو سب سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی ادارے سے ۱۹۶۷ء میں "تنقید اور احتساب" شائع ہوئی۔ مکتبہ اردو زبان سرگودھا سے ۱۹۷۲ء میں "نئے مقالات"، ۱۹۷۷ء میں "تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں" اقبال اکیڈمی لاہور، اور ۱۹۷۹ء میں "نئے تناظر" اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد، ۱۹۸۱ء میں "تنقید اور مجلسی تنقید" آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۶ء میں دائرے اور لکیریں" مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۹ء میں "تنقید اور جدید اردو تنقید" انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۰ء میں "انشائیہ کے خدوخال" مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۹۰ء، مجید امجد کی داستان محبت "آواز جرس پبلشرز لاہور، ۱۹۹۱ء میں "ساختیات اور سائنس" مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۹۳ء میں "دستک اس دروازے پر" مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۹۷ء میں "غالب کا ذوق تماشا" اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۸ء میں "معنی اور تناظر" مکتبہ نردبان سرگودھا، ۲۰۰۷ء میں "امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر" اردو سائنس بورڈ لاہور سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ تنقیدی سرمایہ تنقید کے میدان میں نمایاں اور ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے تنقید میں اپنا منفرد مقام بنایا کیونکہ وہ کسی خاص نظریے کے حامی نہیں تھی بلکہ تنقید کو انھوں نے ایک نئے دھارے کی جانب گامزن کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید کی جو تھیوری پیش کی اس کے پیچھے بھی وہی تمام علوم کارفرما تھے۔ جن کا عمیق مطالعہ وزیر آغا کے لیے مختلف شعبوں کے علوم کی تحقیقات کے بعد اپنے انداز میں نتائج مرتب کرنے کا سبب بنا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا تنقیدی نظام وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کیونکہ ان کے سامنے تنقیدی نظریات کی بہت سی مثالیں موجود تھیں مگر انھوں نے اپنی انفرادیت کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر ان کے وسعتِ مطالعہ اور منفرد سوچ کی حامل تھی۔ ان کے تنقید نظریات سے جنم لینے والے سوالات اور ان پر ہونے والے اعتراضات مستقبل کے ناقدین کو آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی تنقید سادہ اور سہل انداز کی وجہ سے قاری کی مشکل آسان بناتی ہے اور اس پر معلومات کے نئے در وا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر بے شمار مقالات تحریر ہو چکے ہیں اور مزید تحقیق سے انھیں نئے زاویوں سے دریافت کیا جاتا رہے گا۔ یہ مختصر تحریر ان کی تنقیدی بصیرت کا کسی بھی طرح مکمل احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ چند الفاظ تو صرف ان سے عقیدت کا مختصر اظہار ہے۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

❖○○○❖

وزیر آغا کے انشائیوں میں منظر نگاری

تنویر الرحمٰن

لیکچرار، اردو

گورنمنٹ کالج شاہ پور صدر (سرگودھا)

اُردو ادب (نظم ونثر) اور تنقید کی کوئی بھی تاریخ ڈاکٹر وزیر آغا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے تنقید ی میدان میں نئے موضوعات کے تصورات ہی پیش نہیں کیے بلکہ ان کے خدوخال متعین کرنے میں قابل قدر کام بھی کیا۔ اُردو شاعری کو علامتوں اور استعاروں کے وسیع جہاں سے آباد نظمیں اور غزلیں عطا کیں جن میں مقامی تہذیب اور ہندوستان کی تاریخ کی بُو باس موجود ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بحیثیت سوانح نگار، سفر نامہ نگار، مدیر، دیباچہ نگار اور مکتوب نگار بھی اعلیٰ درجے کے تخلیق کا ثبوت دیا۔ "اوراق" جیسا ادبی پرچہ نکال کر دو نسلوں کی ادبی تربیت کی اور جدید ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انشائیہ کے نقوش، ادب میں بکھرے ہوئے تھے، ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں جمع کیا اور اردو ادب کی انشائیہ جیسی صنف کو باضابطہ تخلیقی صنف کی شکل دے کر اس کی ترقی و ترویج میں سالار کا کام کیا۔ انھوں نے انشائیہ نگاری کو جدت، تازہ کاری اور مختلف علوم کی مدد سے ہمہ جہت اور متنوع الجہت بنایا۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں منظر نگاری ایک ایسا موضوع ہے جو نئی راہیں لے کر وارد ہوتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں تمام اقسام کی منظر نگاری اپنے پورے لوازمات کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ انشائیہ میں اس طرح کی منظر نگاری ممکن نہیں ہوتی جس طرح کی داستان، ناول، افسانہ، مثنوی اور دیگر اصناف میں کی جاتی ہے کیوں کہ انشائیہ میں اُس طرح کی منطقی ترتیب اور ڈسپلن نہیں ہوتا جو ان اصناف کا وصف ہے۔ انشائیہ میں تو لمحہ بہ لمحہ منظر تیزی سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے انشائیہ کے مزاج اور آہنگ کے تقاضوں کے مطابق جو منظر کشی وزیر آغا نے کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے ہاں منظر جامد و ساکت نہیں بلکہ حرکت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور قاری منظر کے ایک ایک گوشے اور رنگا رنگی میں خود کو موجود پاتا ہے بقول ڈاکٹر بشیر سیفی:

> "ان کے انشائیوں کے متنوع اور رنگا رنگ موضوعات ان کے وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کے غماز ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر انشائیہ لکھا اسے اہم اور قابل توجہ بنا دیا اور اس کے ایسے ایسے گوشے اجاگر کیے جو ایک سطحی اور کم مطالعہ انشائیہ نگار کے بس کا روگ نہیں" (۱)

وزیر آغا کے خیال میں انشائیے کا عمل آسمان سے زمین کے مناظر دیکھنا نہیں بلکہ وسیع تناظر سے آسمان اور زمین میں کسی معلوم شے کی تلاش ہے اور جب وہ شے مل جائے تو اس سے حاصل شدہ مسرت کو انشائیے میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے منظر بھی ملتے ہیں جو آنے والے وقت کا پتہ دیتے ہیں جس کا وہ اپنے تخیل سے پہلے ہی عکس بنا ڈالتے ہیں۔ ایک قسم کی منظر نگاری وہ ہے جس میں کائناتی نظام کی منظر کشی کی جاتی ہے، دوسری قسم کی منظر کشی فطرت سے متعلق ہے اور تیسری قسم کی منظر کشی انسانی فطرت و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں تمام قسم کی منظر کشی فنی کمال کے ساتھ موجود ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ان کو اردگرد کی ہر اس چیز سے محبت اور لگاؤ ہے جس کو دیکھنے کے بعد ان کے ذہن پر کوئی اچھا اور خوش گوار تاثر رہ جائے۔ وزیر آغا نے انشائیوں میں منظر نگاری کے ضمن میں کمال پیدا کیا ہے، چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی جب ان کی نظروں کو بھا گئی تو وہ اس کے اندر معنی کا ایک جہاں آباد کر دیتے ہیں۔ بقول منور عثمانی:

> "وزیر آغا کے انشائیے میں ان کی فکر اور مزاج کے سب پہلو اور عمر اور احساس کے تمام موسم گھل مل گئے ہیں۔ اس طرح انشائیہ، نکتہ آفرینی اور حظ رسانی ہی کا حامل نہیں رہا، انشائیہ نگار کی گزرتی زندگی کا گہرا تناظر اور وسیع منظر بھی بن گیا ہے۔" (۲)

وزیر آغا اشیا اور مظاہر کو بے مصرف قرار دینے کے حق میں نہیں چناں چہ وہ زندگی کے ایک ایک پہلو پر غور کر کے اسے انسانی زندگی کی کئی بنیادی حقیقتوں کے لیے آئینہ بنا دیتے ہیں اور جب یہ آئینہ ان کے انشائیوں میں منظر کشی کرتا ہے تو اس میں سے نکلنے والی کرنیں ہر چیز کو روشن کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کا جائزہ لے کر اس میں عیاں ہونے والی حقیقتوں کا بیان اپنے منظروں میں پیش کر دیتے ہیں اور کائنات کے قریب ہو کر اس کی چیزوں سے عطر کشید کر کے قاری کو پلاتے ہیں۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں مناظر فطرت کی عکاسی میں ان کا سب سے بڑا پہلو دیہات سے متعلق ہے۔ انھوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ دیہات کی خالص فضا میں گزارا، دیہات کی ہر چیز کو قریب سے دیکھا، اس کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ فطرت کے بہت بڑے شیدائی اور پرستار ہیں، وہ فطرت کے ہر منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور منظر کشی کرتے ہوئے ان منظروں میں ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ عام سا منظر بھی فطرت کا اہم نمائندہ دکھائی دیتا ہے۔ صبح کے چند مناظر کا بیان دیکھیے:

> "صبح جب سورج نکلتا اور گندم کے کھیتوں میں اوس کے گرد وں سبک اندام قطرے یکا یک دمک اٹھتے تو مجھے ہر قطرے میں اپنی ہی شکل دکھائی دیتی اور یوں خود سے ملاقات کی صورت از خود پیدا ہو جاتی یا جب اندھیری رات میں آسمان کی سیج پر لاکھوں ستارے موتیے کے پھولوں کی طرح خوشبو بکھیرتے تو مجھے اس خوشبو میں اپنے ہی جسم کی باس کا گمان ہوتا اور یوں خود سے ہم کلام ہونے کی ایک صورت پیدا ہو جاتی" (۳)

> "آسمان کی نیلاہٹیں اس گہری جھیل کی طرح تھیں جس پر ایک سحر طراز روشنی پھیل رہی ہو فضا میں گرد کا نام ونشان تک نہیں تھا اور روشنی کا سیلاب تھا کہ ہر شے میں سرایت کرتا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بس پہلا احساس تو اس سحر طراز روشنی کے وجود کا تھا جس کے پرتو سے آسمان، زمین، اڑتے ہوئے پرندے نسیم سحر کے جھونکوں پر سر دُھنتے ہوئے درخت، حد نظر تک پھیلے ہوئے کھیت اور ان کھیتوں سے آگے ننگی سیاہ پہاڑیوں کا ایک بکھرا ہوا سلسلہ جگمگا اٹھا تھا۔۔۔" (۴)

وزیر آغا، انشائیوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سچے مرقعے کھینچتے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی تصویر کاری کرتے ہوئے وہ ایسے الفاظ کام میں لاتے ہیں کہ قاری کھو کر رہ جاتا ہے لیکن وزیر آغا زندگی کی اِن حقیقتوں سے پردہ اٹھانے کا عمل ایک خوش باش انسان کی طرح انجام دیتے ہیں۔ ویسے بھی ایک اچھے انشائیہ نگار کی پہچان ہے کہ وہ اپنے افکار سے اس طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح اپنے باغیچے سے۔ وزیر آغا بھی اپنے اندر کے جذبات کا اخفا بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بعض ناگوار چیزوں کا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان کے دل کو گوارا لگنے لگتی ہیں۔ دکھ، درد کی چیخ کے بارے میں دو اقتباس دیکھیے

> "آنسو بے بسی کی پیداوار ہیں اور میں کبھی بے بس نہیں ہو سکتا۔ ہنسی اور گریہ دونوں ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہیں، ایک خود غرضی کی علامت ہے اور دوسرا شکست کا اعلان۔ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو چیخ کا والہ و شیدا ہوں۔ چیخ جس میں ایک انوکھی جرات، ایک بے پناہ احتجاج ہے اکڑ لینے کا

ایک انوکھا عزم، متصادم ہونے کی ایک شدید آرزو، دوسروں کو اپنے وجود کا احساس دلانے کی ایک تیز خواہش یہ ہے چیخ کا منبع! مجھے چیخ سے بے پناہ محبت ہے"۔(۵)

"مجھے چیخ کی کھردری غنائیت سے والہانہ پیار ہے۔ کسی ہنستے ہوئے شخص کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص اندر سے کھوکھلا ہے۔ روتے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں کے یہ تو محض ایک شمع ہے جو ہولے ہولے پگھلتی چلی جارہی ہے۔ صرف چند لمحے۔۔۔۔۔۔ اور شمع پگھل کر ڈھیر ہو جائے گی لیکن چیختا ہوا شخص اچیختے ہوئے شخص کی کیا بات ہے اس کا عزم اس کا احتجاج اس کی آزاد منش ذہنیت انسانیت کا سرمایہ ہے۔"(٦)

حیرت و تحیر اور دانائی و آگہی کی فضا کو بھی وزیر آغا اپنے انشائیوں میں منظر نامہ کے طور پر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کے اندر اپنی جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے ہاں حیرانی و تشکیک، انسانی فہیم اور کائناتی مظاہر کے اتصال سے جنم لیتے ہیں۔ بطور انسان اپنے داخلی کمالات سے لے کر مظاہر عالم تک ان کی حیرانی اور غور و فکر باہم گتھے ہوئے نظر آتے ہیں جو کہیں کشف ذات سے روشناس کراتے ہیں تو کہیں دنیا کے مظاہر کے اسرار و رموز تک ہمیں رسائی دیتے ہیں۔ وزیر آغا کا کہنا ہے کہ بیج کا چھلکا ٹوٹے تو اس کے اندر مغز کو نمو کی اجازت ملتی ہے۔ اسی طرح شخصیت کا بوجھ اُترے تو قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ بقول رفیق سندیلوی:

"چوں کہ ہمارے انشائیہ نگار کی شخصیت دبیز ہے اور ملمع سے پاک ہے اس لیے ایک حرکی وجود کی اس سطح پر جب وہ فطرت کے مشاہدے اور سرشت فطرت کے مطالعے پر راغب ہوتے ہیں تو ان کی حیرت دو چند ہو جاتی ہے، منظر ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر انھیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ مظاہر کی دل کشی، بوالعجبی اور فیاضی انھیں متحیر و منقلب ہونے کی ادا سکھاتی ہے اور فطرت کی خلاقانہ، مہاجرانہ اور باغیانہ روش انھیں خیال انگیز تجربے تک پہنچاتی ہے۔"(۷)

فطرت کی انسان سے ہم کلامی اور دونوں کے بھیدوں کو سمجھنے کے حوالے سے ایک مثال دیکھیے

"چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ کوئی انسان دُور دُور تک موجود نہیں تھا۔ اوپر ایک بیکراں آسمان تھا جس میں گول مٹول سے ابر پارے بچوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ نیچے ایک سرسبز شاداب دھرتی تھی جس پر پرندے اور کیڑے اور شہد کی مکھیاں اور بھنورے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گرم گہری گفتگو میں مصروف تھے۔ پھر ایک احساس میرے اندر سے، اندر کی کسی بہت ہی تاریک گپھا سے برآمد ہو کر مجھ پر چھا گیا۔ احساس یہ تھا کہ میں تنہا تو ہوں لیکن اکیلا نہیں ہوں۔ اس لمحے سے قبل میں نے کبھی اپنے ارد گرد کی اشیا اور مظاہر کی زبان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ مجھے تو اس زبان کو سننے کا بھی اتفاق تک نہیں ہوا تھا مگر اب مجھے محسوس ہُوا کہ آسمان اور زمین اور ان دونوں کی آغوش میں سمٹی ہوئی ہر شے نجانے مجھے کب سے صدائیں دے رہی ہے، میری طرف اپنی باہیں پھیلائے ہمک رہی ہے بلکہ مجھ پر خوشبوؤں اور کرنوں اور آوازوں کی بارش کر رہی ہے مگر میں ہوں کہ اکلاپے کے زندان میں قید اپنی ساری حسیات کو مہر بہ لب کیے ان تمام پیغامات سے یکسر بے بنیاد ہوں۔ اُس وقت مجھے محسوس ہُوا کہ میں کُل ہوں جس کے حصے بخرے ہوہی نہیں سکتے تب میں نے اپنے ماضی پر ایک نگاہ ڈالی جو مجھے آوازوں اور خوشبوؤں اور کرنوں کا ایک گجرا سا دکھائی دیا۔ یہ ہار تو ہمہ وقت میرے گلے میں پڑا تھا میں اس کے وجود سے آشنا کیوں نہ ہو سکا۔۔۔؟۔"(۸)

وزیر آغا انشائیوں میں نئے مفاہیم کو گرفت میں لینے کے لیے تشبیہات اور استعارات کا سلسلہ بھی اس طرح قائم کرتے ہیں کہ وہ منظر کشی میں توسیع کرتا نظر آتا ہے۔ یہ سلسلہ اُن کے مناظر میں رنگینی اور چاشنی پیدا کرتا ہے۔

تشبیہ کی دو خوبصورت مثالیں دیکھیے

"جب چرواہا اپنے گلے کو کسی سرسبز و شاداب میدان، جھاڑیوں سے اَٹے ہوئے صحرا یا کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر لا کر آزاد کر دیتا ہے، جس طرح تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جائے تو منکے فرش خاک پر گرتے ہی لڑھکنے اور بکھرنے لگتے ہیں، بالکل اسی طرح جب گڈریا اپنے ریوڑ کو آزاد کرتا ہے تو وہ دانہ دانہ ہو کر بکھر جاتا ہے"۔(۹)

"جب دھند کا کوئی سفید آنچل چیڑ کی شاخوں میں اٹک جاتا ہے تو چیڑ کی ٹہنیوں سے موتیوں جیسے قطرے ایک ہلکی سی جھنکار کے ساتھ میرے شانوں پر آ گرتے ہیں۔"(۱۰)

فطرت کے مظاہر و مناظر کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی قوتوں اور حسن فطرت کے اظہار میں بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے ہاں فطرت ہر دم احساسِ آزادی سے لہلہاتے اور سرشار ہوتے ہوئے منظر پیش کرتی ہے اور ان کی رفتار فطرت کی رفتار سے ہم آہنگ ہوتی ہے وزیر آغا کہتے ہیں کہ فطرت پرستی کی طرف راغب ہونا چاہیے اس سے زندگی اور کائنات کو نئے زاویے سے دیکھنے کی ایک کوشش جنم لیتی ہے جسے تخلیقی سطح پر لایا جاتا ہے۔ فطرت کسی بھی منظر کی تخلیق کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ بقول جمیل آذر:

" ان کے انشائیے زندگی کی نئی پرتیں، نئے پہلو، نئے گوشے اور نئے زاویے پیش کرتے ہیں۔ ہر انشائیہ زندگی کے کسی بڑے اہم اور گہرے مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"(۱۱)

وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ خراماں خراماں چلتے ہیں، وہ فطرت کا پردہ یک دم چاک نہیں کرتے بلکہ ایک دل کش انداز میں آہستہ آہستہ اس کا گھونگٹ اتارتے چلے جاتے ہیں اور مناظر فطرت سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ وزیر آغا کا فطرت سے تعلق من و تو کے امتیاز کے ساتھ ہے جس کا اظہار ان کے انشائیوں میں یوں ہوا ہے کہ باصرہ سے تعلق رکھنے والی تشبیہات، استعارات اور **امیجز** برابر ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر نہ صرف فطرت کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ خود اپنے مشاہدے کے عمل کو بھی دیکھنے کی جرأت رندانہ کی ہے اور یوں ان کے انشائیوں میں حقیقت، منظروں کا ایک سلسلہ لے کر وارد ہوئی ہے۔

الغرض وزیر آغا کے انشائیوں میں منظر نگاری کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان کے مناظر کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بطور خاص فطرت سے رابطہ واجبی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ وہ ان مناظر کو دیکھ کے صرف حظ نہیں اٹھاتے بلکہ اُن سے پیغامات بھی وصول کرتے ہیں، کسی چیز یا منظر کو دیکھنے کے بعد اس کو اپنے باطن میں اتار لیتے ہیں اور اس سے نئے نئے مفاہیم پیدا کر کے معانی کا اک جہان آباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ منظر نگاری کرتے ہوئے خود کو اس کا ایک جزو سمجھتے ہیں مگر ایسا جزو جو کُل ہے اور تمام اشیا اس کا حصہ ہیں۔ یوں ان کے انشائیوں میں تنوع اور رنگا رنگی کی ایک ایسی وسیع دنیا آباد ہوتی ہے جس کی لذت قاری کو خود فراموشی کی منزل پر لے جاتی ہے۔

حواشی

(۱) بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، لاہور، منزہ سنز پبلشرز، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۲۲۸۔۲۲۹

(۲) منور عثمانی، وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، مطبوعہ، رسالہ: کاغذی پیرہن، لاہور، مئی، جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۹

(۳) وزیر آغا، دوسرا کنارہ (لاہور) سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، طبع اول: ۱۹۸۲ء، ص ۴۳

(۴) وزیر آغا، خیال پارے (بارش کے بعد) سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، طبع دوم: ۱۹۸۳ء، ص ۹۳

(۵) وزیر آغا، پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (چیخنا)، سرگودھا، مکتبہ زر دبان، طبع اول: ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۸

(٦) ایضاً، ص ۲۲۱

(۷) رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰٦ء، ص ۲۴

(۸) وزیر آغا، پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (اکلاپا اور تنہائی)، ص ۳۸۴۔۳۸۵

(۹) وزیر آغا، سمندر اگر میرے اندر گرے (چرواہا)، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، طبع اول: ۱۹۸۹ء، ص ۲۹

(۱۰) وزیر آغا، خیال پارے (دھند)، ص ۱۲۹

(۱۱) جمیل آذر، وزیر آغا کا فن انشائیہ نگاری، مشمولہ، شام کا سورج (مرتب: ڈاکٹر انور سدید)، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹٦

❖OOO❖

ڈاکٹر وزیر آغا اور اردو انشائیہ

ارم ہاشمی
مدیرہ: سہ ماہی "تمام" میانوالی

ایک عرصہ تک ہمارے ہاں مزاحیہ، انکاہیہ، طنز و مزاح کو بھی انشائیے کے زمرے میں ڈال دیا جاتا رہا ہے، حالانکہ انشائیہ ان تمام سے مختلف اور معنی آفرینی کا ایک ایسا جہان ہے جس کے دیار میں داخل ہونے کے لیے تعصب کی عینک اتارنا پڑتی ہے ورنہ نہ آپ انشائیے کو سمجھ سکیں گے اور نہ دیگر مضامین میں فرق کر سکیں گے "انشائیہ" کی اصطلاح قریب قریب 1956ء میں عام ہوئی۔ اول اول جن اہل قلم نے "انشائیہ" کے نام سے تخلیقات لکھیں، ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے نام شامل ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیے "شہرت کی خاطر"، مشکور حسین یاد کے "جوہر اندیشہ" اور ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے چار مجموعے "خیال پارے، چوری سے یاری تک، دوسرا کنارا، سمندر اگر میرے اندر گرے" منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ تمام مجموعے "پگڈنڈی سے روڈ رولر تک" میں شامل ہیں۔ یہ تینوں اہل قلم گرچہ ایک ہی دور سے متعلق ہیں مگر انشائیہ نگاری کے سلسلے میں ان کا نقطہ ، نظر اور پیرایہ ، اظہار چنداں مختلف ہے۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں طنز و مزاح تو ہے لیکن وہ سنجیدگی بھی ملتی ہے جو عمومی مضامین سے مخصوص ہے۔ جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں موضوع کا نیا پہلو اور طنز و مزاح کی بجائے شگفتگی اور تخلیقی تازگی ملتی ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں۔

"انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"

اردو ادب میں انشائیہ نگاری کو بطور صنف متعارف کرانے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی جریدے "اوراق" کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ خود ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے بھی لکھے اور "انشائیہ" کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مضامین بھی لکھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ کی تاریخ و تنقید کے حوالے سے ایک مجموعہ "انشائیہ کے خدو خال" منظر عام پر آ چکا ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار جس فکری آزادروی کو برتتا ہے اسے ذہن کی آوارہ خرامی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ انشائیہ داخلی تاثرات کا ترجمان ہوتا ہے اس اعتبار سے یہ ایک داخلی صنف نثر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے ان کی شخصیت کا پر تو ہیں۔ دراصل ہر ادیب اپنے مخصوص دور کی پیداوار ہوتا ہے اور وہ ایک خاص نظام اور ماحول میں تربیت پاتا ہے وہ اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ اپنے تاثرات کا اظہار بھی انہی کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس وقت اردو شعر و ادب ایک کربناک دور سے گزر رہا ہے۔ زندگی کے کسی بھی حوالے پر گفتگو کرتے ہوئے انسان تلخیوں سے آباد ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کچھ دیر کے لئے اپنی مصروفیات اور ضروریات ترک کر کے زندگی کی طرف دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ سپر پاور حکومتوں نے اپنی لالچ زدہ پالیسیوں کے تحت تمام دنیا کو آگ و بارود کی بھٹیوں میں جھونک دیا ہے۔ جاروں اور جنگ اور دہشت گردی کے واقعات سے پھیلتی ہوئی بے چینی نے عام انسان کی زندگی کو بے اعتدالیوں کا حصہ بنا دیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں مکر و سیاست نے پوری طرح پاؤں جما لئے ہیں۔ ایسے ماحول میں جینے والے ادیب کس طرح محبت و الفت کی بولیاں بول سکتے ہیں؟ اور اگر ایک ادیب اپنے عصر سے آنکھیں موند لیتا ہے تو اس کا ادب کس لائق؟ ڈاکٹر وزیر آغا اندرون ذات سمٹنے کی بجائے زندگی کی پھیلتی اور بڑھتی سرحدوں سے آگہی کا رشتہ رکھتے تھے۔ ان کا شمار ان جدید ادیبوں میں نہیں جو جدید زیادہ ہیں اور ادیب کم۔ بلکہ وہ ایسے پختہ کار ادیب تھے جو اپنی ادبی قدروں سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ ان پر مکمل دسترس بھی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے انشائیوں میں ہر اس خیال کی گنجائش نکالی جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہوا اور جسے وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے شعور و احساس کے ذریعہ ایک گم شدہ دنیا پھر سے اپنے خدو خال کے ساتھ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے اور از سر نو با معنی بن جاتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جدید صنعتی معاشرے کی بدولت رواج پانے والی بے حسی، دیمک کی طرح آہستہ آہستہ ہمارے سماج کو کھوکھلا کرتی جا رہی ہے۔ رشتے ، ناطے، تعلق، واسطے سب شکست و ریخت کا شکار ہیں انسان گم کردہ راہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اپنے ہی گھر میں 'ڈرا سہما' بے گھری کی ذہنی اذیت جھیل رہا ہے۔ رنجشیں بڑھ رہی ہیں۔ رشتے فراموش کئے جا رہے ہیں۔ زندگی نامعلوم سمت کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک ہی گھر آنگن میں ہر فرد اپنی خواہشات کے جنگل میں تن تنہا آوارہ گردی کر رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا ان حالات میں بھی مایوس نہیں بلکہ ان کی آنکھیں خیمہ ، خواب میں تعبیر کو تعبیر ہوتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا جب رشتوں کی شکست و ریخت اور کمزور پڑتی اخلاقی اقدار پر بات کرتے تو ان کے قلم سے اس طرح کے جملے نکلتے۔

"حقہ مجتمع کرتا ہے، مفاہمت اور محبت کو جنم دیتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اکلاپے کے کربناک احساس سے نجات دلاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نفرت کی دیواروں کو مسمار کرتا ہے۔ مثلاً جب حقے کی نے آپ کے قریب بیٹھے ہوئے کرم فرما کے سیاہ، متعفن اور موٹے ہونٹوں کو چھو کر آپ کی طرف لوٹتی ہے اور آپ اسے ڈیٹول سے دھوئے بغیر اس پر اپنے نازک ہونٹ ثبت کر دیتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس تابندہ لمحے میں اپنے جملہ قبائلی، نسلی، خاندانی اور جماعتی تعصبات ختم کر کے انسانی اخوت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھا دیا ہے۔" ("حقہ پینا" از دوسرا کنارہ)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں کسی نہ کسی احتجاج کا پہلو نمایاں ہے۔ اس لئے وہ سب زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں عصری آگہی ہے۔ حادثات زمانہ کی دھمک ہے۔ وہ اپنی دنیا میں گم رہنے والے ادیب نہیں بلکہ پوری انسانیت کے دکھوں، جھمیلوں میں شامل ہوتے۔ ان کے کرب کو اپناتے اور پھر اسے اپنے تجربے کا حصہ بناتے۔

"ضرب المثل کی ترکیب میں "ضرب" کا بولتا ہوا لفظ بجائے خود اس کی تشدد پسند ذہنیت کا غماز ہے۔ بے شک بظاہر ضرب المثل پھولوں سے لدی شاخ کی مانند ہے۔ لیکن پھولوں کو اتار لیجئے تو نیچے سے ایک بے رحم تنگی چھڑی برآمد ہو جاتی ہے۔ چھڑی جس کی مدد سے سماج کا گلے بان ہر بھٹکی ہوئی بھیڑ کو ہانک کر دوبارہ گلے میں شامل کر لیتا ہے۔ مجھے ضرب المثل سے چڑ ہے کہ یہ میری ذات، میری انفرادیت کی نفی کر کے، مجھے انبوہ کا ایک جزو بننے پر مجبور کرتی ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ میں ایک بھٹکی ہوئی بھیڑ تو کہلا سکتا ہوں لیکن گلے کی

اس مضمون کا بقیہ حصہ صفحہ 84 پر ملاحظہ کریں

ڈاکٹر وزیر آغا ایک حقیقت پسند تخلیق کار

سید مرتضیٰ حسن
جنرل سیکرٹری سرگودھا رائٹرز کلب

ڈاکٹر وزیر آغا ایسی عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا کا حکم میرے لیے ایک کڑے امتحان سے کم نہ تھا کیونکہ وزیر آغا کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وزیر آغا ایک ایسے زرخیز علمی وادبی عہد کا نام ہے جس میں بے شمار فنی فکری اور تخلیقی امکانات موجود ہیں بہرحال مجھ ایسے طفلِ مکتب کا وزیر آغا ایسی بے مثال ہستی پر کچھ لکھنا اس ابابیل کی مانند ہے جو آتش نمرود پر پانی کے چند قطرے ڈالنے کے لیے اُڑتا رہا تا کہ اس کا شمار بھی آگ بجھانے والوں میں کیا جائے۔ اس حوالے سے کچھ احساسات اور جذبات کا اظہار اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں۔

میں کافی عرصے سے اس بات پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ آخر یہ "فن تخلیق" کیا ہے؟ خاصی سوچ بچار کے بعد آخر میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ "فن تخلیق" قدرت کے عظیم اور مقدس رازوں میں سے ایک راز ہے اور قادر مطلق جسے چاہتا ہے اس راز سے آشنا کرتا ہے یہی وہ شناسائی ہے جسے پالینے کے بعد کوئی میر بنتا ہے، کوئی غالب، کوئی اقبال اور کوئی وزیر آغا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرا دل سے اس بات پر یقین ہے کہ یہ راز وزیر آغا کو بھی قدرت کی جانب سے بطور خاص عطا ہوا تھا۔ اس حوالے سے میں ایک شعر آغا جان کے لیے کہا تھا:

وہ لفظ لکھتا تھا پھر اُن میں روح پھونکتا تھا
یہ معجزہ بھی اس اک شخص کو عطا ہوا تھا

آغا جان نے جتنی اصناف ادب میں لکھا اُن کے موضوعات اور الفاظ کبھی بے جان اور بے رنگ نہیں ہوئے۔ ان میں ایک تازگی، شگفتگی اور خوبصورتی بہرصورت قائم رہی۔ ان کی تخلیقات کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ان کی اپنی تخلیق پر گرفت شروع سے آخر تک نہایت مضبوط رہی تھی۔ نظم ہو یا نثر کبھی کوئی موضوع کوئی تحریر کوئی جملہ یا مصرع ان کی گرفت سے باہر نہیں گیا۔ وہ ہر جمالیاتی کیفیت کو نہایت خوبصورت انداز میں اپنی تخلیق کی گرفت میں لانے کا فن جانتے تھے۔ انھوں نے زندگی، فطرت اور کائنات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ موضوعات پر بات کی ہے۔ کئی سوالات اٹھائے ہیں، کئی جوابات دیئے ہیں۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا حقیقت میں ایک صاحب اُسلوب ادیب تھے۔ ہمارے ہاں عام طور پر حقیقت نگاری، حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کو روایتی طور پر بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حقیقت نگاری یا حقیقت شناسی ایک اہم خوبی ہے۔ ہر بڑا تخلیق کار حقیقت شناس ہوتا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ بہت بڑا تخلیق کار حقیقت شناسی سے بھی کافی آگے امکانات کی دنیا کا مسافر ہوتا ہے۔ وہ حقیقت سے پیدا ہونے والی حقیقتوں، حالات سے پیدا ہونے والے حالات، حقیقت کے بعد آنے والی حقیقت اور حالات کے بعد آنے والے حالات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حقیقی دنیا کے ساتھ ساتھ امکانات کی دنیا کو بھی اپنی تخلیق کا حصہ بناتا ہے لیکن محدود ذہن کے مالک تنگ نظر لوگ اس تجربے کے لطف کو محسوس کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے یہ دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سمیت کسی بھی بڑے تخلیق کار کی اس کے عہد میں خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی اس حوالے سے کئی مثالیں ہماری علمی وادبی تاریخ میں موجود ہیں۔

یہاں یہ بات کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ کم فہم یا محدود مطالعہ رکھنے والے لوگ ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کے رومانوی رنگ سے آشنا نہیں ہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس خوبصورتی سے آغا جان نے رومانوی موضوعات پر شعر کہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور آغا جان کے لاتعداد اشعار اعلیٰ سطح کی رومانویت کی عمدہ مثال ہیں۔ لیکن جو لوگ سطحی اور کم درجے کی رومانویت کے عادی ہیں وہ ایسی خوبصورت کیفیات کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عجیب طرز تکلم تھا اس کی آنکھوں میں
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا

وہ ایک شخص کہ تاروں کی لو تھا جس کا بدن
کبھی کبھی وہ زمیں پر اترنے لگتا ہے

ضبط کرتا تھا مگر بات نکل جاتی تھی
اپنی آواز کی لرزش سے بہت تنگ تھا وہ

ڈاکٹر وزیر آغا ایک عظیم ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت محبت کرنے والے انسان تھے انہیں اپنے شہر اور اپنے شہر کے لوگوں سے بے پناہ محبت تھی۔ سرگودھا کو "دبستانِ سرگودھا" کا اعزاز آغا جان کی شخصیت کا مرہون منت ہے اس حوالے سے آغا جان سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ 2 مئی 2010ء کو آغا جان سے لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ رات کا وقت تھا مختلف علمی وادبی اور سائنسی (فزکس) زیر بحث آئے۔ آزاد نظم پر بھی بطور خاص گفتگو ہوئی۔ آغا جان کہنے لگے "اللہ کا شکر ہے کہ میں اب تک بالکل تندرست ہوں میرے حواس قائم ہیں اور اس عمر میں بھی اپنا تخلیقی وتنقیدی کام کر رہا ہوں"

ملاقات کے بعد جب رات کو ہم آغا جان سے رخصت لے کر ان کے کمرے سے باہر نکلنے لگے تو انھوں نے مجھے آواز دی "مرتضیٰ صاحب! ذرا بات سنیے" وہ خوشگوار آواز آج تک میری سماعتوں میں رس گھول رہی ہے۔ میں فوراً پیچھے کی طرف پلٹا آغا جان کے قریب گیا آغا جان نے "مرتضیٰ صاحب آپ سرگودھا کے تمام احباب کو میری طرف سے سلام دیجئے گا اور انھیں بتائیے گا کہ آج بھی یہاں رہ کر بھی میرے سانس میں سے انسٹھ منٹ سرگودھا میں گزرتے ہیں۔"

آہ! آغا جان کی وہ بات، وہ خوبصورت چہرا وہ بے مثال ملاقات مجھے آج بھی یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ آخر میں آغا جان کے چند اشعار پر اختتام کرتا ہوں۔

شجر پہ پھول تو آتے رہے بہت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا اس کا بے ثمر رہنا

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی
اک ستارہ دیر تک رویا کیا

تشنگی کی سبیل جاری تھی
ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے

آنسو، ستارے، اوس کے دانے سفید پھول
سب میرے غم گسار سر شام آئیں گے

رتجگا ہم بھی منائیں گے سنا ہے ہم نے
روز لکھتی ہے سحر، خون سے احوال اُس کے

❖OOO❖

شاعری

وزیر آغا کی نظمیں۔ پیڑ سے جنگل تک
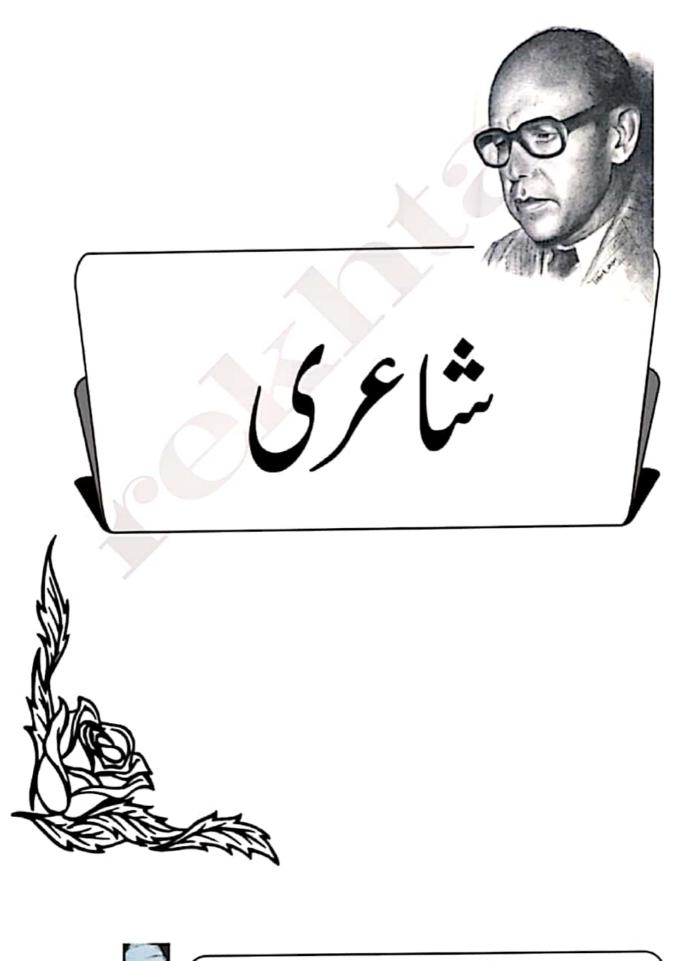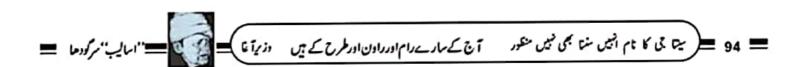
رفیق سندیلوی

وزیر آغا کی نظموں میں علامتوں کا ایک وسیع جہان آباد ہے۔انہوں نے محدودے چند علامتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے تخلیلی اور مرموزی وقوف کو بروئے کار لا کر اپنی نظموں میں گوناں گوں مرکزی و ذیلی علامتوں کی ایک کھیپ کو جمع کر دیا ہے۔مثلاً ایک نظر ان علامات پر ڈالیے،پیڑ،پتا،گھاس،لوہا،پھول،بادل جنگل،کھنڈ،شہر،ہوا،زمین،اندھیرا،زردی،دن،رات،شام،سمندر،پانی،دراتی،سایہ،سناٹا،آواز،ریل گاڑی،سورج،پرندہ،وغیرہ وزیر آغا کی علامات کثیر الابعاد ہونے کے باعث کسی ایک مفہوم پر منتج نہیں ہوتیں۔اکہری علامت اس صندوقچے کی طرح ہوتی ہے جس کے تالے اور ڈھکنے کو کھول کر ہم بہت جلد مطلوبہ سامان تک رسائی پا لیتے ہیں۔اس سارے عمل میں سحر کی نوعیت بس چابی کی کلک اور ڈھکنے کے اٹھانے تک ہی محدود ہوتی ہے۔لیکن کثیر الابعاد علامت جادوگر کے اس ڈبے سے مشابہ ہوتی ہے جس میں سے یکے بعد دیگرے رنگدار ڈبوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ اس عمل میں ناظر اور منظور کے درمیان تجسس،وقوف اور اسراریت کے متعدد رشتے بندھ جاتے ہیں۔وزیر آغا کی علامتوں میں معنی کی کثرت قاری کو ایسے ہی رشتوں سے آشنا کرتی ہے۔ایک بات غور طلب ہے کہ معنی کی کثرت میں معنی کا تعین نہیں ہو سکتا تو کیا مفرد معنوں تک جا کر رک جانے والی علامت نظم کے لیے زیادہ سودمند ہوتی ہے؟ جواب نفی میں ہے اس لیے کہ تعین یا حد بندی کا تقاضا علامت کو بے بس اور لاچار بنا کر رکھ دیتا ہے اور اس طرح ہم علامت کی نہائی دنیا میں دیر تک گرداں رہنے کی لذت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔دراصل یہ لذت ہی علامتی دنیا کے مطالعے کا ثمر ہے۔جس سے پہلوتہی کر کے وزیر آغا کی نظموں کی صحیح تفہیم ممکن نہیں مگر ان باتوں کا مطلب یہ نہیں کہ میں وزیر آغا کی علامتوں کے متعلق معنوں کو گرفت میں لانے پر اصرار کر رہا ہوں مطلق یا نہائی معنوں تک رسائی پانے کی تمنا ناممکنات میں سے ہے۔اس لیے نظم کی علامتوں کے نہائی معنوں کو تحیری قید میں لانے کی کاوش تو ادھوری ہی ٹھہرے گی۔لیکن ناقد علامت کے بھرپور معنوں یا ایک سے زائد معنوں کا سراغ تو ضرور لگا سکتا ہے۔

وزیر آغا نے زیادہ تر علامتیں قدرتی مظاہر سے منتخب کی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق مضافات سے ہے۔نیز کاشتکاری سے وابستہ ہونے کے ناطے ان کا ذہن زمین،زمینی اشثار،اور جنگلی،آبی،اور آلاتی مظاہر سے بہت گہرائی کے ساتھ منتھی ہے۔انہوں نے علامتوں کے وسیلے سے موجود میں بیٹھ کر بیک وقت زمین،آسمان،اپنے گرد کی جہات اور ان سے چمٹی ہوئی اشیاء کو دائرہ اعیان میں لانے کی سعی کی ہے۔جہات کے عقب میں بھی دیکھا ہے۔اور اپنے پاؤں کی ایڑی کو مرکز ہست مان کر اور اسی کے سہارے گھوم کر دائروی سطح پر بھی اپنے اطراف واکناف کا مشاہدہ کیا۔تاہم ان کی علامات کا رخ ہر حال میں زمین کی جانب ہی ملتفت رہا ہے اس گرداں،عقبی،مدور اور ورائی طریق پر دیکھنے کے لیے محض دوچار علامتوں کی معاونت ہی کافی نہیں ٹھہرتی بلکہ شاعر کو علامت کی کئی چھوٹی بڑی گلیوں سے پابرہنہ گزرنا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کے ہاں علامتوں کی تکثیر نمایاں ہے۔اور شاید اسی لیے قاری پہلی قرأت کے دوران علامتوں کی مرغولہ داری کے باعث ارتباک سا محسوس کرتا ہے۔مگر جوں جوں قرأت کے دور بڑھتے جاتے ہیں۔وہ علامتوں کی تطابق پذیری عدم تطابق پذیری اور ان کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ سے آشنا ہوتا جاتا ہے۔اور محسوساتی سطح پر یافت و نایافت کی متعدد منزلوں کو از خود طے کرتا رہتا ہے۔ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ وزیر آغا کے ہاں بہت سی جگہوں پر علامت تمثیل سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتی اور ہم جولی بن کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہے۔مجرد چیزوں کو مجسم فرض کر لینا اور پھر ان سے منسلک محسوسات و تلازمات کو علامتی پیرائے میں بیان کرنے کا رویہ ان کی نظمیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے

میں یہاں وزیر آغا کی متعدد علامتوں میں سے صرف "پیڑ" اور "جنگل" پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہتا ہوں،وزیر آغا نے چند ایک نظموں میں جنڈ،پھرواں،پھلاہی،ون،بڑ،نیم،اور پیپل جیسے پیڑوں کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔لیکن زیادہ تر ناموں کو صیغہ اخفاء میں رکھا ہے۔وہ اس لیے کہ تخصیصی نقوش کی بجائے عمومی نقوش ہی میں پیڑ کی علامت کا شناختی آہنگ قائم رکھا جا سکتا تھا۔پیڑ ایک ایسا ارضی مظہر جو اپنی نفسی اور تہذیبی اور دیو مالائی حیثیت کے باعث معروف ہے۔انسانی زندگی میں اس کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس کے تنے،پتوں،شاخوں،پھول،کلیوں اور پھنگوں پر انسانی وجود کے اعضاء اور جڑوں پر اصالت کا گمان ہوتا ہے۔پیڑ ایک نباتاتی روح ہے جس میں پلنے،بڑھنے اور تخلیق ثانی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔پیڑ کی شکست و ریخت کے آئینے میں فرد کی شکست و ریخت کا عکس ہی نظر آتا ہے وزیر آغا نے انسانی وجود کے مظہری شعور کی یافت کے لیے پیڑ کی علامت کو برتا ہے اور وجودی سطح پر فرد کے اندرونی موسموں کے تضادات و تغیرات کی کہانی کو بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے وجود یا ذات کی جذبی کیفیات کو پیڑ کی مختلف حالتوں میں ظاہر کیا ہے۔مثلاً دم بخود یا مبہوت حالت،بجھی ہوئی حالت،خاموش،گیلی اور ڈھلکی ہوئی حالت،سوکھی اور نحیف حالت،کبڑی حالت،اکڑی ہوئی اور آہنی حالت،دلگرفتہ اور کھوئی سی حالت،دل جلی اور کسمساتی حالت،لرزتی حالت،جامد حالت،آبدیدہ یا ڈبڈبائی حالت،روشن حالت،مردہ حالت،بریدہ حالت،بے برگ و بار حالت،زرد اور پژمردہ حالت،ناراض حالت،خوف زدہ حالت،سبز اور سایہ دار حالت،کالی حالت،زہریلی اور پراسرار حالت،ان حالتوں میں قنوط،سہم اور تشنج کا غلبہ نمایاں ہے۔اس کا اول سبب بیسویں صدی کا وہ معاشرتی ہیجان،کھلبلاہٹ اور برگشتگی ہے جس نے فرد کو اندر اور باہر سے جھنجھوڑ کر گلنے سڑنے کے لیے پھینک دیا ہے۔مگر ان حالتوں کے پس پردہ مابعد الطبعیاتی سطح پر بھی شاعر کی وجدانی ہیجانیت کی کارفرمائی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔وجود کی داخلی گہرائیوں تک اُترنے کے لیے ان حالتوں کا سراغ اور ادراک ضروری تھا سو شاعر نے بڑے رمزیاتی طریقے پر پیڑ کی علامتی وساطت سے خود کو قلبی کیفیات کے نوع بہ نوع سانچوں میں ڈھال کر اپنے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔ایک نظر ان مصرعوں پہ ڈالیے جو مختلف نظموں سے چنے گئے ہیں۔

دم بخود،ہیں پیڑ،چپ ہے کائنات
ڈھلک گئی ہیں خموش پیڑوں کی گیلی باہنیں
کبڑے پیڑ نے جان دے دی
اُون اُتری بھیڑ کی مانند پیڑ
دل گرفتہ پیڑ کے پتے گرے
کھمبا،منڈیر،شاخ،لرزتا ہوا شجر
دم بخود پیڑ جیسے سپاہی

پرانے گرانڈیل پیڑوں کے کٹنے کا منظر
درختوں کے اکڑے ہوئے خشک ڈھانچے
میں خشک ہوتے ہوئے شجر کا سفید پتہ
درخت چپ تھے کہ جس طرح پا بجولاں منظر

جھکی ڈال اک دل جلے پیڑ کی کسمسائی
تاروں نے دم سادھ لیا بت بن گئے سب اشجار

وزیر آغا نے جہاں پیڑ کے حوالے سے وجود کی آشوب زدہ، پرملال اور لطیف وارداتوں کو مس کیا ہے۔ وہاں انھوں نے اس کے عمق میں موجود سحری طاقتوں کو بھی خود پر منکشف کرنا چاہا ہے بطن مادر سے جنم لینے والے پراسرار عمل سے گزرنے یا نیند کے طویل دورانیے سے بیدار ہونے یا اندر کی آنکھ کھلنے کے بعد خود یافتگی اور ذات شناسی کا مقام ملاحظہ کیجیے جہاں شاعر نے خود کو سونے کے پیڑ کی شکل میں پایا ہے۔ یہاں فیمن ازم کے حوالے سے پیڑ کی مادارئی لپک کو سامنے رکھنا چاہیے۔

جب آنکھ کھلی میری
دیکھ کہ ہر اک جانب
زر تار سی کرنوں کا
اک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پر
میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں میری ہر سو
جھنکار تھی پتوں کی
اُڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی
اور مجھ میں سمائی تھی
"جب آنکھ کھلی میری"

مجید امجد کو بھی پیڑ سے بہت رغبت تھی اور وہ اس کے نامیاتی اوصاف کو افراد میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ مجید امجد کی طرح وزیر آغا کے ہاں پیڑ سے مرد اور عورت دنوں کے تصورات جنم لیتے ہیں۔ مثلاً "پرانی" بات میں انہوں نے خود کو پرندہ کہا ہے اور پیڑ کی نرم، لچکتی پھلوں بھری شاخوں کو محبوب کی آغوش کے مماثل قرار دیا ہے۔ اسی طرح "ماں" (پہلا روپ) میں ماں تا اور شیر خوار بچے کے باہمی تعلق کے حوالے سے پیڑ کے مادری کردار کو مانوس، گہری، خنک چھاؤں، شاخوں کی لوری اور پتوں کے پنکھے جیسی تمثالوں اور ترکیبوں سے واضح کیا ہے۔ پوری نظم ملاحظہ کیجیے۔

وہ برگد کا اک پیڑ تھی
جس کی مانوس، گہری، خنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بتائیں
وہ مخمل کا اک نرم چھتنار تھی
جس کے پتوں میں چھپ کر
مہکتی ہوئی دودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی راحت کا انعام پایا
وہ پتوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سلاتی رہی
مسکراتی رہی!
اور پھر ایک دن
اک بگولا اُٹھا
پیڑ جڑ سے اُکھڑ کر پرے جا پڑا!
اور چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے سارے پنچھی
بھیانک سی چیخوں کے کہرام میں اُڑ پڑے۔۔ آسمان کی طرف
پھر بکھرتے گئے چار سو!

"ماں" (پہلا روپ)

اس نظم میں شاعر کی احتیابی و مشاہداتی دروں بینی قابل غور ہے۔ برگد کی شاخ کو توڑا جائے تو ٹوٹی ہوئی جگہ سے سفید رنگ کا سیال مادہ رسنے لگتا ہے۔ جس کو عام طور پر برگد کا دودھ کہتے ہیں۔ پیڑ کے عرفانی پہلو کے حوالے سے اسے شیر معرفت بھی کہا جاتا ہے۔ برگد میں ماں کے کردار کی یہ شباہت لائق توجہ ہے۔ پھر برگد کے پتے عام درختوں کے پتوں سے جسامت میں بڑے ہوتے ہیں۔ جس سے شاعر نے پنکھے کا تصور اخذ کیا ہے۔ اسی طرح شاخوں کی لہلہاہٹ سے لوری اور مانوس، گہری، خنک چھاؤں سے گود کی طرف دھیان جاتا ہے۔ اس نظم میں یہاں ماں یا زمین کے شفیق پیکر کا ذکر کیا گیا ہے، "میں اور تو" میں پیڑ کے پدری روپ کی ترجمانی کی ہے۔ یہاں پگڈنڈی کی انفعالی اور پیڑ فاعلی حرکات کے ذریعے مرد اور عورت کے میانی ربط کو سمجھنے کی کاوش ملتی ہے۔ پگڈنڈی کا شرمیلا اور چھوئی موئی انداز اور پیڑ کا متین اور فوقی رویہ ہر دو کے مزاجوں کی نشان دہی کرتا ہے تاہم یہاں پدری روپ حاوی ہے۔

ندی کنارے باہیں کھولے اک البیلا پیڑ کھڑا ہے
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیران کھڑی ہے
جسم چرائے، آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے!

یہ بات طے ہے کہ پیڑ فضا میں نہیں اُگ سکتا، اُسے جڑوں کا سہارا درکار ہوتا ہے اور یہ سہارا زمین یا یا مٹی ہی فراہم کرتی ہے۔ ہر چند کہ ایک ہی جگہ پر مجبوس ہر کھڑے رہنے کا عمل جمود کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس میں بھٹکا ؤ یا گمشدگی کا امکان نہیں ہوتا۔ وزیر آغا کی نظم "بن باس" میں پیڑ زمین سے وابستگی کا علامتی مظہر بنا ہے۔ پیڑ کے حوالے سے نظم "پیپل" بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں پیپل کو تہذیب کے مرادی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تہذیب کے صوری خدوخال، اُس کی کھنکی، تار عنکبوت، سرسنت، اور روایاتی غم و پیچ پر غور و خوض بھی ملتا ہے۔ اور تہذیب کے پرسکون، متحرک اور متلاطم روؤں کو جاننے کا تجسس بھی، پیپل وہ پیڑ ہے جس کے نیچے شاکیہ منی نے ریاضت کی تھی۔ اور نروان پایا تھا۔ سو اس نظم میں فرد واحد کے طور پر تہذیب سے وابستہ روحانی، اضطراری اور گیان پانے کی آرزو کی طرف بھی اشارہ دیا گیا ہے۔ نظم کا آخری بند اپنے اندر احتجاجی تاثیر لیے ہوئے ہے۔

پیپل کیا ہے؟ جوگی کا ہے درسا اک استھان
جھونکے، بچے، پنچھی، انساں سب اس کے مہمان
کھاٹ پہ لیٹا سوچ رہا ہوں میں، مورکھ، نادان

پیڑ کے حوالے سے مزید دو نظموں کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ پہلی نظم "اک تنہا، بے برگ شجر" ہے جس میں وزیر آغا نے دکھ کو اپنے اندر کی کشت ویراں کا ایک تنہا اور بے برگ شجر قرار دیا ہے۔ اور دوسری نظم "یاترا" ہے جس میں دن کو شجر کا تمثیلی لباس پہنایا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ وزیر آغا کے شجر وجود کا اعلامیہ ہے۔ اس لیے یہاں ان کے پیش نظر وجود یا ذات ہی کی یاترا ہے جس کے نزولی اور صعودی پھیروں میں وقت کے بہاؤ کو محسوس کرنے کی حسرت پنہاں نظر آتی ہے۔ "یاترا" میں نہیں جانتا ہے" اور" جانتا ہے" کے ٹکڑے دو ایسے معنی خیز موڑ ہیں معلوم اور نامعلوم حقیقتوں کے درمیان انسلاک کی فضا بناتے ہیں:

یہ دن اک شجر ہے
جو چھلکے کے ملبوس سے اپنے ننگے بدن کو جدا کر کے
تاروں بھری کینچلی کو پرے پھینک کر
کالی، اندھی، زمیں کی کسی درز سے جھانکتا ہے!
"کہاں ہوں، یہ کیسا جہاں ہے، یہ لیلا رچائی ہے کس نے؟؟"
------ نہیں جانتا ہے!
ہوا ناچتی ہے، فلک پر جواں بادلوں کے ہنڈولے
بھری چھاگلیں، لاکھوں رنگوں کی پچکاریاں اپنے ہاتھوں میں لے کر
تعاقب میں آتے ہیں اُس کے تو کانپتا ہے!
معاً نرم برکھا کے پہلے ہی چھینٹے پہ کنگنا کر
ہزاروں معانی سے لبریز اک مسکراہٹ نگاہوں میں لا کر
حسیں شاخچوں، پتیوں، شوخ پھولوں میں ڈھلتا ہے
------ اور جانتا ہے!!
میں جب اس سے کہتا ہوں
تاروں بھری کینچلی، زرد چھلکے کے ٹھنڈے مکاں میں
تجھے شانتی مل سکے گی
تو وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہے
مجھے جیسے صدیوں سے پہچانتا ہے

اس نظم میں دن، شجر اور خود شاعر کی ذات ایک ہی شے کے تین رخ نظر آتے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی نظم "واپسی" میں پیڑ کے حوالے سے ایسی ہی تکنیکیں وضع کی ہیں۔ مثلاً پہلی تکنیک روشن پیڑ، دوپہر اور دو پریمیوں کی ملاقات سے اور تاریک پیڑ، شام اور دو پریمیوں کی جدائی سے مرتب ہوتی ہے۔ نظم کی ترکیب میں یہ تکنیکیں بنیادی اشارات کا کام دیتی ہیں۔ اور پیڑ کو مرکزے کے طور پر اجاگر کرتی ہیں کیونکہ اسی مرکزے کی

چھت تلے دو پیار کرنے والوں کی ملاقات ہوئی اور جدائی بھی، اور دوپہر کے کجلا کر شام میں منقلب ہونے کا لاہوتی وقوعہ بھی یہیں ظہور پذیر ہوا۔ وزیر آغا کی نظمیہ شاعری میں پیڑ ایک ایسے سائبان، آسمان یا دیوار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس کے تلے زندہ جذبوں سے معمور دو انسان باہم گر بیٹھے ہوں۔ اور ایک دوسرے کے چلتے ہوئے سانسوں کو سن رہے ہوں یا پھر پیڑ ایک ایسے پردہ سیمیں کی طرح نظر آتا ہے۔ جس پر من و تو کا کوئی ایسا کھیل کھیلا جا رہا ہو، جس کے منظروں کی ترتیب دہی میں قدرتی مظاہر کے ساز و سامان کو کام میں لایا گیا ہو اور جس کی کہانی میں انتظار کا مزہ بھی ہو اور مستی و مراقبہ کا لطف بھی، سرشاری بھی ہو، دردمندی بھی، اور اضطراری بھی، تخلیہ و تنہائی کا مس بھی ہو اور قرب کا احساس بھی، اداسی اور مایوسی بھی ہو اور اس دائرے سے نکلنے کی خواہش بھی، اس ضمن میں چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے!

درختوں کے نیچے
کوئی۔۔ زرد پتوں، پیلی کونپلوں
ادھ کھلی، خشک کلیوں کی چادر بچھائے
ترا منتظر ہے

''مسرت''

پیڑ کے سائے میں دو خاموش بُت
دو شگوفے، زیست کے سربستہ راز
دو دھڑکتے دل، فنا سے بے خبر
آنے والی تیرگی سے بے نیاز

''نوجوانی''

اک پیپل کے نیچے میں نے اپنی کھاٹ بچھائی
لیٹ گیا میں کھاٹ پہ لیکن نیند نہ مجھ کو آئی
آہیں بھرتے، کروٹیں لیتے، ساری عمر گنوائی

''پیپل''

برہنے درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتے
اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر
عجب بے بسی سے
خنک ریت کی میلی چادر پہ اوندھے پڑے ہیں

''مغفرت''

پیڑ کے نیچے ملائم سبز گھاس
گھاس پر ہم نیم وا آنکھوں کے ساتھ
دیر تک سنتے رہے بھنوروں کے گیت
دیر تک سونگھا کیے پھولوں کے باس

''واپسی''

پیڑ کے نیچے
تنہائی کی گھور گھپا میں میں تم بیٹھے تھے
تھکی تھکی پلکوں سے تمہاری
اوس کے موتی چھنتے تھے
پون رکی ـــــــ سب بکھر گئے!!

''ملاقات''

آج پھر اس سے ملاقات ہوئی
باغ کے مغربی گوشے میں جھکے نیم کے چھتنار تلے
اک بدرنگ سی چادر پہ وہ بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کے وہ سرشار ہوا
بھائی کیسے ہو! نظر تم کبھی آتے ہی نہیں
کچھ دیر میرے پاس تو بیٹھو، دیکھو!
کیسا چپ چاپ ہے یہ باغ کا گوشہ جیسے
کسی مواج سمندر میں جزیرہ کوئی
اور وہ سرمئی بادل کی فروزاں جھالر
جیسے، ہاں جیسے ـــ مگر خیر کوئی بات نہیں
آؤ تم پاس تو بیٹھو میرے!''

''آویزش''

میں پیڑ کے نیچے گھٹنوں پر
کیوں سر رکھے تا دیر رہوں
اور اس کی سندر چاپ سنوں
جو رات کو روتا چھوڑ گیا
اور خوشبو سے منہ موڑ گیا

''برف''

وزیر آغا کے شعری مجموعے ''نردبان'' تک تو پیڑ کی علامت بہت فعال رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ تحلیل ہو کر ''جنگل'' کے قالب میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ علامت ''جنگل'' کا آغاز 1958ء کی نظم ''جنگل'' سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں یہ علامت چلتے چلتے اپنے بطون میں ''پیڑ'' سے جڑی ہوئی دیگر علامتوں مثلاً ہوا، گھنڈ اور بادل کو جذب کر لیتی ہے۔ بہت سے دوسرے نظم گو شاعروں نے بھی ''جنگل'' کی علامت کو اپنی اپنی بساط کے مطابق برتا ہے۔ منیر نیازی ہی کو لیجیے، جنگل ان سے مکالمہ بھی کرتا ہے اور ان پر اپنے سربستہ راز بھی کھولتا ہے۔ ان کے ہاں جنگل کے ساتھ خوف کا تصور وابستہ ہے جو ڈائنوں، چڑیلوں اور سرخ لہو سے ابھرتا ہے جبکہ وزیر آغا کے ہاں سانپ کی شوکر، گہری کھنڈ، ہرن کی دلدوز چیخوں سے یا پھر خود جنگل کی ٹیڑھی میڑھی آنتوں جیسی ٹہنیوں سے۔ منیر نیازی کے ہاں جنگل کے سبز اور سیاہ رازوں کو الگ الگ آشکارا کرنے کی روش ملتی ہے جب کہ وزیر آغا جنگل کے سبز و سیاہ عقدوں کو ایک ہی وقت میں کھولنے کی جستجو میں مگن نظر آتے ہیں۔ تاہم انہوں نے جنگل کی ہیبت ناک سیاہی کو حواس کی سطحوں پر نسبتاً زیادہ مس کیا ہے۔ گنا جائے تو جنگل اور دوسرے حوالوں سے ''سیہ'' یا ''سیاہ'' کا لفظ ان کی شاعری میں بیسیوں بار آیا ہوگا۔ سیاہی، اندھیرا یا کالک کے حوالے سے جنگل سے پیوستہ اساطیری رمزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کا شوق انہیں ذہنِ انسانی کی لاشعوری اور تحت الشعوری تہوں تک لے گیا ہے۔ ان کے نزدیک جنگل اپنی تمام تر تخویف گپت حالت، اور ہیبت ناکی کے باوجود، بے ترتیبی، انتشار، لاقانونیت، بربریت اور جبر و تشدد کا علامتی نقشہ پیش نہیں کرتا۔ ''جنگل'' کی علامت پر مثبت انداز میں غور کیا جائے تو یہ ہمیں اصلاً تخلیقیت، حافظہ اور ماضیت کی علامت نظر آتی ہے۔ انسانی دماغ کا خلیاتی نظام ایک جنگل کا خاکہ ہی تو پیش کرتا ہے۔ مگر اس نظام کی اپنی ایک منطق اور اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ جس کی مدد سے وہ لانظمی میں نظم، انتشار میں ارتکاز اور کثرت میں وحدت پیدا کر لیتا ہے۔ ''ایک کتھا انوکھی'' کا مقتبس منظرنامہ گھنی گھنیری جھاڑیوں والا بہت پرانا جنگل ہے۔ جو تخلیقیت اور اس کے اسرار کے حوالے سے ذہنِ شاعر کی علامت ہی کا غماز ہے:

اک جنگل تھا
گھنی گھنیری جھاڑیوں والا
بہت پرانا جنگل
جس کے اندر
اک کٹیا میں
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
اپنی کھال کے اندر گم صم
جانے کب سے
کتنے جگوں سے
پھٹے پرانے چوغے پہنے
وہ اک خستہ بیج کی صورت
بے سدھ
بے آواز پڑا تھا

❖OOO❖

پنجابی شاعری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ

اخلاق عاطف
0302-3303463

اردو ادب کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کو ایسے نقاد کے طور پر نمایاں نام اور مقام حاصل ہے کہ جس نے اپنے پیش رو ناقدین کے برعکس مغربی ناقدین کی رائے کو من و عن تسلیم نہیں کیا۔ گذشتہ پانچ دہائیوں پر محیط اُن کی تنقیدی ادبی کاوشوں سے واضح ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نہ صرف تنقیدی موضوعات کو وسعت فکر عطا کی ہے بل کہ نئی تنقیدی تھیوریز کو متعارف کروا کے اردو ادب کو عالمی ادبی منظر نامے میں بہتر مقام دلوانے کی سعی خوب کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے گراں قدر ادبی خیالات پر مشتمل کئی ایک کتب ہماری جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی مختلف جامعات کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر اب تک ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے درجنوں مقالہ جات لکھوائے جا چکے ہیں۔

نقد و نظر سے ہٹ کر دیکھیں تو انشائیہ کے ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کی ترقی و فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اردو ادب میں آج انشائیہ کو جو قدر و منزلت حاصل ہے بلاشبہ ڈاکٹر وزیر آغا کی رہین منت ہے۔ نقاد اور انشائیہ نگار کے علاوہ تخلیقی اعتبار سے انھوں نے سفرنامے بھی لکھے، افسانہ پر بھی طبع آزمائی کی، حال ہی میں ان کی خود نوشت سوانح حیات کا دوسرا ایڈیشن "شام کی منڈیر سے" اشاعت پذیر ہوا ہے۔ چند برس قبل نوبل پرائز کمیٹی اور سویڈش رائٹرز فورم کی دعوت پر ڈاکٹر وزیر آغا نے سویڈن کا پندرہ روزہ دورہ کیا تھا جہاں آپ نے مختلف یونیورسٹیز کے سیمینارز میں جنوبی ایشیاء کے عمومی اور ادبی مسائل پر گفتگو کی، کئی ایک لیکچر دیئے اور اپنا کلام پیش کیا، اسی دوران سویڈش ٹی وی نے ڈاکٹر صاحب کے فن اور شخصیت کے حوالے سے ڈاکومنٹری فلم بھی ٹیلی کاسٹ کی۔ ۱۹۶۶ء سے ۲۰۰۶ء تک ادبی مجلہ "اوراق" ڈاکٹر وزیر آغا کی زیر ادارت اس شان کے ساتھ شائع ہوتا رہا کہ اس میں چھپنے والی ادبی تخلیقات کو صرف معیار کے اعتبار سے فوقیت دی جاتی تھی، نا کہ لکھنے والے کے نام اور شہرت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مدیر اوراق جناب وزیر آغا نے کم از کم دو نسلوں کی ادبی تربیت کر کے خود کو ادبی منظر نامے میں امر کر لیا ہے۔ اس سب کچھ کے علاوہ بحیثیت شاعر بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو ادب کو نئی نظم کے ذائقے سے آشنا کیا اور اردو غزل کو بھی ایک منفرد اسلوب عطا کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی متذکرہ گراں بہا ادبی خدمات کا اعتراف گزشتہ دہائیوں کے دوران درجنوں اہل نقد و نظر کی جانب سے بارہا کیا جاتا رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ تا حال بھی جاری ہے، مگر اس وقت ہمارے پیش نظر ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی شاعری ہے جو گزشتہ چند برسوں کے دوران مختلف ادبی جرائد کے علاوہ ان کے دو عدد مجموعہ "ونج تاریاں دا (اشاعت جنوری ۲۰۰۰ء)" اور "واجاں ہاجھ و چھوڑے (اشاعت جنوری ۲۰۰۳ء)" کی وساطت سے پنجابی پیاروں تک پہنچی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی شاعری کے حوالے سے پہلا بڑا سچ یہ ہے کہ پڑھنے والے اسے پڑھ کر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جس زرخیز دماغ نے اپنی عمر عزیز کے پچاس سے زیادہ سال، اردو نظم و نثر کے "اوراق" پر لفظ و معنی کی باکمال معنی آفرینی کے ساتھ حکومت کی ہے، جب پنجابی میں لکھنے کی جانب مائل ہوا تو ایسی نرول، نکھری اور ستھری ہوئی پنجابی شاعری تخلیق کی کہ جس کے ہر ہر مصرعے کو پنجابی لفظالی کے لشکیلے گہنے قرار دیا جا سکتا ہے۔ ماضی و حال کے کئی پنجابی لکھاریوں کے نام بطور مثال لیے جا سکتے ہیں کہ جنھوں نے پنجابی لکھتے ہوئے اردو لفظالی کا اس قدر سہارا لیا کہ ان کی لکھی ہوئی پنجابی محض تکلف دکھائی دیتی ہے، ان کے لکھے ہوئے مصرعوں میں چند لفظی ترمیم سے ان کی کاوشوں کو اردو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی شاعری پڑھتے ہوئے یہ احساس نمایاں طور پر اجاگر ہوتا ہے کہ کاریگر صراف اپنے فن میں یکتا اور اپنے فکر سے مخلص ہو تو اس کے لیے سونے، چاندی یا ہیروں کے تفریق بے معنی ہوتی ہے، زیور تراشنے کے لیے اسے جو بھی جنس مہیا کی جائے وہ اپنے فن سے پورا انصاف کرتے ہوئے ایسا زیور تراشتا ہے جس کی تراش خراش، بناوٹ اور چمک دمک، دیکھنے والوں سے اپنی صناعی کی داد از خود وصول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے پنجابی شعری مجموعوں پر اپنی آراء کے اظہاریے میں جناب شاہد شیدائی، ریاض احمد شاد، اور محمد جنید اکرم نے کئی ایک نظموں مثلاً گھوڑا، کنکاں، بیس سہاگا، دھند، پھل تے پتھر، ہواہ، دکھ تے سکھ، ماواں آکھن، اکھیاں، تاریاں مسدیاں جانا، ایسی باکمال نظموں کے حوالے دیئے ہیں۔ متذکرہ نظموں کو دہرانے یا ان کے بارے دی جانے والی آراء کی حروف چینی کرنے کے بجائے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم "تریل" کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، کتاب "واجاں ہاجھ وچھوڑے" کے صفحہ ۳۲۔۳۳ پر یہ نظم موجود ہے۔

بل ہاجھ ہوا کس کم دی
دیوے ہاجھ دوالی
رانجھن ہاجھوں بیلے بنجے
ہیر بناں ہریالی
نیر بناں ہے اکھ ہرنی دی
مٹک پیار توں خالی
بھاویں کنی سوہنی کالی
دگھی ویلے
تریل نے ڈٹھا
کتھا کتھا مکھڑا پھل دا
دیکھ کے مکھڑا روکی
روندیاں روندیاں تریل نہاتی
بول پئی اک واری
ساڈے ہاجھ توں کیوں اڑیا
نگی رات گزاری

متذکرہ نظم میں خالص پنجابی لفظالی کا حسن بھی موجود ہے اور پنجابی دیہی اور ثقافت کے منظر نامے میں ہمہ وقت موجود مثالوں کی چاشنی بھی نمایاں ہے جن سے واضح ہے کہ نظم کے خالق کے ذہن میں نظم کے جس خاکے نے جنم لیا، اسے بالکل ویسے ہی لفظوں میں ڈھال کر پیش کرنے کا آرزو مند رہا کہ لفظوں، معنی اور منظر نامے کے حسین امتزاج سے ایسی تخلیق قارئین کے سامنے پیش کی جا سکے جو از خود اس کی ہنر مندی کی تحسین وصول کرنے پر قادر ہو، مگر یہ باتیں یقیناً ایسی نہیں کہ جو صرف یہ مضمون لکھنے والے پر واضح ہوئی ہیں۔ البتہ اس نظم کا خاص توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی فکری جولانی نے یہ نظم مکمل کرتے ہوئے لفظوں اور مثالوں کے انتخاب میں خاص طور پر یہ اہتمام کیا کہ فطری مظاہر (تریل، بدل، ہوا، دگھی ویلا، مکھڑا، ہریالی) کے حوالے سے بھی پیش کیے، انسانی کاوشوں سے ترتیب پانے والوں (دیوا، دیوالی، بولنا، رونا، ہسنا) کا انتخاب بھی کیا ہے اور پنجاب کی رومانی تاریخ کے اوراق سے رانجھن، ہیر، بیلا اور نگی رات ایسے نادر استعارے نظم کی مالا میں پرونے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ یوں فطری مظاہر، انسانی کاوش اور پنجاب کی لوک رومانی روایتوں کے باہمی تذکرے سے بہت عمدہ نظم پڑھنے والوں کو

میسر آئی ہے۔ فکر کی تازہ کاری اور فن کی عمدگی کے ایسے نمونے ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی نظموں میں ہی نہیں غزلوں میں بھی جا بجا ملتے ہیں، اپنی اس رائے کی گواہی کے لیے ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

چن چڑھیا تے لوک دے واسی وَل وَل پڑھن دعاواں
شالا لیکھ ساڈے جاگن ، ہوون رد بلا واں
تیرے نال مثالوں والے راہواں تیریاں چانن
رات ہنیری لکھ نہ دے میں کس پاسے جاواں

ادھی راتیں کھڑ کھڑ سے ٹھنڈی ٹھار ہوا
نجریں ہکل مار کے رووے زارو زار ہوا
پھل اپنے چمن کھول کے آکھن آجا ساڈے کول
ڈالاں کھادی اڈدی جاوے مارو مار ہوا

پل پل اُترن کھوہ دے اندر، پل پل اُتے آون
اکھ نمانی کیویں جھلے ہنجواں والیاں ماہلاں

"واجاں یا جھو وچھوڑے" میں شامل وزیر آغا کی نو غزلوں میں سے منتخب کیے جانے والے محض پانچ شعر پڑھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے لاشعور میں پنجاب کی کم از کم پانچ صد سالہ تاریخ بھی گونجتی رہتی ہے کہ جس میں اکھاڑ پچھاڑ کے مناظر بھی ہیں اور مارو مار کے مناظر بھی، ماضی سے حال تک کے پنجاب اور پنجابیوں کی تاریخ آنسو بھری ان ماہلوں جیسی ہی تو ہے جن کے نصیب میں محض خوابوں کے کنوئیں میں اترنا اور چڑھنا ہی لکھا ہوا ہے، بھری ہوئی ماہل کا پانی اپنے بھائیوں اور دوستوں کی نذر کر دینا اور خود صبر شکر کر کے اپنی کھیتیوں کی سیرابی کے لیے ابر کرم کی مہربان بوندوں کا انتظار کرنا، اب صرف بارانی خطوں کا ہی نہیں ،شہری علاقوں کے باسیوں کا بھی مقدر بن چکا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا کے دونوں پنجابی مجموعوں کے ذریعے سے سامنے آنے والی شاعری، نظم اور غزل کے مختلف ہیئتی تقاضوں اور فکری رویوں کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ان اصناف کے محاسن میں اضافہ کی حامل کئی ایک خوبیوں سے آراستہ ہے۔ یہ شاعری خیال کی ندرت، فن کی عمدگی اور اظہار کی تازہ کاری کی ایسی خوبصورت لفظی تصاویر کا مرقع ہے جو ضیافت طبع کرتے ہوئے قارئین سے اپنے لیے بار بار داد طلب کرتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایسی نابغہ شخصیت، پنجابی شاعری کی جانب اس وقت راغب ہوئی جب ان کی حیات مستعار اپنے آخری دہاکے کا ابتدائی موڑ کاٹ رہی تھی۔ پنجابی شاعری کے پرستاران کی مزید پنجابی شاعری کے منتظر ہی تھے کہ ستمبر ۲۰۱۰ء ماہ و لیکن دنوں میں آغا صاحب اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ مجموعی ادبی کارکردگی کے حوالے سے آغا صاحب کے انتقال کو ایک عہد کے خاتمے کے طور پر دیکھا گیا، لیکن پنجابی ادب کی فضا بھی سوگوار ہو گئی کہ اسے بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے زریں خیالات سے بہت کچھ ہیرے جواہر حاصل کرنا تھے۔

☆☆☆☆

وزیر آغا دی پنجابی شاعری

غزل

چن چڑھیا تے لوک دے واسی وَل وَل پڑھن دُعاواں
شالا لیکھ اساڈے جاگن ، ہوون رد بلاواں

ہڑل آون ، جھڑیاں لگن ، ہریاں ہوون باراں
اپنی رت تل اس دھرتی تے لکھاں تیرا ناواں

سب میتوں "دُکھ" آکھدے سَن پر جیویں ویلا آیا
لوکی "سالاں" کہہ کے لے گئے میریاں ٹھنڈیاں چھاواں

تیرے نال مشالاں والے ، راہواں تیریاں چانن
رات ہنیری ، لکھ نہ دے ، میں کس پاس جاواں

بھانویں کرنا تسیں دوڑیں ، میتھوں تو مکھ موڑیں
پچھے پچھے ٹریا آساں ، دتا ساتھ بے ساہواں

روڑا لگا ، کال پیا تے پٹو گئے سب مارے
دوندے ہلد تمیاں والے ، سوہنیاں بھریاں گاواں

اپنے کول میں کجھ رکھاں ، میرا سبھ کجھ تیرا
ہنکاں نال تبرک ونڈاں ، تینوں روز بلاواں

پھل تے پتھر

پتھر کدے نہ ہسدا اُڈھا
تاں ڈھا کر لاؤندا
جدوں ڈھا
ظلے اندر چپ نوں جھمیاں پاؤندا

پتھر عمریں سبھ توں وڈا
کس کم آئیاں عمراں
پُھل دے ساہ نیں سبھ توں تھوڑے
تاں وی پُھل دی خوشبو کھلرے
بکھرن پُھل دیاں خبراں

پتھر رستہ روک کے آکھے:
میں نہیں لنگھن دینا
پُھل آکھے:
تسیں جم جم لنگھو،
اساں اپنا آپ لٹا دا
اساں پیریں چنیدیاں جانا!

غزل

بھریاں ہڑھاں جھاکن ویلے نہ ویکھاں نہ بھالاں
میں بھانبڑ وچ بلدا جاواں ، لوکی آکھن : بلے
توں ہیں ڈھیر نصیباں والی ، گل میری نہ منّیں
پل پل اُترن کھوہ دے اندر ، پل پل اُتے آون
توں پرواز دے بنے واگوں ہر پاسے اُڈ جاویں
میتوں کھاون دوڑے آون کیڑے ، ککاں تے کھمیاں

تر ، تر وٹ تے دب دے اندر اپنا آپ ونجالاں
پُھلاں ورگا ہاسا چھڑکن ، میں کیہ جاناں چالاں
میرے لیکھ ...... ہواواں اگے بیٹھ کے دیوا بالاں
اکھ نمانی کیویں جھلے ہنجواں والیاں ماہلاں
میریاں مُشکاں کس چھڈیاں نیں تیرے دُکھ دیاں جالاں
اپنا ماس میں کھوں پاواں ، کھوں کھوں ٹالاں!

وزیر آغا کی پنجابی شاعری

سکندر حیات میکن
لیکچرر گورنمنٹ کالج شاہ پور صدر
0346-8604086

شعر کیا ہے؟ عربوں کے مطابق شعر حکمت کا آئینہ دار اور سحر کار ہوتا ہے۔ شعر کی سحر کاری تو اس کی تاثیر کے باعث ہے مگر اس کی علو شان اس کی حکمت و دانش کے سبب سے ہے جو اپنی مٹی کی بو باس لیے ہوئے ہو اور اپنی تہذیب و سماج کا رچاؤ جس سے چھلکا پڑتا ہو۔ وہ شاعری بڑی پر تاثیر اور حکمت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کیونکہ تہذیب و سماج صدیوں کے تجربات، روایات اور دانش اجتماعیہ کے امین ہوتے ہیں۔ جب کوئی صاحب بصیرت او ر صاحب فن ان روایات اور مروجات کو اسلوب خاص سے بیان کرتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ وجود میں آتا ہے۔

پنجابی شاعری میں میاں محمد بخش، وارث شاہ، بلھے شاہ، حضرت سلطان باہو، بابا فرید، شاہ حسین اور ہاشم شاہ وغیرہ اس کی روشن و درخشندہ مثالیں ہیں۔ دور جدید میں شریف کنجاہی، احمد راہی، فقیر محمد، اسلم کولسری، منیر نیازی، اور انور مسعود اپنی تہذیب کے ترجمان اور اپنی زبان کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں اگر ہم وزیر آغا کی پنجابی شاعری کا مطالعہ کریں تو پہلا و لیکن و آخری احساس جاگزیں رہتا ہے کہ اپنی زمین سے جڑا ہوا بلکہ پیوست اور اپنی تہذیب کا پارکھ اور عاشق شاعر کس طرح حکمت و بصیرت کے موتی لٹاتا ہے اور تاثیر کے جادو جگاتا چلا جاتا ہے۔

وزیر آغا کی پنجابی شاعری کا پہلا مجموعہ ''چنج تاریاں دا'' پہلی دفعہ یکم جنوری ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا، اس کی اشاعت بزم فقیر لاہور سے ہوئی۔ یہ مجموعہ ۶۴ صفحات پر مشتمل تھا جس میں ۸ غزلیں اور ۱۶ نظمیں شامل تھیں۔ گویا اس چنج میں تاروں کی تعداد ۲۴ تھی لیکن اس مجموعے کے ساتھ ستم یہ ہوا کہ اس میں کتابت کی بہت ساری غلطیاں رہ گئیں، اعراب کے حوالے سے بعض لفظوں کے مفہوم ہی بدل گئے لیکن اس میں دوش وزیر آغا کا نہیں بلکہ اس پروف خواں کا ہے جس نے اس کی پروف خوانی کی تھی۔ اسی مجموعے کو ۲۰۰۳ء میں ترتیب نو کے ساتھ شائع کیا گیا حتیٰ کہ اس کا نام بھی ''واجاں ہاجھ وچھوڑے'' رکھا۔

وزیر آغا کی پنجابی شاعری میں کوئل کوکتی ہے۔ پرندے چہچہاتے ہیں اور کھیت لہلہاتے ہیں گویا فطرت کے رنگوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ وزیر آغا نے راقم کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اگر میں ان پرندوں، شام کے ڈھلتے سورج، لہلہاتے کھیتوں اور بہتی ندیوں کو نہ دیکھوں تو شاید میں زندہ نہ رہوں فطرت کے ساتھ یہ عقیدت ان کی ساری شاعری میں نمایاں ہے۔

ادب کی ہر صنف سخن میں دیہات اور گاؤں کو ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ وزیر آغا نے اپنی پنجابی غزلیات میں کسی ایک گاؤں کی نہیں بلکہ پورے پنجاب کی دیہاتی زندگی کا عکس سفحۂ قرطاس پر نقش کر دیا ہے اور یوں قاری کے دماغ میں ایک تخیلاتی گاؤں کا نقشہ ابھرنے لگتا ہے اور اس مٹی سے عقیدت سی ہونے لگتی ہے جہاں پیار اور رشتے بھینس کے دودھ کی طرح خالص ہوتے ہیں۔

ہاکاں مارادا اون چڑیاں چنڈ دیاں بڈھیاں مائیاں
کڑیاں، منڈے ہاکاں سن کے ہس ہس مردے جاون

مندرجہ بالا شعر میں کلچر او ر تہذیب کی تبدیلی دکھائی گئی ہے یہ اس نوجوان نسل پر ایک شدید طنز ہے جو اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے۔ وزیر آغا نے اپنی اردو غزلیات کی طرح پنجابی غزلیات میں بھی ایک امید کی کرن دکھائی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو زندگی کا مقصد کھو چکے ہیں ان کو وزیر آغا نے ہریالی اور نمو کا خواب دکھایا ہے کہ جب بارش برسے گی تو مصائب و آلام کو ساتھ بہا کر لے جائے گی اور ان لوگوں کے دل کی کھیتی میں ایسی ایسی فصلیں اگا دے گی جس سے ان کی بلائیں دور ہو جائیں گی اور خوشحالی ان کا راہ دیکھے گی۔

جن چڑھیا تے لوک دے واسی وَل وَل پڑھن دعاواں
شالا لیکھ ساڈے جاگن، ہوون رد بلاواں
بدل آ دن جھڑیاں لگن ہریاں ہوون باراں
اپنی رت نال اس دھرتی نے لکھاں تیرا ناواں

وزیر آغا نے اپنی پنجابی غزلیات میں منافقانہ رویوں کی بھی خوب صورت عکاسی کی ہے اور چڑھتے سورج کے پجاریوں کو ملعون قرار دیا ہے گویا قاری کو خبردار کیا ہے کہ اس معاشرے میں لوگ مطلب پرستی کی چادر تان کر بھی چلتے ہیں جن کے ہاں دوستی کے پاکیزہ رشتے بھی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنجر پھکن، یاریاں گنڈھن آ گئے ساڈے یار
جد فصلیں پکے جد ہاڑھ دا لنگا ہو گئے یار ہوا

مستقل مزاجی کا پہلو بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہے اور آغا صاحب کسی ایک کا ہو کر رہنے اور اس پر مرمٹنے کے نظریے کے قائل ہیں۔ اغراض کی خاطر ہمدردیاں تبدیل کرنے والے لوگ زندگی کی دوڑ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ پھول ہمیشہ انہی لوگوں کی جھولی میں گرتے ہیں جن میں قربانی دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔

بھاویں کنا نسیں دوڑیں، پیٹھوں توں نکھ موڑیں
پچھے پچھے ٹریاں آساں، دتا ساتھ بے ساہواں

ان کی پنجابی غزلوں کا اسلوب خالص ہے اور اس میں بہتے ہوئے جھرنے کی طرح ایک روانی ہے۔ وزیر آغا نے چھوٹی چھوٹی بحروں کے ذریعے بھی ایک سُر اور ایک لے کا انداز اپنایا ہے اور لفظوں کو ایک کڑی سے دوسری کڑی کے ساتھ ملانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

چھم چھم وسن نکروں پھل
تیز ہواواں وگدیاں جان
کچے دھاگے رہن سدا
پکیاں ڈوراں ٹٹدیاں جان

وزیر آغا کی پنجابی غزلوں میں پنجاب کے لوگوں کے دکھ بھی شامل ہیں جن کو وزیر آغا نے نمایاں کیا ہے اور یوں ان کا تدارک بھی کیا ہے۔

چندرے ٹلے بوہے کھلے گھر گھر ہوئے دیپے
ویہڑیاں اندر ہاسے جاگے کھلیاں چین ہزاراں

الغرض وزیر آغا کی یہ چند ایک غزلیں جن میں معیار کو پیمانہ بنایا گیا ہے۔ اور نئے نئے موضوعات پر قلم کشائی کی ہے جو وزیر آغا کی ژرف نگاہی اور کامل بصیرت کا عملی نمونہ ہے۔ ان غزلوں میں پختہ اسلوب، اچھوتے الفاظ، نادر تراکیب، کے ساتھ ساتھ اپنی اردو غزل کی طرح علامت نگاری اور تشبیہات و استعارات کو بھی نظر انداز نہیں کیا یہی چیزیں ان کی غزل کو غزل بنانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں جو پنجابی ادب میں قیمتی سرمائے کی سی حیثیت رکھتی ہیں

پل پل اترن کھوہ دے اندر پل پل اتے آ دن
اکھ نمانی کیویں بھلے، ہنجواں والیاں ماہلاں

اب ہم وزیر آغا کی پنجابی نظموں کا جائزہ لیں گے۔ جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ وزیر آغا کے پہلے مجموعے ''چنج تاریاں دا'' میں کل ۱۶ نظمیں شامل تھیں جبکہ از سر نو مجموعے ''واجاں ہاجھ وچھوڑے'' میں مزید بارہ نظمیں مل کر گئی

ہیں گویا یہ مجموعہ کل ۲۸ نظموں پر مشتمل ہے۔

"واجاں باجھ وچھوڑے" کے خوبصورت دیباچہ میں پروفیسر ریاض احمد شاد نے لکھا ہے کہ ان کی پنجابی شاعری سے ایک نیا وزیر آغا ہمارے سامنے آتا ہے لیکن اس نئے پن میں کچے جذبات اور ٹھونسے ہوئے خیالات نہیں ملتے ہیں۔

وزیر آغا کی پنجابی نظموں کو پڑھ کر قاری کی آنکھ نم ہونے لگتی ہے مگر ساتھ ہی وزیر آغا ایک ایسے نقطے کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں جو قاری میں ایک حوصلہ اور جوش پروان چڑھاتا ہے اور یوں قاری کی آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو، آنکھ ہی کے اندر جم جاتا ہے جو ایک تارے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو اس کے باطن کو روشن کر دیتا ہے بلکہ اس کے اندر شعور و آگہی کے کئی در وا کر دیتا ہے۔ خود وزیر آغا کی آنکھوں سے بھی کبھی آنسو ٹپکنے لگتا ہے مگر وہ اس کو پی جاتے ہیں ان کی ایک نظم "اج نمیں کرنا" میں یوں فرماتے ہیں۔

اج نمیں کرنا
ہنجواں نوں بے چھٹ دتی
اوہ روڑھ کے سب کچھ لے جاون گے
اج نمیں کرنا

جب قاری ان آنسوؤں کو پی جاتا ہے تو اس کے اندر ایک خوشبو جنم لیتی ہے جو اس کی ذات کو معطر کر دیتی ہے۔

ان کی نظموں میں ایک مکالماتی انداز پایا جاتا ہے جو ان کی فنی بالیدگی کا نتیجہ ہے۔ جب نظموں میں مکالمہ پیش کرتے ہیں تو قاری اس مکالمے میں کھو جاتا ہے بلکہ یوں محسوس کرتا ہے کہ مکالمہ بالکل آمنے سامنے ہو رہا ہے۔ ان کی ایک نظم "دکھ تے سکھ" میں یہی کیفیت ہے۔ ایک نظم "پھل تے پتھر" سے مثال ملاحظہ ہو:

پتھر رستہ روک کے آکھے
میں نمیں لنگھن دینا
پھل آکھے
تسیں جم جم لنگھو
اساں اپنا آپ لٹا دینا
اساں پیریں پیڑیاں جانا

وزیر آغا کی پنجابی نظموں میں بھی علامت نگاری کا عنصر غالب ہے لیکن ان نظموں کا خاصہ یہ ہے کہ بہت عام فہم لفظیات استعمال کی گئی ہے مگر جتنا لفظ عام ہے اس کا مفہوم اتنا ہی خاص ہے۔ انھوں نے ایسی گہری معنویت اجاگر کی ہے جو دل کو لگتی ہے لیکن ہر نظم میں ایک نقطہ بھی بیان کر دیتے ہیں جن کی بدولت قاری ان گہرے مفاہیم تک رسائی حاصل کر لیتا ہے کہا جاتا ہے کہ علامت کا گر میں معنویت کا ایک ساگر پنہاں ہوتا ہے۔ وزیر آغا کی پنجابی نظموں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے مثال کے طور پر ان کی نظموں "گھوڑا"، "سیں سہاگا"، "ہنجو تاریاں دا" وغیرہ میں ایسی گہری باتیں نمایاں کی ہیں ج پر اگر غور کیا جائے تو ان کے کئی دریچے وا ہونے لگتے ہیں "سیں سہاگا" سے مثال ملاحظہ ہو۔

وٹاں ڈھیماں ٹوئے ٹبے
بھنے، توڑے، کرے برابر
اکو بھاٹ سہاگے دی
سارے کب تے سارے بھمبر
کڈھے رگڑے کرے برابر
اکو بھاٹ سہاگے دی۔

اگی پنجابی نظموں میں ایسی بادِ نسیم چلتی ہے جو قاری کے دل میں غنچے کھلا جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں جا بجا ایک پنجابی کا لفظ "تریل" استعمال ہوا ہے جو ایک صحرا میں بارش برسانے کا کام کرتی ہے اور یوں خوشی اور ہریالی کی لہر ہر طرف دوڑنے لگتی ہے اور دل کی بے آب وگیاہ وادی میں خوشیوں اور مسرتوں کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ ان کی نظم "اڈیک" سے چند سطور ملاحظہ ہوں:

ڈگی ویلے
تریل دے واگوں
پیاں بھاراوہ آوے
اکھاں میٹ کے
پھل دی بکی مٹھی
دے اندر لنگ جائے

اس کائنات میں نمو کا عمل ازل سے جاری ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کنواں چلتا ہے اور ایک دائرہ بناتا ہے۔ جہاں سے یہ دائرہ شروع ہوتا ہے وہیں پر ہی دائرہ ختم ہو جاتا ہے لیکن کنواں اس مدار میں چلتا جاتا ہے۔ کنویں کا یہی تحرک زندگی کی نمو کی علامت ہے۔ وزیر آغا کی پنجابی نظموں میں بھی نمو کا ایک عمل جاری نظر آتا ہے۔ وہ چیت کا مہینہ ہو یا فصلیں اگانے کا موسم، پنچھیوں کے گانے کی رتیں ہوں۔ وچھوڑے کا روگ ہو یا پوہ کی خنک راتیں، وزیر آغا ان میں طمانیت اور سرور کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں یہی ان کی فنکارانہ مہارت ہے۔ اپنی ایک نظم "جھنڈ دے چن تو چپ دا کھیڑا" میں یوں بیان کرتے ہیں:

دیکھ تیرے پنڈ جھکڑ آیا
لیوے پا کے ٹوئیں ٹکور
تیز اڈن تلیئر ڈگن
گاواں بولن، لکن چور

اسی طرح لکھتے ہیں:

لنگھے پیار وال نہ کوئی
جھنڈ ہنجواں دے لٹکا
تک بھجیاں اکھاں نال میتھوں
روگ وچھوڑے تاں مکا

حقیقت سے آنکھیں چرانے سے کبھی حقیقت ختم نہیں ہوتی۔ عقل مند انسان ہمیشہ حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور یہی ان کی دانش مندی کی دلیل ہوتی ہے وزیر آغا نے بھی جا بجا اپنی پنجابی نظموں میں زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لایا ہے بلکہ ان کو دل سے قبول بھی کیا ہے یہ حقیقتیں بالکل سچی ہیں جن سے آنکھیں چرانا بے وقوفی کی دلیل ہے وہ اپنی ایک نظم "مانجا" میں یوں لکھتے ہیں۔

ہرے کچور رکھاں دیاں پتراں
ڈگ ڈگ کھدیاں جاناں
ٹھنڈی وادا مانجا پھرنا
مانجے پھر دیاں جانا
وچ مقدراں جو کجھ لکھیا
اوڑک اوہ ہو جانا

وزیر آغا اپنی پنجابی نظموں میں ایسے فقرات کہہ گئے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ اپنے اس مجموعے "واجاں باجھ وچھوڑے" میں وزیر آغا ایک صدا بلند کرتے ہیں یہ صدا ان کے دل سے نکلتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دل سے نکلنے والی آواز میں ایک جادوئی کیفیت ضرور پنہاں ہوتی ہے۔ وزیر آغا ایک پتن پر کھڑے ہو کر دوسرے پتن کی طرف آواز لگاتے ہیں اور اس آواز پر کوئی لبیک بھی کہتا ہے اور پھر وزیر آغا یہ سفر کچے گھڑے پر طے کرتے ہیں اور پتن کی دوسری جانب پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی شاہکار نظم "واجاں باجھ وچھوڑے" ملاحظہ ہو:

واجاں آوندیاں رہنا
واجاں آوندیاں رہنا
واج پئی
اساں کن پڑوائے
واج پئی
اساں کچے گھڑے تے ترڑ دے آئے
واجاں باجھ وچھوڑے

بہر حال ہمارے سامنے وزیر آغا کا جو پنجابی روپ سامنے آیا ہے وہ نہایت ہی دلچسپ اور لائق تحسین ہے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے معاشرتی زندگی کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اپنی زبان و بیان کے الگ الگ پیمانے میں خود کو ڈھالا ہے۔ ان کی پنجابی شاعری میں بھی تشبیہات و استعارات اور علامت نگاری کی ایک وسیع دنیا نظر آتی ہے۔ جو مختلف رنگوں سے مزین ہے جس میں کوئل بھی کوکتی ہے، چڑیاں بھی چہکتی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر قاری کے دل میں ایک خفیف سی ہلچل پیدا ہوتی ہے جو وہ تا دیر محسوس کرتا رہتا ہے۔

تو بھاہیاں تو رہویں سلامت، تینوں کاہدیاں خبراں
کیویں ساڈیاں راتاں لنگھیاں، کیویں لنگھیاں فجراں

☆☆☆☆☆

وزیر آغا کی نظم نگاری "چٹکی بھر روشنی" کے حوالے سے

ذوالفقار احسن

کہا جاتا ہے کہ ساٹھ اور ستر برس کی عمر میں آ کر اکثر شعراء وہی کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں جو انہوں نے تقریباً 30 اور 45 برس کی عمر میں کہا ہوتا ہے یا پھر ان میں کہنے کی صلاحیت میں کمی اور جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ بات بہت سے شعراء کے حوالے سے درست بھی ہے ۔ مگر وزیر آغا نے جدید اردو نظم کے حوالے سے جو کام ساٹھ اور ستر برس کی عمر میں کیا ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے پہلے والی دلیل کو غلط ماننا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ وزیر آغا نے اپنے اندر تخلیقی قوت کو مرنے نہیں دیا بلکہ ان کے ہاں کہنے کی صلاحیتوں میں مزید استقامت آ گئی ہے۔ تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا ہمیں ہر سال ایک یا دو نظموں کے مجموعے دے رہے ہیں۔ چند روز قبل ان کی نظموں کا نیا مجموعہ "چٹکی بھر روشنی" کے نام سے کاغذی پیرہن نے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں کی دیگر کتب کی نسبت نیا مجموعہ قدرے آسان بھی ہے کیونکہ وزیر آغا کی نظموں کو سمجھنے کے لیے اُن کی نظموں کے اندر اُترنا پڑتا ہے۔ ان کی نظموں کا ظاہری مفہوم اور ہوتا ہے کہ جب کہ پس پردہ علامتوں، تشبیہات میں نظم کا باطنی مفہوم چھپا ہوتا ہے کہ اس لیے وزیر آغا کی نظم کو سمجھنے کے لیے نظموں کے اندر چھپی ہوئی Key کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جب تک Key آپ کے ہاتھ نہیں لگتی آپ وزیر آغا کی نظموں کی پراسراریت کو جان نہیں سکتے۔ ان کی نظموں کے دیار میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی نظموں کے باطنی مفہوم کو سمجھا جائے اور ان کی نظموں کے اندر چھپی ہوئی روشنی کو تلاش کیا جائے۔

چٹکی بھر روشنی کی نظمیں سادہ بھی ہیں اور آسان بھی........ "چٹکی بھر روشنی" کی اکثر نظموں میں رومانوی فضا بہت زیادہ ہے۔ نجمہ منصور نے چند سال قبل جب وزیر آغا کی رومانوی نظموں کا انتخاب "برکھا بھیگے خوابوں کی" کی صورت میں مرتب کیا تھا مجھے اس مجموعہ کے نسبت "چٹکی بھر روشنی" کی نظموں میں زیادہ رومانیت نظر آتی ہے۔ شاید اس کی وجہ وہ کرب اور وہ دکھ ہے جو پچپن سال کی رفاقت کا ایک لمحہ میں چھوٹ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کی اہلیہ صفیہ آغا جو ایک طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کی موت کا غم انہوں نے اپنے اوپر سوار نہیں کیا تھا بلکہ اسے اپنے اندر جذب کر لیا تھا، اور پھر وہ کرب دھیرے دھیرے لاشعوری طور پر ان کی نظموں میں در آتا رہا۔

اس مجموعہ کی اکثر و بیشتر نظموں میں اُسی کرب کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ ایک نظم "ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں" کی ابتدائی چند لائنیں ملاحظہ ہوں:

"اب تو یوں لگتا ہے جیسے\
موسم سارے وقت پہ آنا\
وقت پہ جانا بھول چکے ہیں" (ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں)

نظم "امانت" کی چند لائنوں میں وہ کرب کھل کر سامنے آتا ہے۔

"مسکرا کر گھر کی چابی\
تو نے واپس کی مجھے\
لو سنبھالو یہ امانت\
ہم چلے..................." (امانت)

وزیر آغا کی ایک اور نظم "مرے قلم میں روانی" میں صفیہ آغا کی یاد اور اُن کے قلم میں جو روانی تھی اُس کا محور و مرکز بھی انہوں نے اپنی شریک حیات کو گردانا ہے حتیٰ کہ وہ کہتے ہیں کہ کہکشاں اگر فروزاں تھی تو فقط اُس کے دم سے، ستارہ صبح کا خوش تھا کہ اس کو تم نے اپنی پلکوں پر کمال نرمی سے سنبھال رکھا تھا، یہ زیورات، یہ گھر، یہ اَبر پارے، ستارے، الماس کے پھول اگر خوش رنگ دلفریب تھے تو اُن میں اُن کا کوئی کمال نہ تھا اُن کو تم نے اتنی دلفریبی عطا کر دی تھی کہ یہ خوبصورت لگتے تھے۔ چند لائنیں ملاحظہ ہوں:

یہ کہکشاں تھی فروزاں کہ تو نے رات گئے\
نظر اٹھا کے اسے ایک بار دیکھا تھا\
ستارہ صبح کا خوش تھا کہ تیری پلکوں نے\
اسے سنبھال لیا تھا کمال نرمی سے\
وگرنہ خاک پہ گرتا تو خاک ہو جاتا\
مرے قلم میں روانی ترے ہی دم سے تھی\
جو تو نہیں ہے تو اب یہ قلم بھی بے بس ہے

وزیر آغا کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ عالمی تناظر پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ سونامی کے سیلاب زدگان پر بھی ایک نظم "لرزتی گونج نیلے پانیوں کی" قابل ذکر ہے وہ کہتے ہیں:

لرزتی گونج نیلے پانیوں کی\
ترے کانوں کے اندر آ بسی ہے\
ہزاروں ناریل کے پیڑ\
تجھ پر جھک گئے ہیں\
پرندے خوش نوا آبی پرندے\
ترے چاروں طرف اڑنے لگے ہیں\
سنہری ریت پر لیٹے بدن\
تیرا سواگت کرنے آئے ہیں\
وہ خوش ہیں\
تو سمندر بن گیا ہے\
مگر میں خوش نہیں ہوں\
مجھے معلوم ہے\
سارے سمندر ساحلوں کو روندتے ہیں\
کھلونوں اور سفینوں کو\
مکانوں اور مکینوں کو\
سدا برباد کرتے ہیں

اس نظم میں وہ پورا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور یہاں سمندر کو موت کی علامت کے طور پر لاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں موت کا سمبل بہت شدت کے ساتھ آیا ہے۔ کہیں موت سمندر کے روپ میں، کہیں دھند، کہیں صدا، کہیں سناٹا، کہیں ملبہ اور کہیں روشنی کی صورت میں دکھائی دی ہے۔ کتاب کی پہلی "نظم" کے بارے میں محترمہ پروین طاہر کہتی ہیں:

"نظم کی تیسری جہت موت ہے۔ جو کہ زندگی اور تخلیق سے ہٹ کر ہے۔ اس ریفرنس میں دھند سے مراد وہ سرمئی دھند لگتے ہیں جو مرنے سے کچھ دیر پہلے انسان کو اپنے اطراف میں محسوس ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی ہے جو اعصابی تھکن کے آخری مراحل میں انسان کی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور اسی خاموشی میں انسان موت کی سرگوشی سن پاتا ہے اور موت کسی پیکر کی صورت اپنی بر قاب پوروں سے چھو کر انسان کو اپنے اٹل ہونے کا یقین دلاتی ہے۔"

بعض نظموں کے عنوان "پھٹے خیمے کے اندر" "لاشے" "پیاس" "سانحہ" "خاک" "ہم لاکھوں بھیگی پلکوں پر" اُسی یاسیت کا پتہ دیتے ہیں ان عنوانات پر غور کریں تو پہلے پانچ عنوانات ایسے ہیں جو واقعہ کربلا کی عطا ہیں "چٹکی بھر روشنی" میں شامل چالیس نظمیں قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری نظموں کی پُراسراریت میں دھیرے دھیرے اُترنے لگتا ہے۔ وزیر آغا کی نظموں کو جس زاویے سے بھی دیکھیں وہ ایک الگ مفہوم دیتی ہیں۔ "چٹکی بھر روشنی" کی نظمیں اُردو ادب میں یقیناً ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

مطالعات

Scanned by CamScanner

تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں

معجزۂ فن کی ایک مثال

پروفیسر سجاد نقوی

189R ایکسٹنشن گورنمنٹ پنجاب ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی

،کالج روڈ، ڈاک خانہ، ٹاؤن شپ، لاہور

''اوراق'' کا ۱۹۷۶ء کا دوسرا شمارہ شائع ہو تو آغا صاحب نے کہا''اب آپ مجھے تین ماہ کے لیے''اوراق'' سے چھٹی لے دیں۔ پنجاب یونیورسٹی نے اقبال صدی کے لیے مجھے علامہ اقبال پر کتاب لکھنے کو کہا ہے۔ میرے ذہن میں اس کا عنوان بھی آ گیا ہے اور اس کا فارمیٹ بھی...... آشوب آگہی کے عنوان سے جو کتاب میں نے شروع کر رکھی ہے، مجھے نظر آتا ہے، اب شاید آگے نہ چلے گی۔ کتاب کا عنوان ''تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں'' ہے۔ اس میں مجھے ''آشوب آگہی کا مطالعہ بھی کام آئے گا اور اس کے ساتھ اپنے والد محترم سے تصوف کے ساتھ جو لگاؤ ودیعت ہوا ہے، وہ بھی معاون ہوگا'' ۱

آغا صاحب نے یہ کتاب ٹھیک تین مہینوں میں مکمل کر لی۔ بقول ان کے اسے ۱۵/ اگست کو لکھنا شروع کیا اور ۱۵ نومبر کو مکمل کر لیا۔ اس عرصے میں مجھے نہیں معلوم کہ کب سورج نکلا اور کب غروب ہوا۔ کب میں سویا اور کب میں نے کھانا کھایا، بس ایک خواب کی سی کیفیت تھی، سوتے جاگتے کا سا عالم...... میں نے کہیں پڑھا ہے کہ''ایک بار کسی شخص نے نیاگرا فال کو تنی ہوئی رسی پر چل کر عبور کیا تھا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس شخص کے ارتکارز کا کیا عالم ہوگا کیونکہ توجہ کے رتی بھر ادھر اُدھر ہونے سے وہ دریا میں گر کر جاں بحق ہو سکتا تھا۔ یہی حال میرا تھا میں نے یہ عرصہ سولی پر گزارا ہے مگر آپ یقین کریں کہ جتنی کرب انگیز مسرت مجھے یہ کتاب لکھتے ہوئے ملی نہ پہلے کبھی ملی اور نہ شاید آئندہ ملے گی۔ ۲

''تصورات عشق وخرد۔ اقبال کی نظر میں'' اقبال اکیڈمی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔ اسی سال آغا صاحب نے ''اوراق'' کا جدید نظم نمبر'' شائع کیا۔ آغا صاحب نے مذکورہ کتاب کی تالیف میں علامہ کی فارسی اور اردو کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ جدید اردو نظم کے اصل بانی علامہ اقبال ہیں۔ اس بات کا اظہار ڈاکٹر وزیر آغا نے جولائی ۱۹۷۷ء ''اوراق'' کے''جدید نظم نمبر'' کے اداریے میں ان الفاظ میں کیا:

''اوراق'' کا زیر نظر شمارہ بیک وقت جدید نظم نمبر بھی ہے اور''اقبال نمبر'' بھی مراد یہ نہیں کہ اس نمبر کو اقبال اور جدید نظم میں مساوی تقسیم کر دیا گیا ہے بلکہ یہ کہ جدید اردو نظم کا خاص مزاج کی تشکیل وترتیب میں اقبال سے اثر قبول کرنے کا عمل اس قدر واضح اور روشن ہے کہ''جدید نظم نمبر'' کی پیش کش از خود''اقبال نمبر'' کی صورت اختیار کر گئی ہے۔'' ۳

اداریے میں آگے چل کر ڈاکٹر وزیر آغا نے واشگاف الفاظ میں علامہ اقبال کو جدید نظم کا پیش رو قرار دیا اور جدید نظم کے انتخاب میں ابتداء علامہ کی نظم''شاعر'' سے کی۔ ''اوراق'' کے اگلے شمارے میں ایک قاری کے اس دعوے پر اعتراض کے جواب میں وزیر آغا نے اپنے اداریے میں ان الفاظ میں وضاحت کی:

''ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ میراجی نے جدید نظم پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں لیکن بنیادی اور اساسی کام اقبال نے انجام دیا ہے۔ اقبال نے نہ صرف نظم کو فرد کے دل کی دھڑکن بنایا، نہ صرف اسے بیسویں صدی کے سائنسی اور علمی انکشافات کے حوالے سے جدیدیت کے لمس سے آشنا کیا بلکہ اسے زبان کی گھسی پٹی بندشوں سے آزاد کر کے تخلیقی سطح پر بھی فائز کر دیا۔ والواقعہ جدید نظم پر میراجی کے اثرات بلاواسطہ اور اقبال کے اثرات بالواسطہ تھے۔ ۵

مندرجہ ذیل اقتباسات سے میرا مقصد علامہ اقبال سے ڈاکٹر وزیر آغا کی انوالمنٹ (Involvement) واضح کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا جاؤں کہ یہ انوالمنٹ علامہ سے وزیر آغا کی اس وقت سے تھی جب انہیں مولانا صلاح الدین احمد سے''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر کی حیثیت سے ایک طویل عرصے تک رفاقت میسر آئی تھی اور مولانا تو علامہ اقبال کے عاشق تھے۔ مولانا ہی کے ایما پر ڈاکٹر وزیر آغا نے''ادبی دنیا'' کے جدید نظم گو شعرا پر'' ایک مثال کے عنوان سے مضامین لکھے اور ابتداء'' اقبال۔ فطرت پسندی کی ایک مثال'' سے کی۔ یہ مضامین''نظم جدید کی کروٹیں'' میں شائع ہوئے اور جدید نظم پر اب تک اسے حوالے کی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وزیر آغا کی علامہ اقبال کی شاعری سے محبت بڑھتی گئی۔ اس کے ساتھ وزیر آغا کے مشرق ومغرب کے قدیم وجدید علوم کے مطالعے میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ علامہ اقبال سے وزیر آغا کی محبت اور قربت میں علامہ کے خطبات نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ خطبات علامہ نے علی گڑھ اور مدارس کے سفر کے دوران مختلف مقامات پر دیئے اور انگریزی زبان میں تھے۔ وزیر آغا نے انہیں Reconsfraction of Religions thought in India میں پڑھا تو علامہ اقبال کے تبحر علم، اور مذہب کے بارے میں نئی سوچ سے بے حد متاثر ہوئے۔ تصوف سے آغا صاحب کو لگا تو اپنے والد و۔ م۔ خ سے ودیعت ہوا تھا علامہ اقبال کے خطبات اور علامہ کے پی ایچ ڈی کے مقالے''مابعد الطبیعات ایران'' نے ڈاکٹر وزیر آغا کو علامہ اقبال سے اس حد تک Involve کیا کہ ادھر سال اقبال کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی نے انہیں کتاب لکھنے کی دعوت دی، آغا صاحب نے اپنے رائٹنگ پیڈ سے اپنا قلم مس کیا تو صریر خامہ نوائے سروش بن گیا۔ اس لمحے کے بعد ان کا تعلق دنیا ومافیہا سے کٹ گیا اور وہ علامہ اقبال کی تازہ اور انوکھی بازیافت میں تین ماہ اس روحانی سفر میں مبتلا ہو گئے جس سے نتیجہ میں انہیں'' تصورات عشق وخرد۔ اقبال کی نظر میں'' ایسے گوہر نصیب ہوا جو''اقبالیات'' کے سلسلے میں لکھی گئی کتابوں میں فکر تازہ کی بدولت ہمیشہ ضوفشاں رہے گا۔ بالفاظ دیگر یہ کتاب ایک طرح سے اقبال کے فکری اور فنی حیثیت کی عصری تقاضوں کی روشنی میں از سر نو دریافت کا درجہ رکھتی ہے۔

''تصورات عشق وخرد۔ اقبال کی نظر میں'' جیسا میں نے اسے ڈاکٹر وزیر آغا کے روحانی سفر سے تعبیر کیا ہے، میں نے اس کے تین مراحل کی روشنی میں اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ اس روحانی سفر کے پہلے مرحلے میں آغا صاحب تصورات اقبال کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ میں مستقل طور پر علامہ کے انگریزی خطبات اور اردو اور فارسی کی شعری کلیات ہے تو بائیں ہاتھ میں عشق وخرد کے حوالے سے یونانی مفکرین سے لے کر اسلامی او رمغربی فلاسفروں کی کتابیں ہیں۔ زمانی اعتبار سے آغا صاحب ان کتابوں میں سے زمان ومکاں اور عشق وخرد کے نظریات سے بحث کرتے جاتے ہیں تو بیچ بیچ میں خطبات اور شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال کے منفرد فلسفہ اور فکر کی نشاندہی بھی کرتے جاتے ہیں۔ مقصود یہ کہ ماضی میں ایک طرف علامہ کے جن ناقدین نے فکر اقبال میں تضادات کا الزام لگایا یا فکر اقبال کو مغربی مفکرین کی خوشہ چینی کا نام دیا ہے، اس کا بطلان ہو جائے اور دوسری طرف جن لوگون نے علامہ اقبال کو وحدت

الوجودی مسلک کا صوفی قرار دیا ہے ان کی غلط فہمی بھی دور ہوتی جائے۔۔

سفر کے دوسرے مرحلے میں ڈاکٹر وزیر آغا، اقبال کے تصورات عشق وخرد کی وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ سفر کا پہلا مرحلہ اگر سفر کی تیاری کہا جائے تو یہ مرحلہ ایک متعین منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہاں بھی حسب سابق ڈاکٹر وزیر آغا کو علامہ اقبال کے خطبات اور ان کے اردو فارسی کلام سے رہنمائی ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک ''عقل اور عشق کا رشتہ ضدین کا رشتہ نہیں بلکہ ان کا یہ موقف ہے کہ عقل اور عشق عرفان کے روضۂ الکبریٰ تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔

وزیر آغا نے انہیں متبادل یا متوازی راستے قرار نہیں دیا۔ عقل کو انھوں نے پگ ڈنڈیوں سے تشبیہ دی ہے جو پورے خطے میں پھیلی ہوتی ہیں اور عشق کو اس شاہراہ کے مماثل قرار دیا ہے جس سے ہر ہر قدم پہ یہ پگڈنڈیاں شامل ہوتی چلی جاتی ہیں گویا پگڈنڈیوں کا وجود شاہراہ میں ضم ہونے کی حد تک ہے، اس لیے مسافر جب پگڈنڈی اختیار کرتا ہے تو شاہراہ کی طرف ہی بڑھتا ہے۔ اس سے آگے یہ شاہراہ کا کام ہے کہ وہ اسے عرفان کے روضۂ الکبریٰ تک لے جائے۔ علامہ اقبال نے پگڈنڈیوں پر سفر کو عقل کے پیدل چلنے کے عمل کے مشابہ کہا ہے اور شاہراہ کے سفر کے ساتھ عشق کے اسپ صبا رفتار کی خصوصیت مختص کر دی ہے۔ بہر حال عقل اور عشق کا امتزاج ہی ایک طرف علامہ اقبال کو مغربی فکر کے استقرائی طریق اور دوسری طرف اسلامی فکر کے امتزاجی انداز سے منسلک کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے خطبات کی روشنی میں خرد کے حوالے سے جہاں وزیر آغا نے علامہ کے فلسفۂ وقت کو برگساں کے نظریۂ زماں سے اگلا قدم قرار دیا ہے۔ وہاں انھوں نے زوال مغرب کے مصنف شپنگلر کی تعصب نگہی کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ شپنگلر نے عمداً مغربی کلچر میں سائنس اور فکر پر اسلامی کلچر کے واضح اثرات کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اشاعرہ کا کائنات میں جواہر کے وجود کا نظریہ، نظام کا ''تصور جست'' ریاضی میں طوسی کا مرائی مکان کے تصور کے برخلاف وقت کی کثیر المعیار حرکت کی طرف اشارہ، البیرونی کا کائنات کے ثابت ہونے کے بجائے تغیر پذیر ہونے کا تصور، خوارزمی کا عددی خالص ''قدر'' سے خالص ''نسبت'' میں منتقلی جس نے ریاضی سے الجبرا کی طرف سفر کیا، ابن مسکویہ کا نظریہ ارتقاء جب بھی ڈارون اور سپنسر کے نظریات کی بنیادیں بھی استوار نہیں ہوئی تھیں اور تاریخ کا حرکی تصور جو ابن خلدون کی عطا ہے، مغرب کے مآخذ کی چند مثالیں ہیں۔

خرد کے سلسلے میں اسلامی کلچر کی عطا کو مستحکم کرنے کے بعد وزیر آغا علامہ کی معیت میں عشق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عشق وہ بنیادی طاقت ہے جو کائنات اور کائنات میں بکھرے مظاہر کی شیرازہ بندی کرتی اور انہیں بامعنی بناتی ہے۔ آغا صاحب نے اسے (Motor force) کا نام دیا ہے۔

عشق کی تمثیل کے تین کردار ہیں۔ ایک عاشق، دوسرا معشوق اور تیسرا حسن، ان میں سے حسن اس شمع کی طرح ہے جس کی روشنی سدا ایک سی رہتی ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی جگہ روشن ہے جہاں ہوا کا گزر نہیں۔ عاشق کی حیثیت اس پروانے کی سی ہے جو شمع کو دیکھتے ہی اس پر نثار ہو جاتا ہے اور اپنے اس اقدام کو سبکساران ساحل کا نام نہاد دانشمندی سے مجروح نہیں کرتا۔۵ اور عشق بقول ڈاکٹر وزیر آغا دراصل وہ حرکی قوت ہے جس کے بغیر عاشق ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ پروانے کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا سوز دروں عشق ہی کی ایک صورت ہے۔ عشق سیدھی سڑک پر نہیں چل سکتا بلکہ مرکز آرزو کے گرد طواف کرتا ہے۔ (پروانہ بھی تو شمع کے گرد طواف ہی کرتا ہے) اس کی حیثیت اس آبی طوفان کی سی ہے جو کسی مرکزی نقطے کے گرد ایک طوفانی دائرے کی صورت گھومتا ہے۔ یہ مرکزی نقطہ طوفان کی آنکھ کہلاتا ہے اور عجیب بات ہے کہ اس ''آنکھ'' کے اندر مکمل سکون ہوتا ہے۔ تصوف کا عشق بھی حسن ازل کے گرد طواف کرتا ہے وہ خواہشات کے اژدھام سے ماورا ایک انوکھی شانتی اور اطمینان قلب کا گہوارہ ہوتا ہے، مگر اس حسن ازل کی جھلک پانا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے گرد ایک گول سا سلاخ دار جنگلہ ہے جس میں سے حسن کا جلوہ پوری طرح دکھائی نہیں دیتا البتہ اگر طواف کی رفتار تیز ہو جائے تو جنگلے کی سلاخیں غائب ہو جاتی ہیں اور جنگلے میں گھرا ہوا وہ مقام گرفت میں آ جاتا ہے جو حسن ازل کا مسکن ہے مگر رفتار شرط ہے''۶

ڈاکٹر وزیر آغا نے ''عشق کے تجربے میں تصوف میں عشق کے متفق علیہ چھ مدارج ۱۔ حسن، ۲۔ طواف ۳۔ ارتکاز، ۴۔ قربانی، ۵۔ جست، اور ۶۔ وصال کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ان مدارج میں ''حسن'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور حسن جہاں کہیں ہو، چاہے وہ اشیاء، پرندوں، سبزہ زاروں اور ندیوں ہی کا حسن کیوں نہ ہو بقول الغزالی'' دراصل حسن ازل ہی کا عطیہ ہے'' ۷ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ کی ابتدائی دور کی دو نظموں ''جگنو'' اور ''بچہ اور شمع'' کے اشعار اور کوشش ناتمام (بانگ درا) کا یہ شعر:

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے

اور ''ذوق وشوق'' (بال جبریل) کے درج ذیل اشعار دیئے ہیں۔

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں ۸

اس طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے عشق کے دیگر مدارج طواف، ارتکاز، قربانی، جست اور وصال کو بھی علامہ اقبال کے اردو اور فارسی اشعار سے مزین کیا ہے۔ ''ارتکاز'' کی وضاحت میں وزیر آغا نے ہندوستان کے ایک ویدانتی (جس کا دنیاوی منصب ایک راجہ کا تھا) کا قصہ بیان کیا ہے۔ ''وہ دن رات ملک کے مسائل میں کھویا رہتا تھا مگر باطن ایک صوفی تھا جس نے تمام فاصلے طے کر لیے تھے اور ارتکاز کی ایک مکمل کیفیت میں ڈوب گیا تھا۔ اس راجہ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ کیوں کر ہوا کہ آپ بیک وقت دنیا دار بھی ہیں اور گیانی بھی؟ راجہ نے حکم دیا کہ پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ اس شخص کے ہاتھ میں تھما دیا جائے اور پھر اسے حکم دیا جائے کہ وہ سارے شہر کا ایک چکر لگائے اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی کہ اگر پیالے سے ایک قطرہ بھی چھلکا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب یہ شخص پانی کے پیالے پر اپنی نظریں ہی نہیں اپنا پورا جسم بلکہ اپنی روح تک مرکوز کیے جب سارے بازار میں گھوم پھر واپس راجہ کے پاس آیا تو راجہ نے پوچھا'' اے شخص تو بازار میں کیا کچھ دیکھا؟'' اس کے جواب میں اس شخص نے کہا'' اے راجا! میں تو پیالے میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میرے چاروں طرف کیا تھا اور کیا ہو رہا تھا'' راجا نے کہا: یہی حال میرا ہے! میں اس حسن ازل کے پرتو میں اس قدر محو ہوں کہ میرے لیے یہ سب کچھ کوئی وجود نہیں رکھتا۔''۹

عشق میں ''قربانی'' کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے موجودہ مفکر کرکے گار (Kierkegard) کا ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال پر اب تک لکھی گئی کتب میں کرکے گار کا ذکر کہیں نہیں ملتا، خود علامہ اقبال کے عاشقی رویے نیز مرد مومن کے سلسلے میں ان کے خیالات کے ذکر میں نطشے، برگساں، اور عبدالکریم جیلی اور رومی کا تذکرہ تو بار بار ہوا ہے مگر کرکے گار کا حوالہ کسی نے نہیں دیا حالانکہ اقبال اور کرکے گار کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے اپنی تحریروں میں کرکے گار کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وزیر آغا نے زیر نظر تالیف میں کرکے گار کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان دونوں میں پہلی دفعہ مشترک اقدار کا انکشاف بھی کیا ہے لکھتے ہیں۔

''کرکے گار اور اقبال میں پہلی قدر مشترک تو یہ ہے کہ دونوں کا رویہ مذہبی ہے۔ ان کے برعکس نطشے الحاد کا علم بردار ہے اور اسی لیے اس کے فوق البشر مذہبی اخلاقیات سے بے نیاز دکھائی دیتا ہے۔ دوسری مشترک بات یہ ہے کہ کرکے گار خودی کا اثبات کرتا ہے اور انسان کو اپنے باطن سے متعارف ہونے کی تلقین کرتا ہے مگر یہ تعارف خارجی سطح سے کہیں زیادہ داخلی سطح کا ہے اس اعتبار سے بھی اقبال کا رویہ کرکے گار سے مختلف نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ کرکے گار کا ''سچا فرد'' خود کو ہمہ وقت ایک

حالت تغیر سے نبرد آزما محسوس کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی "شاعری" اور "خطبات" میں اس تغیر کے ثبات کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے۔ پھر کر کے کار کا" فرد" خود کو ہمہ خدا کے روبرو محسوس کرتا ہے۔ یہ بات نطشے کے فوق البشر کو حاصل نہیں، لیکن اقبال کے مردِ مومن کا یہ امتیازی وصف ہے ....
کر کے کار کا "جذبہ حریت" اقبال کے تصورِ عشق کے مماثل تو نہیں البتہ قریب ضرور ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی تکرار اور انفعالیت کے دائرے کو عبور کیا جائے۔ لہٰذا عقل و منطق کے سلاسل "فرد" کو ایک مستقل دائرے میں مقید رکھتے ہیں۔ لہٰذا عشق کے اس مرحلے کی توثیق اقبال نے بھی کی ہے جہاں عشق کی رفتار عقل و خرد کے فاضل بوجھ کی قربانی پیش کرتی ہے تا کہ وہ سبک اندام ہو کر پرواز کے قابل بن سکے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی [10]

ڈاکٹر وزیر آغا نے "تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" سے چند برس پہلے اردو ادب میں ایک منفرد تحقیقی کتاب "تخلیقی عمل" لکھی۔ اس میں وزیر آغا نے لفظ، سنگ اور سُر (جملہ فنونِ لطیفہ) کی "طوفان، مزاج اور جست یا تقلب" تین مراحل کے حوالے سے تخلیقی عمل کی تھیوری بیان کی ہے۔
"تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب میں تخلیقی عمل کی تھیوری کو علامہ اقبال کی شاعری سے اثبات مہیا کیا ہے۔ وزیر آغا نے اپنی کتاب "تخلیقی عمل" میں تین مراحل کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: "تخلیقی عمل اصلاً تین مراحل پر مشتمل ہے۔ طوفان کا مرحلہ جب ذات کے اندر تصادم کا آغاز ہوتا ہے، مزاج کا مرحلہ جب بے ہیئتی کا تسلط قائم ہو جاتا ہے اور جست کا مرحلہ جب فن کار وژن، آہنگ اور میڈیم Mediom کو بیک وقت بروئے کار لا کر بے ہیئتی کو ہیئت مہیا کرتا ہے اور ایسا کر کے خود کو سانس رکنے کی کربناک کیفیت سے نجات دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔" [11]

ڈاکٹر وزیر آغا نے "تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" میں "تخلیقی عمل" کی تھیوری کا جابجا اطلاق کیا ہے۔ صرف دو اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔
"اقبال کے ہاں عشق کا سارا تصور فن کی تخلیقی عمل سے مشابہ ہے۔ چنانچہ عشق جب خود فراموشی کی حالت میں آ کر لمحہ بھر کے لیے رکتا ہے تو دراصل اپنی تمام تر قوت کو مجتمع کرتا ہے تا کہ ایک ایسی جست لگاتا ہے جس سے بغیر "موجود" کی لکیر کو عبور کر کے ورا ءالورا سے ہم رشتہ ہونا ممکن نہیں۔ تاہم جب وہ جست لگاتا ہے تو تجلیات کا ایک پورا سلسلہ اس کے سامنے ابھر آتا ہے۔ بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق کے سفر کے مراحل میں سے اہم ترین "رفتار" کا مرحلہ ہے۔ جب یہ رفتار اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو طوفان کی طرح ایک لحہ سکوت سے بھی آشنا ہوتی ہے جو رفتار ہی کی انتہائی صورت ہے۔ فن کی تخلیق میں اس لمحے کو "مزاج" کہا گیا ہے جس میں صورت باقی نہیں رہتیں۔" [12]

"اقبال کے نظامِ فکر میں عشق اور خرد کی کہانی کچھ یوں مرتب ہوتی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سفر کے دو مراحل ہیں۔ ابتدا عقل کا تحلیلی اور تجزیاتی عمل ہے جو عشق کے وجدانی عمل میں ضم ہو جاتا ہے۔ عشق دائرے میں حرکت کرتا ہے اور اس کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز سے تیز ہوتی چلی جاتی ہے تا آنکہ نزاج یا بے ہیئتی کی وہ صورت وجود میں آتی ہے جسے خود فراموشی کا نام ملنا چاہیے۔ اسی عالم میں دائرے کی لکیر ٹوٹتی ہے اور عشق کی رفتار کائنات کی رفتار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہ لمحہ تخلیق کا لمحہ ہے جس میں انسان بے ہیئتی کے عالم سے ایک نئی ہیئت کو جنم دیتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اپنے شعور اور بصیرت کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ گویا ابتدائی مراحل میں عقل اور شعور کے جو عناصر اور اس کی ذات میں جذب ہوئے تھے وہ انتہائی مراحل میں آگہی اور انسان کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنی ذات کو نہ صرف "بے خودی" میں کھو جانے سے باز رکھے بلکہ اسے کائنات کی تخلیقی قوت کے سامنے ایک متوازی قوت کے طور پر ابھار دے۔ غور کیجئے تو یہ ساری کہانی فن کے تخلیقی عمل کی کہانی ہی سے مشابہ ہے۔" [13]

اپنے روحانی سفر کے ایک مرحلے پر وزیر آغا نے علامہ اقبال کی شاعری کی گہرائی میں اتر کر اس جمالیاتی تجربے کا سراغ لگایا ہے جسے خود علامہ "عارفانہ تجربہ" کہتے ہیں۔ وزیر آغا کے خیال میں عارفانہ اور جمالیاتی تجربہ اصلاً ایک ہیں، اس فرق کے ساتھ جب صوفی وجود کو عبور کر کے ورا ءالورا کو مس کرتا ہے تو اس پر مکمل خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، چنانچہ جب وہ حسنِ ازل کی زیارت کے بعد واپس وجود میں آتا ہے تو اس کے لیے اس تجربے کو بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا جبکہ فن کار، وجود تو عبور کرتا ہے مگر اس کی خود فراموشی فنا سے ذرا پرے ہوتی ہے، لہٰذا نتیجہ میں جس روشنی کے کوندے کا مشاہدہ کرتا ہے، اس کو لفظ سنگ یا سُر میں گرفتار کرنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "انتہائی جذب اور ارتکاز کی حالت میں بھی فن کار شعور ذات سے بیگانہ نہیں ہوتا، یہی اقبال کا رویہ بھی ہے اس لیے اقبال جس عارفانہ تجربے کا ذکر کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر جمالیاتی تجربہ ہے۔" [14]

روحانی سفر کا آخری مرحلہ وہ ہے جب ڈاکٹر وزیر آغا نے علامہ اقبال کو بیک وقت جمالیاتی سطح پر، عرفان کی سطح پر اور تخلیق کی ایک قوس بناتے دیکھا ہے۔ اقبال جو آغاز میں پروانہ تھا جمالیاتی سفر کے آخر میں کرمکِ شب تاب (جگنو) میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بقول وزیر آغا "اقبال کے ہاں جب پروانے سے جگنو کی طرف سفر کا آغاز ہوا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عشق کی سرحد عبور کر کے آگہی کے مراحل میں داخل ہو رہے تھے۔ آگہی بیداریٔ ذات یا شعورِ ذات کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں عشق اور عقل کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور انسان کائنات کی تخلیقی سطح پر سانس لینے لگتا ہے۔ خودی کا لفظ علامہ اقبال کے آگہی کے اس روپ کے لیے پیش کیا ہے۔" [15]

"تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" کے اس مکمل جائزے سے ہی قاری اندازہ لگا سکتا ہے کہ موضوع مشکل تھا اور وقت تین ماہ کس عرق ریزی سے ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ۲۵۶ صفحات میں اس مہارت سے سمیٹا کہ اب تک "تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر کسی کو اس کی ثقاہت اور جامعیت پر شک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اب ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ایسے ٹھوس آثار چھوڑ گئے ہیں کہ ان کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ "اردو شاعری کا مزاج"، "تخلیقی عمل" اور "تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" میرے نزدیک علامہ اقبال کے اس شعر کی صحیح تعبیر پیش کرتی ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

حواشی

۱۔ "کچھ دیر پہلے نیند سے" آپ بیتی از مؤلف۔ ص ۱۴۲
۲۔ "شام کی منڈیر سے" آپ بیتی از وزیر آغا ص ۱۹۲
۳۔ اداریہ "اوراق" جولائی ۱۹۷۷ء، جدید نظم نمبر
۴۔ اداریہ "اوراق" جنوری ۱۹۷۸ء سالنامہ
۵۔ تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر" ص ۱۵۹
۶۔ تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر" ص ۱۶۰
۷۔ ایضاً ایضاً ص ۱۶۹
۸۔ ایضاً ایضاً ص ۷۳-۱۷۰
۹۔ ایضاً ایضاً ص ۱۹۲
۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تخلیقی عمل، ص ۲۰۳
۱۱۔ تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص ۲۰۳
۱۲۔ ایضاً ص ۲۰۴
۱۳۔ ایضاً ایضاً ص ۲۳۲
۱۴۔ ایضاً ایضاً ص ۲۲۶
۱۵۔ ایضاً ایضاً ص ۲۳۶

ذکرِ وزیر آغا

(۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کے بعد اخبارات اور رسائل میں)

عابد خورشید

شکیب جلالی نے کہا تھا :

عجب نہیں کہ اُگیں یاں درخت پانی کے
کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں

میرے سامنے ''کاغذی پیرہن'' کا شمارہ ۲۳ ہے۔ جس میں حرف حرف کی آواز زندہ ہوئی ہے جیسے وہ کراہ رہا ہے۔ لفظوں کی آنکھیں سرخ ہیں۔ ہر سطر غم سے بوجھل ہے۔ صفحات ہیں کہ اپنے پڑھنے والے کو تسلی دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شاہد شیدائی بھی کیسا سلیقہ مند آدمی ہے' آنسوؤں کو بھی سجا دیتا ہے اور تو اور گٹھڑی باندھ کر میرے سر پر رکھ دی ہے۔ کوئی پوچھے کہ آنکھوں کے آنسو سنبھالوں یا اس گٹھڑی کے۔ اس شمارے کے لکھاریوں کو بھی کیا سہولت ملی ہے' اپنے اپنے دکھ سمیٹ کر مجھے دے دیئے ہیں' کیسی بےفکری ہے۔ پھر شانِ بے نیازی دیکھیے' پیشانی پر لکھ دیا ہے :

وزیر آغا کی یاد میں

یعنی مژدہ ہو کہ آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوگئیں۔

میں اس شمارے کو پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر کسی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کوئی ایک کتاب بھی نہ پڑھی ہو' محض اس ایک رسالے کے مطالعے کے بعد وہ وزیر آغا کی قریباً ہر کتاب سے واقف ہوسکتا ہے۔ اُسے ایسا تعارف ضرور ہو جاتا ہے جس سے اُسے آغا جان کو پڑھنے کے لیے مہمیز ملتی ہے۔ اندرونِ سرورق پر آغا جان کی نظم ''بچی جھوٹی بات'' کا عکس ہے۔ اس نظم کے طلسم سے نکلیں تو صریرِ خامہ میں کئی ایک دوستوں کے بھیگے ہوئے خطوط ہیں' جن سے اُن کے غم کی تازہ کاری کا احساس جنم لیتا ہے۔ اس کے بعد وزیر آغا کی تصانیف کا تعارف ہے' اور ساتھ ہی اُن کی چند یادگار تصاویر ہیں' جن میں اُن کی علمیت' سنجیدگی' طمانیت' آنکھوں کے بھیتر چھپی شریر سی مسکراہٹ جو ہر نظر کی توجہ فوری اپنی جانب مبذول کروالیتی تھی۔ اُن کی شخصیت کی سب سے بڑی عطا یہی وہ مسکراہٹ ہے' وہی دلآویز مسکراہٹ جو ہر آنے والے کا استقبال کرتی' اور اُسے اپنا گرویدہ کرلیتی۔ اسی مسکراہٹ کے لیے اُنھوں نے کہا تھا :

عالمی ہے مسکراہٹ کی زباں
یہ زباں سیکھو بہت کام آئے گی

اداریے سے پہلے ''وزیر آغا کی یاد میں'' ہونے والی تقریبات کا مختصر احوال ہے جو یقیناً اُدھورا اس لیے ہے کہ بہت سی تقریبات کا ذکر اس میں ہونے سے رہ گیا۔ (صرف سرگودھا میں چھ سے زائد تقریبات منعقد ہوئیں) شمارے کے آغاز میں ایک نظم ہے ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' میں اسے ''نوحہ'' نہیں کہوں گا' کیونکہ نوحہ میں درد کی تکمیل ہوتی ہے اور اس نظم کو پڑھنے کے بعد سیرابیت کے باوجود تشنگی رہتی ہے بالکل اُس طرح جیسے بھرپور بارش کے بعد شاخوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ اس نظم کے ساتھ مظفر بخاری کی نظم ''وزیر آغا سے ملاقات پر'' شامل ہے جسے اعجاز رحیم نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس نظم کی قرأت میں اتنی گہرائی ہے کہ اسے اصل متن میں پڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وزیر آغا سے محبت کرنے والوں کی ایک کہکشاں ہے جنھوں نے اپنی اپنی عقیدت میں فیاضی سے کام لیا ہے' اور نہایت محبت سے نظمیں لکھی ہیں۔ جن شعراء کی نظمیں شامل ہیں اُن میں امین راحت چغتائی کی نظم ''یہ کائنات اصغر'' شاہین عباس کی نظم ''انھیں کہیں سے لائیے'' افضل عباس کی نظم ''گل ہائے عقیدت'' شاہین عباس کی نظم ''ختم ہوئے لوگ'' امتیاز احمد منصور کی نظم ''پہلی قرأت کے بعد'' گستاخ بخاری کی نظم ''وزیر آغا'' خوشحال ناظر کی نظم ''آپ سورج جو ہیں'' شاہد شیدائی کی نظم ''اثاثہ'' اور ارشد نعیم کی نظم ''اسی دھرتی کا حصہ تھے'' شامل ہیں۔ ہر نظم ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ ہر نظم میں جذبے کی صداقت اور جرأت کے ٹوٹنے کا کرب نمایاں ہے۔ اس شمارے کا پہلا مقالہ ستیہ پال آنند کا ''وزیر آغا کا پیڑ بیلیا'' ہے۔ یہ مقالہ بہت دقیق ہے۔ فاضل مقالہ نگار آغا جان کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے احساس کی کیفیت کو چھو لیتے ہیں۔ یہ مقالہ خود آپ اپنی تعریف ہے۔ اس مقالے کے بعد آغا جان کا شعری مجموعہ ''کاسۂ شام'' (جو ابھی اشاعت کے مراحل میں ہے) سے چند نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ان نظمیں کی قرأت ہی اِن نظموں کا جواز ہے۔ ایک ایسے لمس سے مس ہونے کا تجربہ ہے جسے الفاظ کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ اس سے پہلے کہ میں شمارے کے آئندہ مضامین کا تعارف کراؤں۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس شمارے کے قریباً ہر صفحے پر وزیر آغا کی نظموں اور اشعار کو نہایت خوبصورتی سے مزین کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ جس تحریر پر مقالہ لکھا گیا ہے وہ صحیح معنوں میں مقالہ ہے اور جس پر مضمون لکھا ہے وہ مضمون ہے۔ ''کاسۂ شام'' سے نظموں کے انتخاب کے بعد آغا جان کی دو خوبصورت نظموں ''خدشہ'' اور ''پُرانا قلعہ'' کا تجزیہ شاہد شیدائی نے کیا ہے۔ نظم ''خدشہ'' میں ''چڑیا'' سے کمال خوبی سے ''عورت'' کا کردار لیا گیا ہے اور اسے اُسی دلآویزی سے شاہد شیدائی نے دریافت بھی کیا ہے۔ ''پُرانا قلعہ'' آغا جان کی تازہ ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں تازہ کاری کی وہ حیثیت ہے جس کی جانب ستیہ پال آنند نے اپنے مقالے میں اشارہ کیا ہے۔ شاہد شیدائی نے تجزیہ کرتے ہوئے بھی اس اَمر کا بخوبی خیال رکھا ہے۔ اِن تجزیات کے بعد سکندر حیات میکن کا ایک تحقیقی مضمون شاملِ اشاعت ہے جس میں ''وزیر آغا کی غزل میں سفر کی علامت'' کو دریافت کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع کی انفرادیت کے باعث اس مضمون کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس کے بعد آغا جان کی نظموں کا ایک اور انتخاب ہمارے سامنے آتا ہے' جو اُن کے مختلف مجموعوں سے لی گئی ہیں۔ شاعری کے اس بھرپور تعارف کے بعد آغا جان کی انشائیہ نگاری کا حصہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس حصے کے آغاز میں ''انشائیے'' کے حوالے سے مختصر تعریفیں درج کی گئی ہیں جو آغا جان کے مختلف مضامین سے اخذ ہیں۔ انشائیہ پر پہلا بھرپور مقالہ ڈاکٹر رشید امجد کا ہے ''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری'' یہ مقالہ نہ صرف وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا مکمل احاطہ کرتا ہے بلکہ انشائیہ کو بطور صنف بڑی صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس مقالے کے بعد آغا جان کے دو انشائیے شامل کیے گئے ہیں۔ ''دوسرا دن'' جو آغا جان کی آخری نثری تحریر ہے اور ''ملتوی کرنا'' جو اُن کی کلیات کے نئے ایڈیشن ''پگڈنڈی'' میں شائع ہونے سے رہ گیا۔ نیز اس حصے میں آغا جان کے کئی انشائیوں سے اقتباسات بھی شامل ہیں' جن سے انشائیے کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ انشائیے کی اس بھرپور مباحث کے بعد منور عثمانی کا مضمون ''شام دوستاں آباد'' ہے۔ ظاہر ہے اس شام میں ہر وہ شاعر وادیب شامل ہے' جو آغا جان سے عقیدت رکھتا ہے یا اُن کی علمیت کا معترف ہے۔ اس مضمون کے بعد وزیر آغا کی نظموں کا ایک اور انتخاب ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ ہی ایک بھرپور شخصی مضمون ہے جسے شاہد شیدائی نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں نہ صرف آغا جان کے شخصی اوصاف کو اُجاگر کیا گیا ہے بلکہ آغا جان کا اپنے نوکروں سے رویہ اور اُن کی کاشت کاری میں کامیابیوں کا تذکرہ بھی موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ یہاں سے مقالات کا ایک نیا سلسلہ قارئین کے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مقالہ' جس کا عنوان ''مفکر ادیب' وزیر آغا'' ہے۔ اس مقالے میں وزیر آغا کی ابتدائی ادبی زندگی کا احاطہ خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے

۔"وزیر آغا کے ذہنی آفاق" یہ عنوان ہے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کے مقالے کا' جس کا بنیادی نقطہ وزیر آغا کی ذہنی وسعت اور اُن کا علمی پھیلاؤ ہے۔ یہ مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جنھوں نے وزیر آغا کے حوالے سے بہت کام کیا' اُن کا مقالہ "وزیر آغا اور لسانی زندگی کی فعالیت" منفرد موضوع پر منفرد تحریر ہے۔ وزیر آغا کی لسانی خدمات اس کا مرکزہ ہے۔ اس مقالے کے بعد وزیر آغا کی نظموں کا ایک اور انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ "اے خستہ بدن" ڈاکٹر شازیہ عمیر کا مقالہ ہے' جنھوں نے وزیر آغا کی تنقید پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت زیرک نظری سے وزیر آغا کی نظموں کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمال اویسی کے مقالے کا عنوان ہے "وزیر آغا' ایک سربرآوردہ نقاد" ہے۔ یہ مقالہ وزیر آغا کی تنقیدی بصیرت کا احاطہ کرتا ہے۔ "ایک ہمہ جہت شخصیت" ارمان نجمی کا مقالہ ہے' ارمان نجمی وزیر آغا کی نظموں کے ایک عمدہ پارکھ ہیں۔ اس مقالے میں بھی بنیادی موضوع آغا جان کی نظم ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا مضمون "وزیر آغا کا نظریۂ عملِ تخلیق" تخلیقی عمل کی تھیوریز کے حوالے سے وزیر آغا کے نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کے بعد جو مضمون ہے وہ حنیف سرمد کا ہے' جنھوں نے "امتزاجی تنقید' منظر اور پس منظر" کے عنوان سے آغا جان کی امتزاجی تنقید کے نظریات پر عمدہ بحث کی ہے۔ اس مضمون کے بعد وزیر آغا کی چند طویل نظمیں شامل اشاعت کی گئی ہیں۔ "وزیر آغا' ایک امتزاجی نقاد" ڈاکٹر ضیاء الحسن کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ وزیر آغا کے امتزاجی تنقید کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر طارق حبیب کا تحقیقی مضمون "مجید امجد شناسی میں وزیر آغا کا حصہ" نہایت خوبی سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ اس سے پہلے طارق حبیب' وزیر آغا کی راشد شناسی اور میراجی شناسی کے حوالے سے عمدہ تحریریں لکھ چکے ہیں۔ شفیع ہمدم جو کہ خود بھی اچھے خاکہ نگار ہیں۔ اُنھوں نے "وزیر آغا بطور خاکہ نگار" ایک خوبصورت تحقیقی مضمون تحریر کیا ہے۔ آغا جان کی تحریروں میں سے ایسے اقتباسات جن میں ادباء و شعراء کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں' اس تحریر سے وزیر آغا کی ایک نئی جہت قارئین کے سامنے آتی ہے۔ اس مضمون کے بعد وزیر آغا کی نظموں کا ایک اور دلکش انتخاب ہماری سماعتوں کو معطر کرتا ہے۔ خالد فتح محمد جو نمائندہ افسانہ نگار و ناول نگار ہیں۔ اُنھوں نے "وزیر آغا کی دو اہم کتابیں" کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ دو کتابیں "اُردو شاعری کا مزاج" اور "شام کی منڈیر سے" کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس تجزیے کے بعد ڈاکٹر اقبال آفاقی نے وزیر آغا کی ایک نہایت دقیق کتاب "دستک اُس دروازے پر" کا تخلیقی مطالعہ "وزیر آغا کی دستک" کے نام سے کیا ہے۔ یاد رہے کہ وزیر آغا کی مذکورہ کتاب اُردو اَدب میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ جس میں "میں" اور "تُو" کا مکالمہ ہے۔ اور اس مکالمے میں دُنیا جہان کے موضوعات ہیں۔ جسے آفاقی صاحب نے کمال ہنرمندی سے اپنی تحریر میں سمویا ہے۔ اس مطالعے کے بعد وزیر آغا کی نظموں کا مزید ایک انتخاب ہمارا منتظر ہے۔ اکبر جاوید کا مضمون "عظیم قلم کار' بے مثال انسان" وزیر آغا سے اپنی یادوں کا احوال ہے۔ جس میں اپنائیت ہے' محبت ہے اور تعلق کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ یادوں کا ایک اور سلسلہ ڈاکٹر پرویز پروازی نے "گیاہ بندش" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ یادیں جو وطن کی مٹی کی خوشبو سے آغاز ہوتی ہے اور سات سمندر پار تک پھیلی ہوئی ہے' جس میں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوطی اور گہرائی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریر کے بعد "تاثرات اور یادیں" کے عنوان سے نامور ادباء و شعراء کے تاثرات ہیں۔ ان تمام تاثرات میں ایک بات یکساں ہے' کہ تمام کی تمام تحریریں اُداس کر دینے والی ہیں۔ ان تاثرات کے بعد وزیر آغا کی نظموں اور غزلوں سے انتخاب شاملِ اشاعت ہیں۔ وزیر آغا کی تخلیقی جہت کا ایک اور مضبوط حوالہ اُن کی پنجابی شاعری ہے۔ اخلاق عاطف نے "وزیر آغا دی پنجابی شاعری" لکھ کر اس حوالے کی اُٹھان اور گہری بنیاد سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ اس حصے کے آخر میں وزیر آغا کا ایک پنجابی انٹرویو جو شاہد شیدائی نے کچھ عرصے پہلے وزیر آغا سے لیا ہے' شامل کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو میں وزیر آغا کی شخصیت کا جو پہلو ہمارے سامنے آتا ہے' وہ شاید اس سے پہلے اس شرح سے نہیں آیا۔ اس حصے میں وزیر آغا کی غیر مطبوعہ پنجابی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس شمارے کا آخری مضمون جسے جمیل آذر نے انگریزی میں تحریر کیا ہے' جس کا عنوان "The New Literary Criticism" ہے جو وزیر آغا کی کتاب "The Symphony of Existence" کے مطالعے پر مبنی ہے۔

"کاغذی پیرہن" کے مطالعے کے بعد میں نے معاً الماری میں رکھے ہوئے اُن رسائل و جرائد کا مطالعہ کیا جن میں ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کے بعد ذکرِ وزیر آغا موجود ہے۔ ذرا سی تفصیل کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ قریباً آٹھ سو سے زائد صفحات ایسے ہیں' جن میں آغا جان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس حوالے سے جو گوشہ پہلے مرتب ہوا' وہ اَدبی رسالہ "اجراء" تھا۔ یہ شمارہ (کتابی سلسلہ ۳) جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء کو منظرِ عام پر آیا۔ اس شمارے میں پہلا مضمون ڈاکٹر انور سدید کا بعنوان "منفرد ادیب وزیر آغا" ہے' جس میں اُنھوں نے وزیر آغا سے اپنے تعلقِ خاطر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون جہاں انور سدید کی آغا صاحب سے محبت کا آئینہ ہے وہاں خود آغا صاحب کے حوالے سے بھی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس مضمون کے بعد جناب صبا اکرام کی "آغا صاحب کی یاد میں" کے عنوان سے ایک مختصر تحریر شامل ہے' لیکن پُراثر ضرور ہے۔ تیسرا مضمون جناب عباس رضوی نے "منکسی و مشفقی آغا صاحب" کے عنوان سے ایک تاثراتی تحریر قلمبند کی ہے۔ اس میں اُن کا ذاتی دُکھ بھی شامل ہے' ساتھ ہی اُنھوں نے "فصلِ آتش" کے نام سے ایک نظم کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس شمارے میں عباس رضوی صاحب کے نام وزیر آغا کے ایک خط کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس گوشے کا چوتھا مضمون علی حیدر ملک کا ہے' جس کا عنوان "ڈاکٹر وزیر آغا ...... ایک بلند اَدبی مینار" ہے۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے آغا صاحب کو جدید اُردو اَدب کا عظیم ترین معمار قرار دیا ہے۔ "اُڑا کے لے بھی گئی صبح کی ہوا مجھ کو" یہ تحریر محترمہ حمیرا اطہر کی ہے۔ یہ تحریر دراصل آغا صاحب سے ایک اَدبی مباحثہ کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ جس میں یقیناً اَدبی حوالوں سے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس تحریر کے بعد "وزیر آغا کے چند منتخب اشعار" شامل کیے گئے ہیں۔ اس ترتیب میں آگے دو مختصر تاثرات شامل کیے گئے ہیں جو بالترتیب فہیم شناس کاظمی بعنوان "ڈاکٹر وزیر آغا ...... پُرخلوص اور مہربان شخصیت" اور سید کاشف رضا "ڈاکٹر وزیر آغا ...... رُجحان ساز شخصیت" ہیں۔ "وزیر آغا اور ہم" یہ اس گوشۂ وزیر آغا کا آخر مضمون ہے جسے مرزا عابد عباس نے ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس شمارے کے آغاز میں مدیر احسن سلیم نے جن الفاظ سے وزیر آغا کی وفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہت پُراثر ہیں' ملاحظہ کیجیے :

"ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات نے ہمارے شعور کو ایسا دھچکا دیا ہے جو برسوں بلکہ مدتوں غم کے چراغ کو ہمارے دلوں میں روشن رکھے گا اور جب جب ہم اُنھیں یاد کریں گے' ہماری آنکھیں نمناک ہو جایا کریں گی۔ آغا صاحب کی مثال ایک ایسے چھتنار درخت کی سی تھی جس کے سائے میں بہتوں کو کڑی دھوپ کے سفر کے بعد کا سکون نصیب ہوتا۔ اس درخت کے گر جانے کے بعد اس کے اطراف ایسا خوفناک سناٹا پھیل گیا' جس کی اصل کیفیت کو بیان کرنے کے لیے شاید اُردو میں کوئی متبادل لفظ نہ ہو' مگر انگریزی کا ایک لفظ غالباً اس کی مکمل ترجمانی کرتا ہے اور وہ ہے Aghast یعنی ایسا سناٹا جو آدمی کے خوف اور پست ہمتی کا موجب ہو۔"

اکتوبر ۲۰۱۰ء میں کئی ایک شماروں نے وزیر آغا کے حوالے سے مضامین شامل کیے۔ پہلے ذکر لاہور سے نکلنے والے رسالے "تحقیق" کا' جس کے مدیر معروف شاعر و ادیب اکبر جاوید ہیں۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں وزیر آغا پر دو مضمون شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر انور سدید کا ہے' جس کا عنوان "مجھے دُور جانا ہے' میں جا رہا ہوں" ہے۔ اس مضمون میں آغا صاحب کی وفات کے بعد انور سدید صاحب نے اپنی اُس کیفیت کو بیان کیا ہے جس کے دُکھ میں وہ گرفتار ہوئے۔ یہ محبت اور تعلق سے گندھی ہوئی تحریر ہے۔ اس تحریر کے ساتھ ہی ڈاکٹر انور سدید کا منظوم نذرانۂ عقیدت "ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر" شامل ہے۔ جس کا مطلع ہے :

تنویر یاب ہو گا زمانے میں اس کا نام
لکھا گیا ہے لوحِ جہاں پر اب اس کا نام

اس شمارے کی دوسری تحریر نجم الحسن رضوی کی ہے جسے اُنھوں نے "آخری دستک' اُس دروازے پر" کا نام دیا ہے۔ اس تحریر میں زیادہ ذکر وزیر آغا کے سویڈن کے سفر کے حوالے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی شمارے میں عبدالمنان طرزی (انڈیا) نے "قطعۂ تاریخ وفات ڈاکٹر

وزیر آغا" بھی نکالا ہے۔

لاہور سے ہی باقاعدگی سے نکلنے والا اَدبی رسالہ "الحمراء" بھی وزیر آغا کے غم میں برابر شامل رہا۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہونے والے شمارے میں گوشۂ وزیر آغا میں کئی ایک نامور ادباء و شعراء کی تحریریں شامل کی گئیں۔ پہلی تحریر ڈاکٹر انور سدید کی ہے' جو بعنوان "سلسلہ آشنائی کا ...... اور غمِ محرومیِ جاوید کا" ہے۔ یہ تحریر بھی انور سدید کی دیگر تحریروں کی طرح ذاتی غم سے لبریز ہے۔ ہر ہر سطر میں وزیر آغا کا ساتھ چھوٹ جانے کا دُکھ نمایاں ہے' مختصر طور سے کہا جا سکتا ہے کہ "آنسوؤں سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔" دوسری تحریر جمیل یوسف کی ہے جسے "رفتید' و لے نہ از دلِ ما" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تحریر میں وزیر آغا کی یادیں شامل ہیں' جو جمیل یوسف کے ذہن پر نقش ہیں' جنھیں اُن کے بقول وہ نہیں بھلا سکتے۔ پروفیسر جمیل آذر کی تحریر "وزیر آغا ایک دبستان" کے عنوان سے شامل کی گئی ہے۔ یہ تحریر بھی دوستی' عقیدت اور محبت کے جذبات سے مملو ہے۔ اس گوشے میں یونس حسن کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا' ایک اور روشن چراغ بجھا" نے جذباتی فکر کو علمی فکر میں روشن کر دیا ہے۔ اس تحریر کے بعد ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان نے "شان الحق حقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کا آخری مکالمہ" کو اوراق کی زینت بنایا ہے۔ اس گوشے میں منظومات بھی شامل ہیں۔ جن میں ڈاکٹر انور سدید کی نظم "ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر" ستیہ پال آنند کی نظم "دل تو ایوبی ہوا' آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں" کی درج ذیل سطور اپنی جانب کھینچتی ہیں :

ٹھیک ہی کہتی تھی مرگ نا گہانی
دل تو میں نے برف کی اِک سِل سا جامد کر لیا ہے
میری گریہ ناک آنکھیں
میرے پورے شہر کو سیلاب میں شاید بہا کر لے گئی ہیں !

اِسی شمارے میں سید مشکور حسین یاد کی نظم "ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کے لیے" اور عبید بازغ آمر کی نظم "چھنی بھی سے آگئے" خاصے کی چیز ہیں۔ "الحمراء" کے مدیر' شاہد علی خان' ہیں۔ کراچی سے شائع ہونے والے معروف اَدبی رسالے "قومی زبان" نے ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی ادارت میں اکتوبر ۲۰۱۰ء کی اشاعت میں پہلا مضمون پروفیسر سحر انصاری کا "ڈاکٹر وزیر آغا' چند تاثرات" کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ مضمون زیادہ تر معلوماتی ہے' لیکن پروفیسر صاحب نے اپنے تعلق کا بھی خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔ یونس حسن کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا' ایک اور روشن چراغ بجھا" کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

نومبر ۲۰۱۰ء میں "الحمراء" میں دو تحریریں وزیر آغا کے حوالے سے شائع ہوئیں۔ پہلی تحریر سید مشکور حسین یاد کی ہے جسے اُنھوں نے "ڈاکٹر وزیر آغا سے آخری ملاقات" کا نام دیا ہے۔ مشکور صاحب نے اس ملاقات کا احوال دردمندی سے تحریر کیا ہے۔ دوسری تحریر سید تحسین گیلانی کی ہے' جس کا عنوان نے "ڈاکٹر وزیر آغا' چند یادیں' چند باتیں' چند جملے" یہ تحریر بھی عقیدت کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں بھی "الحمراء" نے وزیر آغا فہمی کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے سجاد نقوی کا نہایت خوبصورت مضمون شامل کیا ہے' جو ڈاکٹر انور سدید کی تحریر کردہ کتاب "وزیر آغا ایک مطالعہ" کا تجزیہ ہے۔ نقوی صاحب نے اس مضمون کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے اور صحیح معنوں میں اِس کتاب کا حق ادا کیا ہے۔

کراچی سے ایک اور معیاری اَدبی رسالے "روشنائی" نے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء میں احمد زین الدین کی ادارت میں "خراجِ عقیدت" کے عنوان سے ایک بھرپور گوشہ شائع کیا۔ اس گوشہ کی پہلی تحریر ڈاکٹر انور سدید کی ہے "سلسلہ آشنائی کا" اور غمِ محرومیِ جاوید کا" کا ذکر پہلے "الحمراء" کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ دوسری تحریر عبداللہ جاوید کی ہے' "اُردو شعر' اَدب اور تنقید کا ایک اہم نام' ڈاکٹر وزیر آغا"۔ اس تحریر میں عمدگی سے اپنے دُکھ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ستیہ پال آنند نے وزیر آغا کے خطوط کے حوالے سے ایک عمدہ تحریر قلمبند کی ہے۔ اس تحریر میں "ن' م' راشد" اور "میراجی" کے حوالے سے کچھ نئے حوالے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ (یہاں ایک گذارش ہمیں اپنے محترم ستیہ پال آنند سے بھی کرنا ہے کہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ستیہ پال آنند کی علمی اَدبی خدمات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے' اور اُنھیں باقاعدگی سے خط لکھتے تھے' وہ خطوط ستیہ پال آنند کو شائع کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔) اس شمارے میں سجاد نقوی کی تحریر "آغا صاحب" اس حوالے سے منفرد ہے کہ نقوی صاحب کی عمر کا ایک طویل حصہ آغا صاحب کے ساتھ گذرا۔ وہ بطور معاون مدیر "اوراق" بھی ساتھ رہے۔ یہ شخصی خاکہ اگرچہ وزیر آغا کی زندگی میں لکھا اور اُن کے سامنے پڑھا گیا لیکن کیسی حیرت کی بات ہے کہ اِس خاکہ کی مجموعی کیفیت میں ایک خاص طرح کی سنجیدگی اور اُداسی ہے' جو قاری کو آخر تک اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کا مضمون "وزیر آغا' ایک دبستان" کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس گوشہ میں ڈاکٹر رشید امجد کی تحریر "وزیر آغا' چند یادیں" بھی خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا شمار بھی وزیر آغا کے قریب ترین رفقاء میں ہوتا ہے۔ یہ تحریر بھی اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ ایک اور اہم تحریر جسے ارمان نجمی نے لکھا وہ ہے "وزیر آغا' ایک ہمہ جہت شخصیت" ارمان نجمی اس سے پہلے وزیر آغا پر ایک کتاب "بیاضِ شب و روز" تحریر کر چکے ہیں' جو خاصی مشہور ہوئی۔ اِسی گوشے میں اختر احسن نے وزیر آغا کی طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیے کے بعد بشیر موجد کی تحریر "ڈاکٹر وزیر آغا' ایک عہد ساز شخصیت" موجود ہے' جس میں یقیناً "اوراق" کے ٹائٹل بھی زیرِ بحث آئے ہیں' جنھیں موجد نہایت مہارت سے بناتے تھے۔ اے خیام کی تحریر "گارڈ فادر" اس لیے بھی اصول ہے کہ اس میں وزیر آغا کے خطوط کے اقتباسات ہیں جو وقتاً فوقتاً اے خیام کو لکھے گئے۔ "اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری" شفیق احمد شفیق کی یہ اِس گوشے کی آخری تحریر ہے جو اپنے اندر بے پناہ جاذبیت رکھتی ہے۔

جی سی لاہور سے شائع ہونے والا اَدبی میگزین "راوی" کی اشاعت ۲۰۱۰ء میں ۶ گوشے شائع کیے گئے' اُن میں سے ایک "گوشۂ وزیر آغا" ہے جس میں دو تحریریں ہیں۔ پہلی تحریر جو وزیر آغا کا انٹرویو ہے جو اُنھوں نے حسن رضوی کو دیا تھا دوسری تحریر خود آغا جان کی ہے جس کا عنوان "اکیسویں صدی کا تصور (بیسویں صدی میں)" یہ ایک فکر انگیز تحریر ہے جو اپنے اندر وسیع تر معانیاتی کائنات کی فکر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اِسی شمارے میں وزیر آغا کی دو نظمیں "دُکھ کی میلی چادر" اور "Compassion" بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

۲۰۱۰ء کے آخر میں میانوالی سے ارم ہاشمی کی ادارت میں شائع ہونے والا شمارہ سہ ماہی "تمام" نے "وزیر آغا نمبر" کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اداریہ میں ارم ہاشمی لکھتی ہیں : "موت سے کسی کو رستگاری نہیں مگر بعض ہستیوں کی موت سے ایک عہد رخصت ہو جاتا ہے"

آغاز ہی میں وزیر آغا کا منظوم خاکہ مبارک مونگیری نے تحریر کیا ہے' جس کا ایک شعر ہے :

وہ صفحاتِ اَدب پر نقش ہیں نقشِ حسیں بن کر
وہ اوراقِ سخن پر ثبت ہیں مہرِ مبیں بن کر

اس کے بعد وزیر آغا کی تصانیف کی تفصیل درج ہے۔ "آپس کی باتیں" یادداشتوں پر مشتمل تحریر ہے جس کے شرکائے گفتگو ڈاکٹر غفور قاسم اور ڈاکٹر انور سدید ہیں۔ ایک مختصر مگر جامع تحریر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی "آغا صاحب" شامل کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عابد سیال جن کا بنیادی تعلق سرگودھا سے ہے اور آج کل نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں شعبہ اُردو سے وابستہ ہیں' اُن کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا کچھ یادیں" اگرچہ یہ ایک تاثراتی تحریر ہے' لیکن اِس مضمون میں وزیر آغا کی زندگی کے آخری دنوں کی چند ایک باتوں کو بیان کیا ہے' جس میں سوچنے اور سمجھنے کے کئی پہلو ہیں۔ زاہدہ حنا کی تحریر "آغا صاحب' روشنی سفر میں ہے" اِس حوالے سے منفرد ہے کہ آغا جان کی نظموں میں سے اُن کی شخصیت کی دلآویزی کو یافت کیا گیا ہے۔ حیدر قریشی کا ایک مختصر مضمون "جدید اُردو اَدب کے عظیم دانشور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا انتقال کر گئے" بھی شاملِ اشاعت ہے۔ ذوالفقار احسن نے وزیر آغا کے شعری مجموعے "چٹکی بھر روشنی" کے تخصیصی مطالعے سے اُن کی نظم نگاری پر ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے' جو اِس شمارے میں شامل ہے۔ اگرچہ وزیر آغا کی خودنوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" پر متعدد تخلیق کاروں نے لکھا ہے لیکن انور سدید نے اِس کتاب کے فکری حوالوں کو زیادہ نمایاں کیا ہے' اُن کے مضمون میں اِس بات کا جا بجا اظہار ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا" کئی ایک جگہوں پر شائع ہوا ہے' اس لیے اِس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر غفور قاسم کی ہے جس کا عنوان ہے "کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات" یہ وزیر آغا کی غزل کا ایک مصرع ہے۔ مذکورہ تحریر میں شخصی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اِس شمارے کی آخری تحریر پروفیسر شفیق الرحمٰن کی ہے' جس کا عنوان "ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت انشائیہ نگار" ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ تحریر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے حوالے سے ہے۔

۲۰۱۰ء کے آخر تک مذکورہ شمارے ہی میری نظر سے گذرے جن میں وزیر آغا کے حوالے سے یادگاری مضامین و آراء شامل ہیں۔ جنوری ۲۰۱۱ء میں ماہنامہ "پرواز" لندن نے ایک خوبصورت "گوشۂ وزیر آغا" کا اہتمام کیا۔ اس کی ابتدا ساحر شیویؔ کے اشعار "ڈاکٹر وزیر آغا کی نذر" سے ہوتی ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

انھیں کے نام سے روشن ہے انشا پردازی تھے
اپنی ذات میں اُردو نگر وزیر آغا

اس کے بعد وزیر آغا کی نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ پھر مشاہیرِ اُدب کے وہ خطوط جو اُنھوں نے وزیر آغا کے نام لکھے اُن کا انتخاب بھی اس گوشے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس انتخاب کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون "وزیر آغا کے عناصر ثلاثہ" کے عنوان سے نہایت شاندار مضمون ہے جس میں وزیر آغا کی تین جہتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان جہتوں میں نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر کی جہات شامل ہیں۔ بعد ازاں جوگندر پال کا مضمون "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے تین مضمون "وزیر آغا اور سٹرکچر کا نظام" اور "وزیر آغا اور ساختیے کی مملکت خداداد" اور "وزیر آغا اور روسی فارمل ازم" اپنے موضوعات کے لحاظ سے جامع ہیں۔ ان تحریروں کے بعد ڈاکٹر انور سدید کی تحریر "شام کی منڈیر سے ایک فکری خودنوشت" کو مختلف حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ افتخار نسیم نے "ڈاکٹر وزیر آغا اُردو اَدب کا آخری ستون" کے نام سے ایک مختصر تحریر لکھی ہے جو ایک سے زائد رسائل میں شائع ہوئی ہے۔ اس گوشے کے آخر میں وزیر آغا کا ایک خوبصورت انشائیہ "غزل" شامل کیا گیا ہے۔

جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء میں لاہور سے ڈاکٹر ناصر رانا کی ادارت میں شائع ہونے والے اَدبی مجلّہ "اَدبِ معلّیٰ" نے اپنی اس اشاعت کو "وزیر آغا نمبر" کے طور پر شائع کیا۔ پہلا مضمون آغا گل کا "کھلی والا" کے نام سے ہے۔ یہ ایک تاثراتی تحریر ہے، جس میں گل صاحب نے آغا جان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اخلاق عاطف کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی شاعری" اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھا گیا اور شائع ہوا ہے۔ یہ انداز بھی خوب ہے۔ "اَدبِ معلّیٰ" میں یہ مضمون اُردو زبان میں شامل ہے۔ پروفیسر اصغر علی بلوچ نے "زندہ اُدب کا استعارہ وزیر آغا" میں آغا جان کی مختلف جہات پر بات کی ہے۔ افتخار نسیم کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، اُردو اَدب کا آخری ستون" ہے جس پر بات ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "مفکر ادیب وزیر آغا" "کاغذی پیرہن" لاہور میں بھی شائع ہوا ہے، اس کے حوالے سے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور فن" کا ذکر بھی "تارِ دل" میں آ چکا ہے۔ "اَدبِ معلّیٰ" کی سب سے نایاب تحریر ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کی ہے جو وزیر آغا کے ۵۱ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط نہ صرف حسرت صاحب کے لیے کسی اثاثے سے کم نہیں بلکہ اُدب کے عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی اور معلومات کا باعث ہیں۔ (دیگر اہلِ قلم حضرات کو بھی وزیر آغا کے خطوط فوراً شائع کر دینے چاہئیں۔) خاور چودھری کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، سورج تو تیرا نام بجھا کر چلا گیا" آغا جان کی اَدبی خدمات کا اعتراف ہے۔ دردانہ نوشین خان نے وزیر آغا کی نظم "ہوا تحریر کر مجھ کو" کا تجزیہ ایک سے زائد رسائل میں شائع ہوا ہے، اس لیے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح ذوالفقار احسن کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، ایک زریں عہد کا خاتمہ" بھی عمدہ تحریر ہے اور "اَدبِ معلّیٰ" کے علاوہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ رضیہ مجید نے وزیر آغا کی خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" کا تجزیہ نہایت عالمانہ انداز سے کیا ہے۔ اسی طرح رومانہ رومی کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا اور اُردو انشائیہ" نہ صرف وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کو زیرِ بحث لایا گیا ہے بلکہ انشائیہ کی تحریک کو بھی نمایاں انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی تحریر "ڈاکٹر وزیر آغا، خطوط سے اقتباسات پر مبنی ایک دستاویز" بہت نادر تحریر ہے۔ یقیناً آغا جان کے بے شمار خطوط ستیہ پال آنند کے پاس ہوں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُن کی اشاعت بھی جلد ہی کسی رسالے میں ہمیں نظر آئے گی۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن نے بھی کمال محبت سے وزیر آغا کا ذکر اپنی تحریر "کچھ رابطے کچھ ضابطے" میں کیا ہے۔ اس تحریر میں سلیم الرحمٰن کے نام وزیر آغا کے ۴ خطوط کا عکس بھی ہے۔ شاکر کنڈان کی تحریر "ڈاکٹر وزیر آغا، چند یادیں" دل کو چھو لینے والی تحریر ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو اُنھوں نے نہایت خوبی سے اس مضمون میں پرو دیا ہے۔ شاہد بخاری کا مضمون "وزیر آغا" بھی اُن کے ذاتی تعلقات پر مبنی ایک تحریر ہے، جس میں آغا جان کی شاعری کا حوالہ بھی آیا ہے۔ شفیع ہمدم کے مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا بطور خاکہ نگار" کا ذکر ہم کر چکے ہیں، یہ عمدہ مضمون ہے۔ پروفیسر شمیم کوثر کا مضمون "لورات کی بات تمام ہوئی" لطیف تاثر لیے ہوئے ہے۔ شوکت علی فیضان کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا" شعری مجموعے "شام اور سائے" کے بارے میں نامور ناقدین کی آراء پر مشتمل ہے۔ شیخ فرید کا مضمون "روشنی کا ایک استعارہ نیند میں گم ہو گیا" اور عارف ضیاء کا مضمون "اپنے فن میں زندہ لوگ" تاثراتی انداز کی تحریریں ہیں۔ ارشد محمود ارشد کی دو غزلیں جو اُنھوں نے وزیر آغا کی زمین میں لکھی ہیں، عمدہ کاوش ہے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن میو نے "اَدب کے وزیر، ڈاکٹر وزیر آغا" میں کتابوں کی تفصیل کے علاوہ آغا جان کی شخصی خوبیوں کو بھی اپنی تحریر میں نمایاں کیا ہے اور یہی کیفیت "محمود الحسن رجانہ کی تحریر" "ڈاکٹر وزیر آغا، اِک آفتابِ جہاں تاب" میں بھی پڑھنے والوں کو محسوس ہوتی ہے۔ مشتاق احمد جو انشائیہ کی تحریک میں وزیر آغا کے ہراول دستے کے شہسوار ہیں، اپنے مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، ایک پیکرِ علم و دانش" وزیر آغا کی متعدد جہات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ نذیر خالد کی تحریر "ڈاکٹر وزیر آغا میری نظر میں" ایک پُر اثر تحریر ہے جس میں اُنھوں نے اپنے سرگودھا کے قیام کے دوران میں آغا جان سے ملاقاتوں کو قلمبند کیا ہے۔ نگہت اکرم کا مضمون "دنیائے اَدب کا اِک ستارہ" بھی خوبصورت جذبات کی عکاسی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، ایک شخصی و علمی تجزیہ" ہے جسے خوبی سے لکھا گیا ہے۔ یونس حسن کے دو مضمون بعنوان "ڈاکٹر وزیر آغا، ایک عہد ساز ادیب، محقق اور نقاد" اور "وزیر آغا کی یاد میں" دونوں ہی بہت پائے کے مضمون ہیں اور یادنگاری کے حوالے سے بھی ان تحریروں کو پذیرائی ملے گی۔ اس کے بعد وزیر آغا کی چند ایک منتخب تحریریں شامل کی گئی ہیں جن میں "جدیدیت کیا ہے؟" "درخت آدمی" جوغشایاد کے افسانوں پر وزیر آغا کی نایاب تحریر ہے۔ اور "علمی زبان اور اَدبی زبان" لسانی حوالے سے لاجواب مضمون ہے۔ ان مضامین کے بعد آغا جان کی چند ایک نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی کیا گیا ہے۔ اس شمارے کے آخر میں ڈاکٹر ناصر رانا کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، میرا جہانِ معنی" اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ مضمون نہ صرف یادنگاری کا عمدہ نمونہ ہے بلکہ اس مضمون میں شامل واقعات سے وزیر آغا کے انسان دوستی کا اعلا معیارات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

بھیرہ (سرگودھا) سے شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ "تارِ دل" جسے مرزا شبیر بھیروی مرتب کرتے ہیں، یہ وہ پہلا رسالہ ہے وہ مکمل طور پر "وزیر آغا نمبر" ہے، یہ ۱۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے والے اس شمارے میں کل ۴۷ نامور ادباء و شعراء کی تخلیقات شامل ہیں، جن میں وزیر آغا کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ رسالے کا آغاز سید عارف مجبور رضوی کے "قطعہ تاریخِ وفات" سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی ایک مختصر تحریر "عہد ساز ادیب اور دانشور" کے نام سے شامل ہے۔ اس کے بعد اخلاق عاطف کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا کی پنجابی شاعری" وزیر آغا کی پنجابی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ منظوم نذرانہ عقیدت خالد رومی "نظم در مدح ڈاکٹر وزیر آغا" غشایاد کا مضمون "ایک نہایت روشن ادبی تارے کا غروب" نہایت جاندار مضمون ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا، چند بکھری بکھری یادیں" رشید امجد اور وزیر آغا کے باہمی تعلقات کا خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ جواد حسنین بشرؔ کی نظم "وزیر آغا ہیں سب کو پیارے" معصوم جذبوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا شمار سرگودھا کے نہایت معروف ادباء میں ہوتا ہے، اُن کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا" اپنے دامن میں بہت سی وسعتیں لیے ہوئے ہے، کئی رسالوں میں اس مضمون کی اشاعت ہوئی، اس لیے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں علی شاہد کی نظم "آہ! وزیر آغا" شامل ہے۔ نامور سفرنامہ نگار بیگم ثاقبہ رحیم الدین نے "ڈاکٹر وزیر آغا، شخصیت اور فن" اپنی تحریر میں شخصی اور علمی اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ شاکر کنڈان کا مضمون "وزغ" سے وزغ تک" میں وزیر آغا کو سماجی حوالوں سے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی مضمون کے بعد میثم علی آغا کی پنجابی نظم "ڈاکٹر وزیر آغا ہوراں لئی ایک نظم" ایک اچھی تخلیق ہے۔ پروفیسر جلیل عالی "ڈاکٹر وزیر آغا، ہشت پہلو شخصیت" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں

وزیر آغا بطور شاعر، نقاد اور انشائیہ نگار اور دیگر حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون کے ساتھ حجاب عباسی کی نظم ''آہ ! ڈاکٹر وزیر آغا'' اپنے جذبات کا عمدہ اظہار ہے۔ ''آہ ! وزیر آغا'' کو ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی نے تحریر کیا ہے' یہ بھی ایک تاثراتی تحریر ہے۔ اسی صفحے پر محمد مشرف حسین انجم کی نظم ''اُردو ادب کی جاں تھے وزیر آغا'' محبت کا عمدہ اظہار ہے۔ آسناتھ کنول کے مضمون کا عنوان ''ڈاکٹر وزیر آغا'' ہے' یہ مضمون بھی وزیر آغا کی علمی خدمات کا اعتراف ہے۔ سہ ماہی ''اسالیب'' کے مدیر ذوالفقار احسن کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا کا انتقال' ایک زریں عہد کا خاتمہ'' کے نام سے شاملِ اشاعت ہے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ اس میں وزیر آغا کی اُدبی خدمات کے ساتھ ساتھ اُن کے شخصی اوصاف کو بھی نمایاں کرنے کی عمدگی سے کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا' ایک دبستان'' کی اشاعت ایک سے زائد رسائل میں ہوئی' اس لیے اُس کا ذکر آ چکا ہے۔ ایک خوبصورت تحریر پروفیسر یوسف چوہان کی ہے جس کا عنوان ہے ''اقبالؒ کے تصوراتِ عقل وعشق' ڈاکٹر وزیر آغا کی نظر میں''۔ وزیر آغا کی کتاب 'اقبالؒ' پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے اور منفرد بھی۔ اس تحریر کا پس منظر بھی وہی کتاب ہے۔ اس مضمون کے ایک طرف محمد علی سوز کی نظم ''وزیر آغا وزیر آغا'' اچھی تخلیق ہے۔ اسی مضمون میں ایک اور نظم ''رومانہ رومی کی ہے' ایک شعر ملاحظہ کیجئے :

اُدب کی راہ منور وزیر آغا تھے

سخنوروں کے سخنور وزیر آغا تھے

محمد نورالدین موج کا قطعہ تاریخ 'مصعبِ توشیخ قطعہ تاریخ برائے ڈاکٹر وزیر آغا'' بھی اسی تحریر کے آخر میں شامل ہے۔ معروف دانشور اور شاعرہ کشور ناہید کی مختصر تاثراتی تحریر ''وزیر آغا کا اُدبی مزاج'' کے عنوان سے شامل ہے۔ گوہر ملسیانی کی دو غزلیں جو انھوں نے وزیر آغا کی زمینوں میں لکھی ہیں' شاملِ اشاعت ہیں۔ اس کے بعد محمد مشرف حسین انجم نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا' علم واُدب کا بحرِ بیکراں'' میں آغا صاحب کو شاندار الفاظ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ظریف احسن کی ایک مختصر تحریر ''ڈاکٹر وزیر آغا' ۱۹۲۲ء تا ۲۰۱۰ء'' ابتدائی معلومات پر مشتمل ہے۔ علی اکبر ناطق کی نظم ''ہمیں بھی رولے ہجومِ گریہ'' ایک جذباتی نظم ہے۔ خاقان ساجد کا مضمون ''اُدبی سلطنت کا وزیرِ اعظم'' وزیر آغا سے رابطوں کا سلسلہ استوار ہونے کی کہانی ہے' جو اپنا بھرپور تاثر رکھتی ہے۔ اتفاق بٹ کی نظم ''علم کا پیرہن' وزیر آغا'' جمالیاتی فکر لیے ہوئے ہے۔ نجہت اکرم کا مضمون ''خراجِ تحسین' ڈاکٹر وزیر آغا'' جو مختلف ادباء وشعراء کے تاثرات وخیالات پر مشتمل ہے۔ محمد یوسف چوہان کی نظم ''دھرتی ماں کا سپوت' وزیر آغا'' عقیدت کا نہایت عمدہ اظہار ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے یوں تو ہمیشہ مسلسل وزیر آغا کے حوالے سے اپنے مضامین کا سلسلہ جاری رکھا لیکن آغا صاحب کی رحلت کے بعد وہ ہر شمارے میں اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کا مضمون ''وزیر آغا' موت کا شناسا'' وزیر آغا کی نظموں میں دبے پاؤں موت کی آہٹ سناتی ہے۔ یہ موضوع آغا صاحب کی شاعری میں نہایت اچھوتے انداز میں آیا ہے۔ اس موضوع کو مزید لکھے جانے کی اشد ضرورت ہے۔ گوہر ملسیانی کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا کی غزل'' کی خوبی یہ ہے کہ عام طور پر وزیر آغا کی غزل کے حوالے سے زیادہ بات نہیں ہوتی' یہ مضمون اُس جانب بھی اشارہ ہے۔ اسی مضمون کے ایک طرف پروفیسر یوسف چوہان کی نظم ''آغا جی'' موجود ہے۔ عاکف حسّان کی نظم ''میں صرف اس سے ملا نہیں تھا'' اپنے جذبات کا برجستہ اظہار ہے۔ دردانہ نوشین خان نے وزیر آغا کی نظم ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' کا تجزیہ کیا ہے' جو کئی ایک لحاظ سے ایک اچھی تحریر ہے۔ پروفیسر شمشاد احمد کی مختصر تحریر ''آغا جی'' بھی زینتِ اشاعت ہے۔ راقم الحروف (عابد خورشید) نے آغا جان کا شخصی خاکہ لکھا اور ایک بار میں نے آغا جان کو سنایا بھی' جسے اُنھوں نے مجموعی طور پر پسند فرمایا۔ اس کے بعد پروفیسر آفتاب اقبال شمیم کی مختصر تحریر ''ڈاکٹر وزیر آغا'' اور پھر انجم نیازی جو کہ وزیر آغا کے قریبی دوستوں میں سے ہیں اُن کا تحریر ''ڈاکٹر وزیر آغا' ناقابلِ فراموش شخصیت'' اپنی قربتوں کا اظہار ہے۔ محمد ایوب صابر کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا' شخصیت اور فن'' اس اعتبار سے منفرد ہے کہ فن اور شخصیت کو یکجا کرنے کے دیکھنے کی کوشش ہے۔ عکاشہ سحر ایمان نے بھی مختصراً ''ڈاکٹر وزیر آغا' ایک عہد ساز شخصیت'' میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ محمد نورالدین موج کا مضمون ''قصرِ اُدب کی دہلیز کا روشن دیا' ڈاکٹر وزیر آغا'' آغا صاحب نظم ونثر کے حوالوں سے بھرپور یہ مضمون ہے۔ فضہ پروین رانی کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا' ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'' وزیر آغا کی ذاتی معلومات کے علاوہ اُن کی اُدبی قامت کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ یہ مضمون اس شمارے کا آخری مضمون ہے۔

جرمنی سے حیدر قریشی کی ادارت میں شائع ہونے والا اُدبی رسالہ ''جدید اُدب'' نے اپنے قارئین میں ایک خاص طرح کی جگہ بنالی ہے۔ جنوری تا جون ۲۰۱۱ء کے شمارے میں وزیر آغا کے گوشے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں جہاں بیرونِ ملک ادباء کی ایک کثیر تعداد نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے' وہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُردو زبان کی موجودگی جہاں جہاں ہے' وہاں کی نمائندگی ہمیں نظر آتی ہے۔ اس رسالے میں سب سے پہلے BBC پر نشر ہونے والے فیچر کو تحریری صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ''نقاد' انشائیہ نگار اور شاعر وزیر آغا'' اس کے بعد خشایاد کا مضمون ''ایک بڑے اُدبی تارے کا غروب'' اپنے موضوع کے حوالے سے نہایت عمدہ مضمون ہے۔ جس میں وزیر آغا کے شخصی اوصاف کے علاوہ اُن کا بطور ادیب مقام ومرتبہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زاہدہ حنا کی تحریر بعنوان ''آغا صاحب' روشنی سفر میں ہے'' وزیر آغا کی ذات کے حوالے سے ایک عمدہ تحریر ہے اس تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ زاہدہ حنا نے وزیر آغا کی نظموں کے بطون میں وزیر آغا کی ذات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضمون روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اسلام آباد اشاعت ۲۶ ستمبر ۲۰۱۰ء میں بھی شامل تھا۔ علاوہ ازیں اکبر حمیدی کی تحریر ''آہ ! وزیر آغا'' یہ تحریر بھی لاجواب ہے۔ نامور شاعر وادیب امجد اسلام امجد نے روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اشاعت ۱۶ ستمبر ۲۰۱۰ء میں ایک کالم تحریر کیا جسے ''ڈاکٹر وزیر آغا'' کے عنوان سے مکرر شائع کیا گیا۔ اس گوشے میں بھی افتخار نسیم کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا' اُردو اُدب کا آخری ستون'' بھی اس گوشے میں شامل کیا گیا ہے۔ سرفراز سید نے بھی روزنامہ ''اوصاف'' اسلام آباد' میں ایک کالم ''ڈاکٹر وزیر آغا بھی رُخصت ہو گئے !'' لکھا جسے اس گوشے میں اشاعتِ مکرر کے لیے پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں تعزیتی تاثرات کے عنوان سے معاصر ادباء وشعراء کے ۶۰ سے زائد تاثرات شامل کیے گئے ہیں۔ نامور شاعر گلزار نے لکھا :

''اُردو اُدب کا وہ ''بزرگ'' چلا گیا جسے میں اپنا سبق دکھایا کرتا تھا۔ اُستاد کی جگہ خالی ہو گئی''

اس رسالے کو انٹرنیٹ پر بھی جاری کیا گیا ہے۔ اداریے میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا :

''ان کے علمی واُدبی کارہائے نمایاں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جاتا رہے گا''

قائداعظم لائبریری کا ششماہی ادبی مجلّہ ''مخزن'' کا تازہ پرچہ جلد ۱۱، شمارہ نمبر ۱، ۲۰۱۱ء شہزاد احمد کی زیرِ ادارت شائع ہوا۔ اس ادبی مجلّہ نے ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے ایک گوشہ مختص کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون بعنوان ''گوری کے روپ اور بہروپ'' جو انھوں نے ظفر علی راجا کی کتاب کے لیے لکھا تھا شامل ہے ۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ''وزیر آغا کی غزل'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کا مضمون جو انھوں نے سہ ماہی ''تمام'' کو دیا تھا وہی بار دگر یہاں شائع ہوا ہے عنوان تھا'' کہنے کا چند گام تھا یہ عرصہ' حیات'' جمیل آذر کا مضمون'' وزیر آغا اور انشائیہ''، سجاد نقوی کا مضمون'' تصوراتِ عشق وخرد۔ اقبال کی نظر میں''، ڈاکٹر پرویز پروازی کا مضمون ''گیاہ بندش'' اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''وزیر آغا اور سترکچر کا انظام'' پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مختصراً یہ مطالعہ محض اُن رسائل وجرائد پر مشتمل ہے جو میری دسترس میں تھے جن میں وزیر آغا پر ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کے بعد لکھے جانے والے مضامین ومقالے شامل ہیں۔ یقیناً بہت کچھ پڑھنے سے رہ گیا ہوگا۔ لیکن یہ بات قدرے اطمینان کی حامل ہے کہ معاشرے میں ظاہری طور پر نظر آنے والی ٹوٹ پھوٹ اور مجموعی طور پر معاشرتی بے حسی کے مزاج نے وزیر آغا ایسے وسیع تخلیقی ذہن کو یکسر فراموش نہیں کیا بلکہ اُن کی رحلت کو وسیع پیمانے پر محسوس کیا گیا۔ اگرچہ سرکاری اداروں کی سطح پر سرد مہری کی دبیز گرد ابھی موجود ہے' لیکن اُس گرد کو صاف ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ جب اُدب کا عام قاری کسی تعصب کے بغیر وزیر آغا کی تخلیقات کا مطالعہ آزادانہ انداز میں کرے گا' کیونکہ اس فضا کو بدلنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

''اُردو شاعری کا مزاج'' ایک مختصر جائزہ

عبدالعزیز ملک

استاد شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

آسمانِ علم و ادب کے افق پر چمکتا دمکتا ستارہ، ڈاکٹر وزیر آغا اس دُنیائے فانی سے رختِ سفر باندھ گیا مگر اس کے چمک دمک آج بھی آسمانِ ادب کا نظارہ کرنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دکھائی پڑتی ہے انھوں نے تمام عمر جس محنت و جانفشانی سے علم و ادب کی خدمات کا بیڑہ اٹھایا۔ اس سے کما حقہ عہدہ برا بھی ہوئے۔ وہ کثیر الجہات شخصیت کے حامل ایک ایسے نابغۂ روزگار تھے جنہیں علم و ادب، تحقیق و تنقید، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، منطق، طب، سائنس، معاشیات، اور اساطیر وغیرہ پر یکساں عبور تھا۔ جس کی شہادت ان کی تحاریر سے ملتی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی کامیاب مساعی کیں جن میں غزل، نظم، تنقیدی مضامین اور انشائیہ وغیرہ کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے۔

اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پاکستان کے تنقیدی حلقوں کا یہ شیوہ ہے کہ مختلف نقاد متنوع موضوعات پر مضامین قلم بند کرتے ہیں۔ اور بعد میں انھیں یک جا کر کے کتابی شکل میں منظرِ عام پر لاتے ہیں اور یوں ان کا شمار ناقدین ادب میں ہونے لگتا ہے۔ ایک موضوع پر جامع کتاب تحریر کرنے کی ہمت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یک موضوعی کتب تحریر کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام بصد عزت لیا جا سکتا ہے۔ بقول پروفیسر جلیل عالی:

''انھوں نے نظری اور عملی دونوں لحاظ سے بعض موضوعات پر تنقید کی مکمل اور مبسوط کتابیں تحریر کیں۔ اس حوالے سے اردو شاعری کا مزاج'' تخلیقی عمل، اردو ادب میں طنز و مزاح، تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں' اور بعض دوسرے عنوانات سے شائع ہونے والی ان کی تصانیف بہت اہمیت رکھتی ہیں۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا، ہشت پہلو شخصیت از پروفیسر جلیل عالی، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۰ء ص ۲۷)

مذکورہ بالا اقتباس میں درج کتب کے علاوہ ''مجید امجد کی داستان محبت'' اور'' غالب کا ذوق تماشا'' اس کے سوا ہیں۔ وزیر آغا کی تحریر کردہ یک موضوعی کتب اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے یقیناً قابل قدر و ستائش ہیں لیکن ''اردو شاعری کا مزاج'' (۱۹۶۵ء) ایک ایسی کتاب ہے جو وزیر آغا کے ادبی قد کاٹھ میں نہ صرف اضافے کا باعث بنی بلکہ بہت سارے شیدایانِ ادب کے لیے اردو شاعری کے مزاج کی نئی جہات سے شناسائی کا موجب بھی بنی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یکے بعد دیگرے کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آئے اور قبولِ عام اور بقائے دوام کی منازل طے کرتے گئے۔ جہاں اس کتاب کو پذیرائی ملی، وہیں اس پر منفی تنقید کی توپوں کے دہانے بھی کھلے اور پے درپے اپنی ذہنی سطح کے مطابق اس کتاب کو مطعون کرنے کی کوشش بھی کی گئی جس کا ان متعدد مضامین'' اردو شاعری کا مزاج'' کے حوالے سے منصۂ شہود پر آئے۔ اس بابت سجاد نقوی نے ''اردو شاعری کا مزاج معاصرین کی نظر میں'' کے عنوان کے تحت ایک کتاب بھی مرتب کر ڈالی۔ مزید براں مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن میں شاہد شیدائی نے جو'' پیش لفظ'' رقم کیا، اس میں بھی انھوں نے اس بات کا اظہار صراحت سے کیا:

''منفی انداز کی تنقید کرنے والوں میں ایک نام ایسا بھی تھا جس نے اس کتاب کے انہدام کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور میں سمجھتا ہوں کہ موصوف نے یہ کام ایک مخالف گروہ کے ایما پر کیا جسے ڈر تھا کہ ایک نئے ادیب کا نام کہیں ان پر سبقت نہ لے جائے! مگر حیرت کی بات بلکہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اُدھر اس کتاب کی مخالفت ہوتی رہی اور ادھر یہ کتاب دھڑا دھڑا چھپتی رہی۔''

(پیش لفظ، از شاہد شیدائی، اردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۹)

اس کتاب کی اہمیت و ضرورت اس کارن بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ وزیر آغا نے اردو شاعری کو سیاسی و معاشی سطح پر جانچنے کی بجائے تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی سطح پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ بقول شہزاد احمد، اس کتاب میں وزیر آغا نے یہ نیا سوال اٹھایا ہے کہ شاعری کو تہذیبی و ثقافتی پس منظر میں دیکھنا ممکن ہے اور پھر ثابت کیا ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں مستحسن بھی ہے۔

اس کتاب کا غائر مطالعہ قاری پر یہ بھی آشکار کرتا ہے کہ کتاب انتہائی عرق ریزی اور سال ہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے کہ جس میں مصنف نے اردو شاعری کے مزاج کو متعین کرتے کرتے ہندوستان کی تقریباً پانچ ہزار سالہ تاریخ و تہذیب کا جائزہ بھی لے ڈالا ہے۔ بقول مصنف یہ کتاب پانچ سال کی کوشش پیہم کا نتیجہ ہے۔ جس میں متعدد زرخیز ذہن مسلسل ان کی معاونت بھی کرتے رہے۔ ان میں عارف عبدالمتین، وجیہہ الدین احمد، میرزا ادیب، جمیل ملک، سید جعفر طاہر، رحمان مذنب، ڈاکٹر سہیل بخاری، غلام جیلانی اصغر، عصمت اللہ، سجاد نقوی، اور انور سدید کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری کا اس سے قبل جو بھی جائزہ لیا گیا وہ سیاسی و سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا اور تہذیبی و ثقافتی پس منظر کو بالائے طاق رکھ کر اس سے پہلو تہی کی گئی جو اس کی تکمیل کا بنیادی محرک ہے اس کا ثبوت ڈاکٹر وزیر آغا کی ۲۱ مارچ ۱۹۶۵ء کی ایک تحریر سے یوں ملتا ہے۔

''یہ کتاب کسی اضطراری جذبے کی پیداوار نہیں، اس کا خیال کم و بیش دس برس پہلے میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے کئی ایک محرکات تھے۔ مثلاً ایک یہ احساس کہ اردو شاعری کی تینوں بنیادی اصناف (یعنی گیت، غزل اور نظم) کا فرق محض ہیئت کے فرق تک محدود نہیں اور ان میں سے ہر صنف مزاجاً بھی دوسری اصناف سے مختلف ہے۔ دوسرا احساس یہ تھا کہ اردو میں اصناف شعر کا مطالعہ کسی خاص دور کے سیاسی و سماجی پس منظر کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے لیکن ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔''

(اختتامیہ، از وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۱۳)

زیر بحث کتاب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ اردو شاعری کے پس منظر اور دوسرا اردو شاعری کے مزاج پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں مصنف نے اردو شاعری کا مزاج متعین کرنے کی غرض سے برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ مصنف کے خیال میں ثقافتی پس منظر بھی ہموار نہیں ہوتا بلکہ یہ دو مختلف سطحوں سے متشکل ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے پس منظر میں بھی یہ دونوں سطحیں اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ پہلی سطح جسمانی تصادم کی عکاس ہے، جس میں مختلف نظام باہم برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ ان دونوں سطحوں کو اس کتاب میں مختلف مثالوں اور تاریخی حوالوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ مصنف کے بقول یہ دونوں سطحیں متوازی نہیں بلکہ ایک دوسرے میں پیوست ہوتی ہیں جس سے ہویت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پہلی سطح پر دراوڑ اور آریا کے تصادم کی شکل میں جب کہ دوسری سطح پر مادری اور پدری تہذیب کی آویزش کی شکل

میں سامنے آئی ہے۔ جس کی وضاحت "ثنویت کے چند روپ" کے عنوان کے تحت کتاب میں کر دی گئی ہے۔ اور جو پہلو وضاحت طلب تھے انہیں "ین اور یانگ" کی ذیل میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ "ین اور یانگ" کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا تحریر کرتے ہیں۔

"چینیوں کے مطابق ین (Yin) اس کیفیت کا نام ہے جس میں ہر شے جامد اور ساکن ہو جاتی ہے اور یانگ وہ کیفیت ہے جس میں ہر شے بے قرار اور مضطرب ہو جاتی ہے۔"

(وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵)

اسی خیال کو بنیاد بناتے ہوئے مصنف نے دراوڑوں اور آریاؤں کے باہمی تصادم کو "دو تہذیبوں کی آویزش" کے تحت بیان کیا ہے جس سے برصغیر "ین" کی کیفیت کو خیر باد کہہ کر "یانگ" سے متعارف ہوا، جس کارن یہاں کی دھرتی کے دو رخ سامنے آئے ایک وہ جو اس کے بنیادی اوصاف سے عبارت ہے جس میں اس کی باس، ذائقہ اور خنکی از خود منتقل ہو کر قائم رہتی ہے جبکہ دوسرا رخ بیرونی اثرات کے تحت ابھرتا ہے دیکھا جائے تو شاعری دھرتی کے بنیادی اوصاف کی عکاسی بھی کرتی ہے اور بیرونی اثرات کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ کتاب کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ پہلے پہل ٹھہراؤ کی شکل میں تھا لیکن جیسے قبائل اس میں ضم ہوتے گئے اس میں تموج کی لہریں نمودار ہوئیں جنھوں نے تین طرح سے اظہار پایا۔ پہلی لہر کی صورت بت پرستی کا عمل تھا۔ اس عمل نے خود کو گیت اور گیت نما شاعری میں ظاہر کیا۔ تموج کی دوسری لہر انفرادیت کے نمو کا اظہار تھی اور اس نے خود کو غزل میں آشکار کیا جو جزو اور کل کے وقتی فراق کا نتیجہ تھی اور تموج کی تیسری لہر جو انفرادیت کے مکمل طور پر وجود میں آنے پر ظہور پذیر ہوئی اس نے خود کو نظم کی شکل میں پیش کیا۔

کتاب کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے شاعری کا مزاج متعین کرتے ہوئے گیت، غزل اور نظم کے تدریجی ارتقاء کو اس طرح پیش کیا ہے کہ جس سے برصغیر کی ثقافت اور تہذیب کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو اس بات کا غماز ہے کہ ہر ثقافتی اور تہذیبی ارتقاء اور اردو شاعری کے ارتقاء سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے بلکہ یہ باہم پیوست ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں نہ صرف اردو غزل، گیت اور نظم کا مزاج متعین کیا ہے بلکہ ان اصناف کی روایت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً گیت کی روایت بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس کی شروعات پرتھوی راج کے عہد میں تلاش کی ہیں جب محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو شکست دی تو اس عہد میں ہندی شاعر چند بردائی نے "پرتھوی راج راسا" تحریر کی۔ اس کے جو اہم نام منظرِ عام پر آتا ہے وہ امیر خسرو کا ہے جس کی تخلیقات کا زمانہ تیرہویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور چودھویں صدی عیسوی کا ربع اول ہے۔ چندرہویں صدی عیسوی میں کبیر اور میرا بائی کے بعد دکنی عہد میں محمد قلی قطب شاہ برہان الدین جانم، عبداللہ قطب شاہ وجہی، غواصی، علی عادل شاہ اور میراں جی ہاشمی نے اسے پروان چڑھایا۔ ولی نے سترہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں اور بعد میں دہلی کے شعرا جن میں آبرو، حاتم، ناجی، مضمون اور مرزا جان جاناں کا نام سرِفہرست ہے، کا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے۔

جبکہ انیسویں صدی عیسوی میں "اندر سبھا" میں امانت لکھنوی اور پارسی تھیٹریکل کمپنیوں پر دکھائے جانے والے ڈراموں نے اہم کردار ادا کیا، گیت کے ارتقاء کے سلسلے میں اگلا قدم عظمت اللہ خان کی "سریلے بول" نے اور بعد میں اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ بیسویں صدی میں میراجی، قیوم نظر، قتیل شفائی، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجید امجد، منیر نیازی، ضمیر اظہر اور ناصر شہزاد کے نام بطورِ خاص تحریر کیے ہیں۔

بعینہٖ وزیر آغا نے اردو غزل کا مزاج متعین کرنے کے بعد اردو غزل کی روایت کو اس کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ مصنف نے غزل کی روایت دکنی دور سے شروع کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو اس کے مزاج میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں ان کا احاطہ بھی بطورِ خاص کیا ہے محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور شاہی کی غزلوں کی مثالوں سے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس عہد میں غزل پر ہندی گیت کے اثرات نمایاں ہیں، جس میں عورت کے جذبات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ولی کی غزل جو دکنی اور دہلی غزل کے سنگم پر ہے۔ اس میں بت پرستی اور سراپا نگاری کی روایت موجود ہے تو دوسری طرف تشبیہ اور استعارے کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ اردو غزل کی اس داستان کو بیان کرتے ہوئے آغا صاحب نے چار ابواب گنوائے ہیں۔ پہلا باب دکنی غزل سے متعلق ہے، دوسرا باب اٹھارہویں صدی کی ابتداء سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک، تیسرا باب ۱۸۵۷ سے لے کر اقبال تک اور چوتھا باب اقبال کے بعد جدید دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ان تمام ادوار میں غزل کے دو رنگ نمایاں ہوئے ہیں۔ ایک رنگ خالص تخیل اور ذہنی تحرک کا ہے اور دوسرا دھرتی سے لگاؤ اور بت پرستی کو اختیار کرنے کا ہے۔

آخر میں نظم کا مزاج متعین کیا ہے جس میں آغا صاحب کا خیال ہے کہ نظم بنیادی طور پر استخراجی طریقہ کار کی بجائے استقرائی طریقہ کار اختیار کرتی ہے۔ نظم کی روایت کا آغاز بھی اردو غزل کی روایت کی مانند دکنی دور سے ہوتا ہے۔ دکنی نظم مثنوی، قصیدے اور مرثیے کے روپ میں نمودار ہوئی۔ دکنی دور کو وزیر آغا نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور چودھویں اور پندرہویں صدی پر مشتمل تھا اس دور میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، نظامی اور آذری کا کام زیادہ اہمیت کا حامل ہے اس دور میں تصوف اور مذہب کو منظوم کرنے کا رواج زیادہ نمایاں ہے۔ دوسرا دور سولہویں اور سترہویں صدی پر محیط ہے۔ اس دور میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہ، میراں ہاشمی، نصرتی، وجہی، غواصی، مقیمی، جنیدی، شوقی، رستمی، اور ابن نشاطی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظم کا اگلا دور اٹھارہویں صدی سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس دور میں مثنوی کو زیادہ نمائندگی ملی اور ساتھ ساتھ مدح، ہجو اور مرثیے نے بھی اپنے قدم جمائے اس کے بعد سودا، نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، آزاد اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، اکبر الہ آبادی، اور اقبال تک طویل سلسلے کا ذکر کر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء اور اس کے بعد کے تمام نظم گو شعراء کو وزیر آغا نے اردو نظم کی روایت کے ضمن میں بیان کر دیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب کے آخر میں "حاصلِ مطالعہ" کے عنوان کے تحت، گیت، غزل اور نظم کے مزاج پر جامع گفتگو کی ہے جس سے قاری کو شاعری کے مزاج سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں دیگر کئی معرکتہ آرا کتب تخلیق کیں۔ ان میں "اردو شاعری کا مزاج" تحقیق و تنقید کے میدان میں ایک لازوال کتاب تصور کی جاتی ہے جس کا ذکر پروفیسر جمیل آذر کے اس بیان سے بھی ملتا ہے۔

"اردو ادب میں طنز و مزاح پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی یہ ان کا پہلا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ تھا اس کے بعد ان کی معرکتہ آرا کتاب "اردو شاعری کا مزاج" تھی۔ جس نے مباحث کے نئے ابواب وا کیے۔"

(پروفیسر جمیل آذر، وزیر آغا ایک دبستان، مشمولہ، اخبار اردو، اسلام آباد، شمارہ ۱۰، ۲۰۱۰ء)

اپنی تمام تر مخالفت کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ بحث کتاب اپنے موضوع کی وسعت اور تنقیدی و تحقیقی گہرائی کے کارن اردو شاعری کی تنقیدی روایت میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور آنے والے عہد میں اردو ادب کے طالب علم جب بھی شاعری کا مطالعہ ہندوستان کے ثقافتی، تہذیبی اور سماجی پس منظر میں کرنے کی سعی کریں گے تو اس کتاب سے دامن بچانا ان کے لیے ناگزیر ہوگا۔

❖OOO❖

وزیر آغا کے انشائیہ ''پگڈنڈی'' کا تجزیہ

سمیعہ شاہنواز
شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا

ایک جدید صنف نثر کی حیثیت سے اردو انشائیے کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنایا انھوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر انشائیے لکھنے کا باقاعدہ آغاز کیا اور خاصی بڑی تعداد میں ایسے انشائیے لکھے جو جدید انشائیے کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ انشائیے کی ترویج میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل ہے انھوں نے صنف انشائیہ پر تنقیدی معیارات کا تعین بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیوں پر مبنی پہلی کتاب '' خیال پارے'' کے عنوانات سے چھپے جو ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آئی۔ جو''اردو کے بہترین انشائیے'' کے پیش لفظ میں جمیل آذر بیان کرتے ہیں کہ:

> '' ڈاکٹر وزیر آغا پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انشائیہ کے عناصر ترکیبی اور اس کی روح کو دریافت کیا۔ ۱۹۶۱ء میں اردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ '' خیال پارے'' شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی'' اردو ادب'' میں انشائیہ کی باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔''

'' پگڈنڈی'' کی خصوصیات اور تجزیہ انشائیہ کے اصولوں کے مطابق کیا جائے گا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کی بنیادی خصوصیات میں طنز ومزاح، شاعرانہ تخیل، نفسیاتی تجزیہ، منظر نگاری، امیجز کا استعمال، انکشاف ذات، تنقیدی رویہ، معنی آفرینی، اور فطرت نگاری شامل ہیں۔

وزیر آغا علامتی اسلوب کے پیرائے میں انشائیہ لکھتے ہیں۔ اسی طرح وزیر آغا نے انشائیہ'' پگڈنڈی'' کو بھی علامتی طور پر لیا ہے۔'' پگڈنڈی'' کو علامت بنا کر وہ دو تین باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں وہ انسان بننے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس میں فرق بتاتے ہیں۔ انسان کو سڑک نہیں '' پگڈنڈی'' اختیار کرنی چاہیے۔ پھر وہ معاشرے کے دوسرے چند افراد کے نام گنوا کر الگ کر دیتے ہیں ان میں بابو لوگ تہذیب اور قانون کے کارندے ہوتے ہیں۔ سڑک تو سیدھی چلتی ہے یہ انسان میں تحرک نہیں پیدا کر سکتی اسی لیے انسان کو پگڈنڈی اختیار کرنی چاہیے کہ اس میں تحرک پیدا کرے۔ سڑک آپ کو راستہ دکھاتی ہے لیکن پگڈنڈی کو آپ خود راستہ دکھاتے ہیں اور سہارا دیتے ہیں۔ پگڈنڈی پر دوسرا مشورہ یہ دیتے ہیں کہ پگڈنڈی پر چلنے سے پہلے گھڑی کو خیر باد کہہ دیں بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن دراصل یہ ایک انقلابی قدم ہے اسی لحاظ سے وہ لکھتے ہیں:

> پگڈنڈی اختیار کرنے سے قبل میں ہمیشہ سب سے پہلے اپنی گھڑی کو خیر باد کہتا ہوں اور اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے گویا منٹوں اور گھنٹوں کا ایک مصنوعی بوجھ تھا جو میرے شانوں سے اتر گیا ہے اور میں سبک خرام تازہ دم اور ہلکا ہو گیا ہوں۔''

پگڈنڈی کو علامتی طور پر اپناتے ہوئے کہتے ہیں کہ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے خاموشی اختیار کریں اس سے ایک تو آپ فطرت کے پراسرار ماحول میں جھانکنے لگتے ہیں اور دل کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ اس انشائیے میں وزیر آغا کہتے ہیں کہ معاشرے کے لگے لپٹے اصول پر چلنے کی بجائے اپنی منزل کو خود تلاش کیا جائے اور جب منزل خود تلاش کرنی ہو تو گھڑی کو خیر باد کہہ دیا جائے یہ آپ کے پاؤں میں زنجیروں کا باعث بنتا ہے اور خاموشی کو اپنایا جائے شور نہ کیا تو فطرت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ انشائیے کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے اپنے انشائیوں میں برتنے کی کوشش کی ہے اور وہ زندگی کے جدید ثقافتوں سے بھی واقف ہیں۔ انشائیہ کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اسے طنز و مزاح سے الگ رکھا جائے لیکن اس سلسلے میں وزیر آغا کہتے ہیں:

> '' انشائیہ میں مزاح یا طنز کی آمیزش اسلوب کا ایک زاویہ ہے اور اس سے اکثر و بیشتر تحریر میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے، میرے بیشتر انشائیوں میں مزاح بھی ہے اور طنز بھی لیکن اس فراوانی کے ساتھ نہیں کہ انشائیہ دب کر رہ جائے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ'' پگڈنڈی'' میں اپنے استاد جی کے اس مقولے پر'' راہ راست برو گرچہ دور است'' پر طنز کرتے ہیں اور انہیں بدذوق کہتے ہیں اور بہت احسن طریقے سے انشائیہ پگڈنڈی میں آگے بڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انسان کو پگڈنڈی اختیار کرنا چاہیے۔

دوسری جگہ پر وزیر آغا فوج کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر پگڈنڈی اختیار کر بھی لیں تو وہ سڑک پر چلنے کے مترادف ہے۔ تیسری جگہ پر وزیر آغا طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کچھ لوگ سڑک سے پگڈنڈی کی طرف چلنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن اپنے قفس کی تیلیوں سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ انہیں پگڈنڈی کی دنیا راس نہیں آتی۔ انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ قاری کو زندگی کے وہ مناظر دکھاتا ہے جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔

> '' سڑک کو تو ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے ہوئے قدموں نے روند روند کر سیدھا کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ جب آپ بھی ان قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں تو سڑک کی ہیئت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔''

تازگی سے مراد موضوع کا وہ انوکھا پن ہے جو قاری کو زندگی کی یکسانیت سے اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔

> '' جب بھی ہم اس سڑک پر سے اترنے کی کوشش کرتے ہیں تو سماج کا گلہ بان ہمیں ملامت اور پھر درشتی سے ٹوک دیتا ہے اور ہم جلدی سے مڑ کر سیدھی سڑک پر بڑھتے ہوئے گلے میں کھو جاتے ہیں۔''

اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد قاری اس کے اشارات کا سہارا لے کر محظوظ ہوتا ہے۔

> '' آہستہ روی کی عادی ڈالیں اور بڑے مزے سے خراماں خراماں بڑھتے چلے جائیں چاہیں تو کسی پتھر یا گھاس کے قطعے پر بیٹھ جائیں۔ چاہیں تو کسی گھنے چھتنار کے نیچے لیٹ کر سبز پتوں کی کائنات میں کھو جائیں۔''

> '' درختوں سے خود کو بچا کر، چٹانوں سے کترا کر، کھیتوں کو چیر کر، ہر قسم کی نشیب وفراز سے ہم کنار ہوتی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔''

> '' کسی ذی روح کا سہارا لیے بغیر خراماں خراماں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔''

جہاں تک انشائیہ کی اصطلاح اور اس کے فنی رموز و نکات کی وضاحت کی بات ہے خود ڈاکٹر وزیر آغا نے وقفے وقفے سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

'' انشائیہ تو شے یا مظہر کے اندر غواصی کر کے اس مخفی مفہوم تک پہنچنے کا ایک عمل ہے۔''

(انشائیہ کیا ہے؟ تنقید اور احتساب ص۲۱۲)

انشائیہ پگڈنڈی میں روانی اور شعریت پائی جاتی ہے۔

'' چلتی ہے، رکتی ہے، مڑتی ہے، سیدھی ہوتی ہے پھر یکلخت مڑ جاتی ہے۔''

'' سڑک آپ کو راستہ دکھاتی ہے، منزل کا نشان بتاتی ہے،

ہمرائیوں کا سہارا دلاتی ہے"
درج ذیل فقروں میں روانی پائی جاتی ہے۔
"آسمان کی بے کنار وسعتیں ہیں، نیچے زمین کا فراخ سلیقہ ہے آپ کے ہاتھ میں چھری اور لبوں پر سیٹی ہے"
"ہنسنے رونے گانے یا بآواز بلند گفتگو فرمانے کی کوشش نہ کریں۔"
اس انشائیے میں منظر نگاری کا بھی استعمال ہوا ہے۔
چند ہی لمحوں کی خاموشی کے بعد چھوٹی جھاڑیوں غاروں اور گھاس کے قطعوں سے متجسس نظریں جھانکنے لگتی ہیں اور جگہ جگہ سرسراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔
تابع مہمل کا استعمال ہوا ہے۔ تر شا تر شایا، ڈھلی ڈھلائی، حروف عطف طویل و عریض، پیچ و خم، رحم و کرم، شور و شغب
پگڈنڈی انشائیے میں تکرار لفظی کا استعمال ہوا ہے، روند روند، خراماں خراماں، قریب قریب، چلتے چلتے، قدم قدم، تک تک، ابھی ابھی۔

انشائیے کی تعریف کرتے ہوئے وزیر آغا کہتے ہیں
:"انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے"
محولہ بالا تعریف کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں اسلوب کی تازہ کاری، معانی کے نئے حقائق اور انسانی شعور کی جہتیں پائی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیے ہمارے تہذیبی شعور کو جلا بخشتے ہیں۔ ان کے نزدیک انشائیہ نہ صرف زندگی کے اسرار و رموز کا غماز ہے بلکہ اس متحرک کا اشاریہ بھی ہے کہ جو زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔

وزیر کوٹ

جڑا ہوا ہے
پیڑ کی طرح زمین سے
لدے پھندے ہیں شاخچے پھلوں سے
زندگی کے رس بھرے پھلوں سے
رس بھرے پھلوں کی ایک قاش بھی
جسے نصیب ہو
وہ جی اٹھے
وہ جگمگا اٹھے

خود اپنی لہروں کا فریفتہ
سگند پانی رو کتا
زمیں کے ریشے ریشے میں
لہو کی طرح پانی کو اتارتا
طرح طرح کی خوشبوؤں کو
نافۂ زمین سے نکالتا
زمیں کے زنگ کو اتارتا
زمیں کے رنگ کو نکھارتا ہے

گوندھتا ہے
گل بھرون کو
ڈھالتا ہے
اجنبی، نئے نئے ظروف میں
ہزار خوشبوؤں بھرے حروف میں
حروف سے
یہ کیسا رس کے آ رہا ہے ڈکھ
کوئی تو سخت چوٹ ہے
لگا ہیں گیلی کر کے
کس کا نام لے رہے ہو
کس طرح کی چپ ہے
شب کی جھونپڑی میں
شب کی جھونپڑی میں
کس طرح کا شور ہے

ہر ایک شے میں
بے پناہ میل،
بے پناہ کھوٹ ہے
خود اپنے آپ میں سفید
اپنے آپ میں ہرا
حروف کے سیاہ دشت میں
الگ تھلگ کھڑا
وزیر کوٹ ہے !!

اقتدار جاوید

بیاد ڈاکٹر وزیر آغا

تھے وزیر آغا ادیب و شاعر عالی نشاں
ذات تھی جن کی ہمیشہ مرجع دانشوراں
اُن کے جانے سے نہ کیوں ہوں اہلِ دانش سوگوار
سب کے دل پر نقش ہے اُنکی محبت کا نشاں
گلشنِ اردو میں جس کی ذات تھی مثلِ بہار
اُس کے جانے سے یکایک آ گئی فصلِ خزاں
جملہ اربابِ نظر ہیں رنج و غم سے مضمحل
ہو نہیں سکتا کبھی پورا ادب کا یہ زیاں
شخصیت تھی اُن کی اپنے آپ میں اک انجمن
یاد ہیں سب کو ابھی تک ان کی بزم آرائیاں
جس کا طرزِ فکر تھا آئینۂ نقد و نظر
جس کا انداز بیاں بیحد شگفتہ اور رواں
جس کو نظم و نثر پر حاصل تھی یکساں دسترس
جس کی تحریروں سے ہے سرمست ہر پیر و جواں
جس کے علم و فضل کے ہیں معترف اہلِ نظر
صفحۂ تاریخ پر ہے ثبت جس کی داستاں
تھے وہ برقی اس صدی کے ایک فخرِ روزگار
مٹ نہیں سکتے کبھی اُن کے نقوشِ جاوداں

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی (انڈیا)

ایک قطعہ وزیر آغا کے لیے

ستونِ اردو لرز رہا ہے نہیں رہے اب وزیر آغا
جسے بھی اردو سے کچھ شغف ہے وہ نام سے اُن کے ہے شناسا
نقوش ہیں لازوال اُن کے تمام اصنافِ فکر و فن میں
سبھی کو ہے اعتراف اس کا ادب کے مُحسن تھے وہ سراپا

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی (انڈیا)

❖OOO❖

وزیر آغا کی نظم Astral Feeling کا تجزیاتی مطالعہ

فیصل ہاشمی۔ ناروے

Astral Feeling

چلا کہاں سے رُکا کہاں پر
وہ کیسا خم دار
سلوٹوں سے بھرا سفر تھا
پہاڑ رستے میں بچھ گئے تھے
پرند بھی ہم سفر نہیں تھے
نہ جانے کب میں زمیں سے اڑ کر
فلک کے ان دیکھے راستوں پر نکل گیا تھا
ہوا کے ساگر نے
مجھ کو اوپر اٹھا لیا تھا
زمیں کی گُڈری کے سارے پیوند
اپنے اندر سمٹ گئے تھے
ستارے اب میرے روبرو تھے
ستارے، جیسے کروڑوں اربوں اُبکتے جگنو
کہ دور لرزاں!
مگر ستارے بھی ہولے ہولے
سمٹ رہے تھے
سفر نے بے انت روشنی کا
سفید چوغہ پہن لیا تھا
کوئی بھی رستہ نہیں بچا تھا
سفر حدودِ سفر سے
آزاد ہو گیا تھا!!!

وزیر آغا کی نظم Astral Feeling کی خوبی ایک انوکھا استعاراتی نظام ہے۔ اس نظم میں جو علامتیں پیش کی گئی ہیں، اُن میں ایک انوکھی اور اچھوتی بات یہ ہے کہ وہ احساس کی سطح پر ایک پل کے لیے بھی جامد نہیں ہوتیں، وہ برابر حرکت پذیر رہتی ہیں۔ علامت کا حرکی تصور کہ اسے احساس کی سطح پر بھی مکمل گرفت میں نہیں لیا جا سکتا، میرے خیال میں نظم نگاری کے ایک نئے در کا وا ہونا ہے۔ وزیر آغا کی یہ نظم ایک اعلیٰ ترین فن پارہ ہے۔

نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

چلا کہاں سے رُکا کہاں پر
وہ کیسا خم دار
سلوٹوں سے بھرا سفر تھا
پہاڑ رستے میں بچھ گئے تھے
پرند بھی ہم سفر نہیں تھے

ایسا کہتے ہیں کہ انسان دُور اور نزدیک کے عین درمیان، ایک محدود فاصلے (range) میں مقید ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مظاہر اور اشیا اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ عام حالات میں ایک شاعر بطور ناظر سامنے کی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر کبھی کبھی وہ ناظر کی حیثیت کو منظور کی حیثیت میں تبدیل کر کے خود کو ایک ایسے ناظر کا روپ دے دیتا ہے جو اپنے آپ کو منظور کے طور پر دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جب انسان خود سے باہر نکل کر اپنے آپ کو دیکھنے پر قادر ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ AstralFeeling سے آشنا ہوا ہے۔

اس نظم میں شاعر ایک ایسے سفر پر روانہ ہوا ہے جہاں وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی ہم سفر نہیں، پہاڑ اس کے رستے میں بچھ گئے ہیں اور وہ کائنات کی وسعتوں میں مظاہر کا نظارہ کرتا ہے۔ جیسے ہی وہ اس range کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) کہ وہ زماں کے حوالے سے کسی ایک لمحے میں اور مکاں کے حوالے سے کسی ایک مقام پر موجود ہوتا ہے...... اسے انسانی شعور کا دائرہ کہہ لیں! جب وہ اس دائرے کو عبور کرتا ہے یا اس کے مرکز میں سمٹ جاتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے کیوں کہ اس دائرے سے باہر آتے ہی چیزیں اور مظاہر اپنی صورتوں کو چھوڑ کر لکیروں اور ساختوں (structures) میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ شاعر نے اس کیفیت کو نظم میں یوں بیان کیا ہے۔

ہوا کے ساگر نے
مجھ کو اوپر اٹھا لیا تھا
زمیں کی گُڈری کے سارے پیوند
اپنے اندر سمٹ گئے تھے

یوں صورتوں کی اس محدود دُنیا کے پیچھے موجود، وہ ساخت دکھائی دینے لگتی ہے، جو عام زندگی میں نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ دوسری جانب یہی حال چیزوں یا مظاہر کو بہت قریب سے دیکھنے پر سامنے آتا ہے۔ صورتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور "پیٹرن" اُبھر آتا ہے۔ انسان خود کو "موجودگی" کے روبرو پاتا ہے۔ عارفانہ تجربے میں عارف، زندگی کی مقررہ دوری سے باہر آ کر کائنات کو یا تو بہت فاصلے سے دیکھتا ہے یا پھر بہت قریب سے، پہلی صورت Astral Feeling سے آشنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں "موجودگی" سے جو رشتوں سے عبارت ہے اور جس میں صورتیں معدوم نہیں ہوتیں، وہ ایک انوکھی تابندگی کا مظہر بن جاتی ہیں۔ اب یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عارفانہ تجربے کے دو پہلو ہیں: ایک وہ جس میں موجود باقی نہیں رہتا، صرف "وجود" کی حکومت ہوتی ہے، دوسرا پہلو وہ جس میں "موجود" اپنے اندر کے پیٹرن کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ صورتیں مٹتی نہیں، وہ ایک عجیب سی روشنی میں نہا جاتی ہیں۔ متقدم الذکر تجربہ، عارف کا ہے جب کہ موخر الذکر ایک فن کار کا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی اپنے تجربے کی ترسیل نہیں کر سکتا، وہ ذاتِ لامحدود میں جذب ہو جاتا ہے جب کہ فن کار حقیقتِ عظمیٰ کے تخلیقی عمل کے تتبع میں خود بھی ایک تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ستارے اب میرے روبرو تھے
ستارے، جیسے کروڑوں اربوں اُبکتے جگنو
کہ دور لرزاں!
مگر ستارے بھی ہولے ہولے
سمٹ رہے تھے
سفر نے بے انت روشنی کا
سفید چوغہ پہن لیا تھا
کوئی بھی رستہ نہیں بچا تھا
سفر حدودِ سفر سے
آزاد ہو گیا تھا!!!

اب نظم اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہے جو تخلیقی عمل کا بھی آخری مرحلہ ہے۔ یہاں بے انتی میں تخلیق کار کو روشنی نظر آتی ہے جس تک پہنچنے کے لیے اس نے یہ سارا سفر اختیار کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر سفر کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، ساری سمتیں، چاروں کھونٹ، ساتوں طبق، ایک ایسے نقطے پر مرتکز ہوتے ہیں جو بے کراں بھی ہے اور لازوال بھی۔ گو شاعر نے روشنی کے مسکن کی طرف یعنی آسمان کی جانب سفر کیا ہے مگر یہ اس کی آخری منزل نہیں، یہاں سے تو مراجعت کا سفر شروع ہوتا ہے کیوں کہ حقیقت میں آخری منزل کوئی نہیں۔

نظم کی ایک اور جہت جو اسے منفرد، گہری، تہ دار اور اہم بناتی ہے، یہ ہے کہ یہ نظم، ایک ایسی فلم کے مانند ہے جو اپنے پہلے ہی سین یعنی پہلے ہی مصرعے Flash Back میں چلی جاتی ہے۔ شاعر جس مقام سے یہ سفر شروع کرتا ہے، درحقیقت یہ وہی مقام ہے جہاں سفر، حدودِ سفر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی "نشانِ پا" یا "میل کا پتھر" نہیں لگا جو بتائے کہ وہ کہاں سے چلا اور کہاں رکا۔ "سفر" اس نظم کا کلیدی استعارہ ہے۔ یہ قوس کا سفر ہے، جس میں خم ہے، موڑ ہے، اپنے ازل کی طرف لوٹنے کا انداز ہے، مسافر کی منزل خود اس کے اندر موجود ہے اور وہ ہر وقت اپنی ہی جانب لوٹ رہا ہے۔

وزیر آغا کی یہ نظم اپنے اندر معنیاتی تفہیم کی وسیع کائنات رکھتی ہے اور متن (Text) کی تہ در تہ شعریات اس نظم کو ایک نادر تخلیق بناتی ہے۔

❖○○○❖

ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری ایک مطالعہ

مفتی عزیز اللہ جلالی

0313-7664153

سرزمین سرگودھا ادبی اعتبار سے فطری طور پر نہایت زرخیز واقع ہوئی ہے۔ اس زمین نے بے شمار ایسی شخصیات کو جنم دیا ہے۔ جو آسمان علم ودانش میں درخشندہ ستارے بن کر ظاہر ہوئے۔ انہیں نجوم آگہی میں ایک "ماہ تاباں" کا نام "ڈاکٹر وزیر آغا" کے عظیم نام سے موسوم کیے گئے۔ یہ ایک ایسا نام ہے، جس نے "سرگودھا" کا نام پوری دنیا میں اس وقت متعارف کروایا جب ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اب تو ذرائع ابلاغ میں اتنی تیزی اور وسعت آگئی ہے کہ ایک بات منہ سے نکلی دوسرے ہی لمحہ پوری دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ جب کہ جس دور میں ڈاکٹر وزیر آغا نے "سرگودھا" کا نام پوری دنیا میں متعارف کروایا یہ وہ دور تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی آبائی گاؤں سے شہر سرگودھا تک پہنچنے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہوتے تھے جب کہ مسافت کم وبیش تیس کلومیٹر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ولادت 18 مئی 1922ء سرگودھا کے مضافات میں چک نمبر 56 جنوبی المعروف "وزیر کوٹ" میں ہوئی۔ شہر سے دور افتادہ علاقہ میں جنم لینے والا، جس نے ابتدائی تعلیم بھی دیہاتی مدارس میں ہی حاصل کی تھی۔

علامت پسند شاعری:

ڈاکٹر وزیر آغا ایک علامت پسند شاعر واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری میں اشارات واستعارات کی فراوانی پائی جاتی ہے اس کے باوجود غلو کا شکار نہیں ہوتے۔ یعنی اشارات واستعارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنے کا رجحان نہیں ملتا۔ علامت پسند شاعر ہونے کے باوجود علامت پسندوں کی طرح انتہا پسند نہیں ہیں۔ اسی لیے بعض کم ظرف حضرات نے ان سے اختلاف کیا۔ ان کو دل ودماغ میں جگہ دے کر سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

میدان ادب کے شاہکار:

ادب کی دو اقسام ہیں۔ نثر اور نظم ڈاکٹر وزیر آغا ادب کے دونوں سمندروں کے کامیاب پیراک ہیں۔ وزیر آغا اردو کے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے نہ صرف تنقید بلکہ شاعری کی دونوں اصناف یعنی نظم اور غزل میں ایک دوسرے سے بڑھ کر غیر معمولی صلاحیت کا ہی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ بھرپور طریقے شاعر عظیم اور ادیب ونقاد بے بدل ہونے کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔ میدان ادب میں ایسی ہمہ جہتی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی ایسا مقام صرف اور صرف چند مخصوص شخصیات کا حصہ ہوتا ہے۔ انہیں چند مخصوص شخصیات میں ایک شخصیت کا نام "ڈاکٹر وزیر آغا" ہے۔ بعض شخصیات کو اللہ تعالیٰ "ابوالوقت" ہونے کا مقام عطا فرماتا ہے۔ ایسی شخصیات میں سے ایک شخصیت جو "ابوالوقت" کہلانے کی حقدار ہے وہ ہیں "جناب ڈاکٹر وزیر آغا" جنھوں نے غالب اور مروجہ شاعرانہ معمول کے برعکس نظم سے غزل کی طرف مراجعت کی ہے۔ اور یہ مراجعت کوئی ایسے ہی غیر ارادی طور پر وارد نہیں ہوئی بلکہ اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اپنی ذاتی سوچ پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوئے مراجعت کی طرف قدم بڑھایا۔ جس کی وجہ سے آپ کی متوازن اسلوب اور موضوع کی غزل اسی شاعرانہ شاہکاری کا نتیجہ ہیں

اکمال فن وشعور:

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ہر ذرے کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ کچھ شعراء کا کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں الجھاؤ موجود ہوتا ہے لیکن "ڈاکٹر وزیر آغا" کو اللہ تعالیٰ نے ایسی خصوصیات سے نواز رکھا تھا کہ ان کا کلام موجودہ انسانی صورت حال کے شعور اور فنی تکمیلیت کا خوبصورت امتزاج پیش کرتا ہے۔

انسان دوستی اور امن پسندی:

انسان دوستی اور امن پسندی ڈاکٹر وزیر آغا کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خوب صورت طریقہ سے ودیعت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فضیل جعفری یوں رقمطراز ہیں کہ

"وزیر آغا کی انسان دوستی اور امن پسندی کا رویہ دراصل ایک فرد کی حیثیت سے اس حقیقت کے اثبات واقرار کا رویہ ہے۔ کہ تمام تر دکھ، درد اور آلام ومصائب کے باوجود زندگی خدا کی طرف سے بخشی ہوئی ہے۔ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کی بے حرمتی نہ صرف کفران نعمت بلکہ ایک ناقابل تلافی گناہ کے مماثل ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک مسلسل ارتقاء پذیر تجربے کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی لیے وہ فنی سطح پر انسان کی ایک مستقل اور ابدی شناخت بھی قائم کرنا چاہتے۔"

یہ ایک سرد جھونکا، جسے تم نے آوارہ پنچھی کہا ہے
یہی زندگی ہے
اسی سرد جھونکے سے دنیا بنی ہے

یقین، موت، تخیل، زندگی وغیرہ کا وجود:

ڈاکٹر وزیر آغا کے کلام میں جابجا یقین، تخیل، موت، زندگی کا وجود ملتا ہے۔ جس کے بارے میں فضیل جعفری یوں لکھتے ہیں:

"یقین اور بے یقینی، امید اور ناامیدی، موت اور زندگی، تخیل اور حقیقت کی ثنویت ان کی کئی نظموں کا موضوع ہے۔ لیکن ان موضوعات کو انہوں نے سب سے زیادہ فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنی نظم "سمندر اگر میرے اندر گرے" میں برتا ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

یہ ہونے نہ ہونے کی میٹھی اذیت بھی کیا ہے
نگاہیں اٹھاؤ تو حدِ نظر تک
ازل اور ابد کے ستونوں پہ باریک سا ایک خیمہ تنا ہے
(نہ ہونے کا یہ روپ کتنا نیا ہے)
اور خیمے کے اندر
کروڑوں ستاروں کا میلہ لگا ہے
(یہ نہ ہونے کا بہروپ لا انتہا ہے)
مرا جسم
ریشم کا صد چاک خیمہ
کسی بے کراں دشت میں آنکھیں جھکاؤں تو اس نرم خیمہ کے اندر
کروروں تڑپتے ہوئے منجمد ذروں کا اک دشت پھیلا ہوا ہے
یہ نہ ہونے کی میٹھی اذیت!

عجب ماجرا ہے ازل اور ابد کے دونوں ستونوں کو انسانی وجود سے متعلق اس ثنویت کی علامت سمجھنا چاہیے۔ شاعر کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور اس کے متعلقات کا اثبات کرکے یا ان سے انکار۔ زندگی شاعر کو یقین کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن حالات اسے ایک طرح کی بے یقینی کی طرف دھکیلتے ہیں شاعر جب اپنی یعنی انسان کی ایک مستقل اور ابدی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وقت اور تاریخ اس شناخت کو منہدم اور تاراج کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔

آزادہ روی:

آزادہ روی ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے جس کے بارے میں بلراج کومل یوں رقمطراز ہیں:

"وزیر آغا کی شاعری کا بنیادی نقطہ آزادہ روی ہے فطرت، سماج، مذہب، جسم اور پھر پوری کائنات۔ اسالیب، لفظیات آہنگ کا انتخاب، غزل، نظم، انشائیہ، تنقید، وزیر آغا کی پوری شخصیت ہر لحظہ تازہ کار ہزار جہت ردعمل کی شخصیت ہے۔ اس میں بیک وقت خالص جسمانی ردعمل سے لے کر جذباتی، روحانی وجودیاتی ردعمل تک، تمام تر صورتیں، تمام تر حوالے سرگرم کار ہیں۔ سماجی جانور کا رتبہ اختیار کرنے کے عمل میں انسان مختلف مدارج سے گزرا ہے (یہ عمل جاری ہے) تسخیر فطرت، سماجی تنظیم، تہذیبی سفر کے مراحل، وجود کی بازیافت، متوقع انہدام۔ وزیر آغا اگر صرف کتابی دلچسپیوں تک محدود ہوتے تو شاید تنقیدی اظہار سے مطمئن ہو جاتے۔" (شام کا سورج ص 295)

اس مضمون کا بقیہ حصہ صفحہ 119 پر ملاحظہ کریں

وزیر آغا۔۔۔ایک جائزہ

پروفیسر غلام جیلانی اصغر
انگریزی سے ترجمہ: طلعت شہزاد بابر

وزیر آغا ادبی اُفق پر بہت اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ ہمہ گیریت ان کی قدرتی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ لطیف، ذاتی مضامین وجدانی حالت میں لکھتے ہیں جو کہ ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ وہ طبعی اور سماجی سائنس میں گہری دلچسپی رکھنے والے نقاد اور مفکر ہیں۔ طویل عرصے تک وہ مابعد الطبعاتی خیالات میں کھوئے رہے۔ وہ علم الانسان، علم کائنات، حیاتیات اور علم نفسیات کے ماہر ہیں۔ انھوں نے زیادہ کام نثر میں کیا لیکن درحقیقت وہ ایک شاعر ہیں۔

ایک حقیقی شاعر اور ان کی نثر نگاری پر ایک مختصر نظر ڈالتے ہیں۔ نثر نگاری کی اپنی خصوصیات ہیں۔ یہ زندہ اور انفرادی توانائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہ بے مثال، لاجواب اور حیران کن حد تک درست ہے۔ جامعیت کی اسی خوبی کی وجہ سے بعض بے حد خیالی مضامین جو انھوں نے تنقیدی جانچ کے لیے چنے بالکل قدرتی اور آسان فہم بن گئے انھوں نے اپنی نثر کو شعری آب و تاب عطا کی۔ بہت سے نثری ادب خاص طور پر ادبی تنقید لکھنے والے نثر کے اصول و ضوابط کے واقف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی رائے بھی حقیقی اور بے خطا ہوتی ہے لیکن ان کا اظہار اس قدر پیچیدہ اور خشک ہوتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں جگہ بنانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے کے مطابق اس طرح کے تنقیدی بیان بے اثر ہوتے ہیں۔ ایک اچھے نقاد کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ادب بشمول تنقید لفظ کے جمالیاتی حسن کے مرہون منت ہے۔ الفاظ کا استعمال اس سلیقے سے کرنا چاہیے کہ وہ اپنی تازگی برقرار رکھے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ نثر نگار خود لفظوں کی حرمت کا خیال رکھے۔ وزیر آغا کے لکھے الفاظ نہ صرف لکھے جاتے ہیں بلکہ بولتے محسوس ہوتے ہیں۔ الفاظ کی گونج اور آہنگ ذوق میں گندھے ہوئے ہیں، اسی اضافی وصف کی وجہ سے ان کی نثر آواز و احساسات کے مابین تعلق سے مکمل استفادہ کرتی ہے اور ان کی نثر ان کی شاعری کی طرح اپنی شناخت رکھتی ہے۔

نثر اور شاعری کا یہ توازن ان کے انشائیے میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ (ابھی تک تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں) وزیر آغا کے انشائیے اپنی ذاتی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ انھیں گوتھک چرچ کی طرح تعمیر کرتے ہیں۔ جس کے تمام اجزاء اپنی انفرادیت سمیت کل کا ایک جزو ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے نئے معانی آپ کے ادراک پر دستک دینے لگتے ہیں۔ اسی وصف کی وجہ سے ان کے انشائیوں پر ان کی نظموں کا پرتو بڑا واضح انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں معانی پس منظر بناتے ہیں، تصور و احساسات اور اظہار و کیفیات درحقیقت آواز کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مجھے ابھی تک وزیر آغا کے علاوہ کوئی ایسا مضمون نگار نہیں ملا جو ایک لفظ کی گہرائی اور تازگی کا اتنا شعور رکھتا ہو۔

بطور نقاد وزیر آغا نے اس نقطہ نظر کی بنیاد رکھی کہ ثقافتی وحدت جو کہ سماجی مظاہر میں موجزن ہوتی ہے تاریخ کے خارجی محرکات سے کہیں زیادہ پر مغز ہوتی ہے اس لیے ادب کو باطنی آگہی اور نفسیاتی انکشاف کے معاون کے طور پر ہی سمجھنا چاہیے۔ ''اردو شاعری کا مزاج'' اسی نقطہ نظر کی حامل اعلیٰ کتاب ہے۔ اردو کے تنقیدی ادب میں ایسی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ وزیر آغا وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی اصل روح کو منکشف کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے ثقافتی روایات کے ساتھ مربوط کر کے اظہار کی تمام اصناف کو جمالیاتی وحدت عطا کی ہے۔ اس نے اسی نظریہ کو شاعری اور نثر کی جملہ اصناف پر معروضی انداز میں منطبق کر کے اپنے مقصد کی موثر انداز میں تکمیل کی ہے۔ ان کا زیادہ تنقیدی کام اپنی نوعیت اور برتاؤ کے لحاظ سے سائنسی (معروضی) ہے جو کہ تمام اصناف سخن کے نئے افق وا کرتا ہے اور وہ چیز جو مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ شعوری تحقیق کی تمثیل نگاری ہے۔ ان کی دوسری کتب جو کہ بڑی تعداد میں نہیں ہیں (یہ مضمون کافی عرصہ قبل لکھا گیا تھا) اور مضامین پر تنقید بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ اپنے زمانے کا ثقافتی تنوع بھرپور طریقے سے پیش کرتی ہیں۔

وزیر آغا میری رائے کے مطابق بہترین شعرا میں سے ایک ہیں ان کی نظم گہرے جذباتی رنگوں سے مزین خود نوشت ہے۔ جس میں خود ستائی کو دانشمندی سے خود فراموشی سے ملایا گیا ہے۔ اس آمیزش نے نظم کو انفرادی تذکرے سے کہیں بلند کرایا ہے۔ درحقیقت یہ انسان کی ذات میں پنہاں اچھائی میں یقین سے عبارت اور ان کا بیاں ہے، اس میں پر اسراریت ہے۔ جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا کہ یہ شاعر کا بنیادی وصف ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی نظم لگ بھگ چالیس سال پہلے لکھی۔ یہ اپنے تصور اور بناوٹ کے اعتبار سے اس قدر چونکا دینے والی تازگی لیے تھی کہ اسے سال کی بہترین نظموں کے انتخاب میں شامل کیا گیا۔ یہ ایک شناخت تھی اور یہ اس کا حق تھا کیونکہ وزیر آغا نے بطور نوجوان اردو شاعری کی فرسودہ روایات کی پابندی سے انکار کیا اور اپنی تازگی اور انفرادیت کے اظہار کی جدوجہد کی، روایتی بیزار کن روایتوں سے انحراف کیا اور اپنے کلام کی تازگی سے جو کہ اس کی شاعری کا منفرد وصف ہے، پڑھنے والوں کو مسحور کیا۔

وزیر آغا کا حقیقی فنی کارنامہ ۱۹۶۳ء میں نظموں کی کتاب ''شام اور سائے'' کی صورت میں منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔ یہ مجموعہ مروجہ شاعری سے ہٹ کر تھا۔ یہ نظمیں نفس مضمون اور اظہار کے اعتبار سے مستقبل کے شاعر کا پتہ دے رہی تھیں۔ شاعر نے روایتی رومانوی پابندیوں کو توڑ کر ابدیت اور زمانے کی زندہ علامت پیش کی۔ ہر نظم چنچل اور مرتعش پیکروں کا بہترین نمونہ ہے جس نے نہ صرف انسانی امیدوں کی کمزوری بلکہ ان کی دلکشی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان نظموں میں جامع منظر کشی کی کوشش کی گئی ہے۔ وزیر آغا انسانی تجربات کے قیاس اور باطنی احساس سے مکمل طور پر آگاہ ہیں جو ان کی تقریباً تمام نظموں سے عیاں ہے۔ وزیر آغا اپنے ہم عصروں سے زیادہ متنوع اور باریک بیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے لگ بھگ تمام ادبی رجحانات پر دسترس حاصل کر کے ان کو اپنی تصنیفات میں ضم کر دیا ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام ''دن کا زرد پہاڑ'' اور ''نردبان'' میں یہ احساس اور شعور مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ نظموں کا علامتی پن اور زیادہ پختگی اختیار کر گیا ہے، لیکن یہ علامتی دلیز عام ذی ہوش قاری کے تخیل سے ماورا نہیں ہے یہی وصف ان کو ابہام اور معنی کے الجھاؤ کے الزام سے بچاتا ہے۔

وزیر آغا کی بطور شاعر حقیقی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ ان کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کا مطالعہ کیا جائے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے شاعر کی رنگ و شکل کے بارے میں حساسیت، باریک بینی اور حیران کن حد تک ذہنی ذخیرہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ شروع کے زمانے کے منتشر خیالات اب زیست پذیر اور اکائی کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ یہ باطنی حقائق کی غیر معمولی دستاویز تھی۔ وہ موجود میں زندہ اور اس کی گوناگوں حقائق کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ ظاہری دنیا کی تمام تر خوبصورتی بلکہ بدصورتی کو بھی وہ اپنے بلوریں پیکروں کی موسیقیت سے اجاگر

کرتے ہیں۔ ان کے اندر کی دنیا میں شگفتگی بھی ہے اور روح کو چھیلنے والے آزار بھی۔ ایک نقاد نے بجا طور پر ان کی نظم پر یوں تبصرہ کیا "یہ مکمل شعوری کوشش ہے۔ اس کا سب سے متاثر کن وصف شاعر کا اپنی شناخت کا متلاشی ہونا ہے۔" نظم میں ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا شاعر کے بیان کے سحر میں کھو جاتا ہے۔

صبا میں نے
پھولوں کے گجروں کی درزوں سے دیکھا
میں بندیوں کے جھرمٹ میں محصور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا
پیازی سے گالوں کے
بلور میں
میرا چہرہ چھپا تھا
چمکتی ہوئی سرخ بندیا
مرا نام چپکی تھی
خوشبو
گلابی بہاروں سے باہر نکل کر
مجھے سونگھتی تھی

نظم زندگی کے مختلف تجرباتی مراحل سے گزرتی ہوتی ایک ہمہ روانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طویل نظم کے بعد اسی کی ایک اور کتاب "شام کی منڈیر سے" منصۂ شہود پر آئی بظاہر یہ کتاب خودنوشت ہے لیکن اصل میں ان کے ادبی عقائد کو واضح کرتی ہے۔ ان کی بے ساختہ تنقید سے جڑی تذکرہ نویسی کتاب کو قابل مطالعہ بناتی ہے۔ انھوں نے اس نظم کے ذریعے قاری کو پہلی مرتبہ اپنی شعری کائنات سے روشناس کروایا ہے جو کہ مکانی اور جذباتی پس منظر میں اور زیادہ خوشنما دکھائی دیتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک شاہکار کتاب ہے۔ الغرض ان کی شاعری اور نثر کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا اپنے عہد کی سب سے پائیدار آواز ہے۔

❖OOO❖

عزیز اللہ جلالی کے مضمون کا بقیہ حصہ

اظہار فطرت:

ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں کتاب فطرت کا عکس نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ انہوں فطرت کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عرش صدیقی ڈاکٹر وزیر آغا کی فطرت شناسی کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"وزیر آغا کی بیشتر تشبیہیں، استعارے، اور تصویریں کتاب فطرت سے ماخوذ ہیں۔ اس کے ہاں جنگل، پتھر، پھول، بادل، ہوائیں، کھلے میدان، اونچے پہاڑ، وادیاں، صبح وشام اور کتاب فطرت کی وہ تمام دولت جس نے ورڈز ورتھ کو شاعر بنایا، استعاروں اور علامتوں کی شکل میں بکھری پڑی ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اس کی ذاتی زندگی میں کھیتوں، دیہاتوں پگڈنڈیوں، ندی نالوں، اور باغوں کو بہت دخل رہا ہے۔ انسانی کردار کی تعمیر کا عمل بہت پیچیدہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کھیتوں کے ماحول سے اس لئے بیزار ہو جائے کہ وہ ایک لمبا عرصہ وہاں گزار چکا ہے۔ اور تبدیلی کا خواہاں ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وجہ سے وہ کھیتوں سے عشق کرنے لگے۔ اور ایک دن کی جدائی بھی برداشت نہ کر سکے۔ وزیر آغا پر اس کے ماحول کا یہ اثر ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر اس سے پیار کرنے لگا۔ اس نے شعوری طور پر کبھی بھی اس پیار کو نہ محسوس کیا ہے نہ اس کا اظہار کیا۔ لیکن اس کی مسرت اور طمانیت کا سرچشمہ یہی فطری ماحول ہے جو اس کی ذات کا حصہ بن چکا ہے۔

فکری جہت:

وزیر آغا لکیر کے فقیر شاعر نہیں بلکہ ایک پر مغز فکر کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی فکری جہت کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد یوں رقمطراز ہیں:

"وزیر آغا نے اپنی نظموں میں اس روحانی اور وجدانی حاصل کو سماجی اور ثقافتی عمل سے مربوط کر کے ایک فکری جہت کا دروازہ وا کیا ہے۔ اور اردو نظم کو نئی سوچ اور احساس کی لذت سے ہم کنار کیا ہے۔ اور یہ فکری جہت اور نیا مابعدالطبعیاتی ذائقہ ان کی تمام نظموں میں محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ "شام اور سائے"، "دن کا زرد پہاڑ"، "نردبان"، اور "آدھی صدی کے بعد" ان کے اپنے شعری سفر ہی کے نہیں بلکہ جدید اردو نظم ارتقائی رفتار اور متوازن رویے کے اشارے بھی ہیں۔ پچھلے برسوں میں جدید اردو نظم جس تجرباتی افراط وتفریط کا شکار رہی ہے۔ اس نظم کو ایک تجربہ گاہ تو ضرور بنایا ہے۔ لیکن معیار کے معاملہ کو خاصا مشکل کر دیا۔ وزیر آغا ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس انتہا پسندی میں جدیدیت کو متوازن انداز اور لہجہ سے ہم آہنگ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور نظم میں ایک دبستان کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

"نظم پرکھ کے سلسلے میں اس بات کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ٹھوس تمثالیں Concrete imajes کا کیا عالم ہے۔ کیونکہ ٹھوس تمثالیں مخفی دیار کے ارضی نشانات ہیں۔ جو شاعر کے حسی تجربے کے خدوخال کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا نظم ان حسی تجربات کو بنیاد بنا کر اوپر کی طرف اُٹھ بھی رہی ہے۔ یا نہیں؟ یعنی وہ محض حسی تجربات تک محدود رہے یا معنی کی ان گنت پرچھائیوں اور شعاعوں کو جنم بھی دے رہی ہے۔؟ ہر اچھی نظم کی دو سطحیں ہوتی ہیں ایک ارضی سطح جو ٹھوس اور محسوس تمثالوں میں متشکل ہوتی ہے۔ دوسری معنوی سطح جو امکانات کے در وا کر دیتی ہے۔ مگر امکانات کی صورت جبھی ممکن ہے۔ کہ شاعر اور پھر قاری پہلے اپنے تجربے کے بطون میں سفر کرے اور پھر تجربے سے نکلنے والی شعاعوں پر محوخرام ہو۔ تجربے کے بطون میں سفر کے لیے نظم کے مخفی دیار سے آگاہی ضروری ہے۔ اور یہ آگاہی شاعر کی وساطت سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور نظم کی ٹھوس تمثالوں کے ذریعے بھی۔ موخرالذکر طریق ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ مگر مقدم الذکر کو اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے زیادہ مواقع مہیا نہیں کے گئے کیا ہرج ہے اگر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اس طریق کو بھی آزمالیا جائے"

شام اور سائے" سے "گھاس میں تتلیاں" تک ان کا فنی اور شعری سفر اس بات کی گواہی ہے کہ ان کے یہاں سوچ فکر اور تجربہ کی تازگی برقرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شعری موضوع یک رنگ یا یک جہت نہیں ہے۔ وہ انسان سے وابستہ تخلیقی عمل کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں جو کائنات کی طرح قدیم اور لازوال ہے۔ چنانچہ زندگی کو جان کر اس کی بے ثباتی کا شعور اور زندگی کے لمحہ لمحہ سے لطف اُٹھانے کی تمنا کا تضاد ایک ایسے کرب کو جنم دیتا ہے۔ جس نے ان کی نظموں میں تہہ داری کی وہ کیفیت پیدا کی ہے جس تک رسائی نظم کے قاری کو نئی لذتوں اور نئی رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔:

ہوا کچھ کے لگا کے کہتی ہے تم ابھی سانس لے رہے ہو؟
ہوا سے کیسے کہوں رک جا کہ میری یہ سانس تو ایک وہمہ ہے
ہزاروں کالی کثیف جونکیں
میرے بدن سے چمٹ گئی ہیں
بدن کے ساغر کو پی رہی ہیں
میں خشک ہوتے ہوئے شجر کا سفید تنا
ہوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ تھرتھراہٹ
خود سانس کے ہاتھوں کی کپکپی ہے
میری شکستہ اُڑان
اس کی دہکتی پھونکوں کی توس تک ہے
میں ایک لرزتا ہوا وہمہ ہوں
مہیب گنبد کے لبوں پہ اٹکا ہوا میں چکنا سا گول پتھر
ہوا کی ٹھوکر کے خوف میں جتلا کھڑا ہوں!
ہوا سے یہ کیسے کہوں کہ میں ایک جری سپاہی
میں اپنے خنجر کی نوک سے خود ہی کٹ گیا ہوں
لہو کے قطروں میں بٹ گیا ہوں
ہوا اگر خوشبوؤں کا فرغل پہن کے آئے
ہوا اگر بادلوں سے جھانکے
ہوا کہے گر کہ وہ اک لمس ہے ذرا سا
ہوا گر میرا روپ دھارے
مجھے پکارے
ہنس پڑوں میں
ہوا کے قدموں کی دھول بن کر
برس پڑوں میں (ہوا اگر میرا دھوپ دھارے)
(رشید امجد، وزیر آغا کی نظموں کا فکری پس منظر، شام کا سورج ص 378-380)

المختصر ڈاکٹر وزیر آغا ان خوش قسمت شاعروں میں ہی جن کو اپنی زندگی ہی میں شہرت دوام میسر آئی۔ اور آسمان ادب کے درخشندہ ستارے بن کے چمکے۔ جن کی ضو سے آئندہ کئی صدیوں تک ادباء اور شعراء ان سے روشنی وصول کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ہوراں نال اک ملاقات

(ڈاکٹر وزیر آغا کا پہلا پنجابی انٹرویو جو ریڈیو پاکستان سرگودھا 2005ء کو دیا)

خالد اقبال
پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان ایف ایم 93 سرگودھا

ڈاکٹر وزیر آغا ہوراں دا ناں ادب وچ اچیرا ہے۔ اج اسی "ماں بولی" دے حوالے نال کجھ گل بات کراں گے"

سوال: ڈاکٹر وزیر آغا صاحب تسی اے فرماؤ تہانوں پنجابی نثر پڑھن دا اتفاق ہویا اے؟ تے تہانوں کیویں محسوس ہویا؟

جواب: جی بالکل پنجابی نثر پڑھن دا اتفاق ہویا اے جی۔ میں سمجھداں پنجابی زبان وچ اظہار یاں بیان دی سکت بہت ہے۔ میری کتاب چھپی سی "واجاں باجھ وچھوڑے" اوس دا دیباچہ لکھیا سی ریاض احمد شاد ہوراں۔ اوہناں اس قدر خوبصورت زبان وچ تے آسانی دے نال بیان کیتا تے مینوں اے عام بول چال دی زبان بہت چنگی تے خوبصورت لگی آکھن دا مطلب اے ہے جو ساڈے اتے اردو زبان دا اثر موجود ہے تے ایس وجہ توں خالص پنجابی ول اسی پوری طراں نال توجہ نہیں کردے۔ نثر اتے اردو، عربی، فارسی اے۔ میں سمجھناں واں سانوں کوشش کرنی چاہیدی اے جو پنجابی زبان دے خالص لفظ ورتے جان۔ شاعری وچ خالص پنجابی الفاظ دی ورتن دا مسئلہ نہیں ہیگا۔ البتہ پنجابی نثر وچ اے مسئلہ ضرور ہے۔ خالص پنجابی الفاظ دی ورتارے دی لوڑ اے۔

سوال: اے وی ہوسکدا اے خالص لفظاں دا استعمال نہ کیتا گیا ہووے کیوں خالص پنجابی زبان تاں دیہاتاں وچ اج وی موجود اے۔

جواب: حالی تک ساڈی پنجابی زبان مختلف علاقیاں دیاں زباناں نال Amelgamate ہے۔ مثال دے طور تے اردو زبان جو پشاور وچ یا مدارس وچ بولی جاندی اے۔ اوہ اکو جئی ہے پر ساڈے ایتھے پوٹھوہاری، لہندا، سرائیکی، ہندکو، سیالکوٹی پنجابی ہور ہے۔ اینہاں زباناں نوں ترقی دیناں ضروری اے۔ تے اے کم ساڈے شاعر کر سکدے نیں کہ اوہ لفظاں دی کھوج پرکھ کرن تے جیہڑا لفظ کسے وی معنی نوں پوری طراں بیان کر سکدا ہووے اوہنوں اپنے ورتارے وچ ادب وچ شامل کرن۔

سوال: تہاڈی پنجابی شاعری دی کتاب "واجاں باجھ وچھوڑے" ہے تسی اوہدے وچ اک لفظ وی اردو زبان دا استعمال نہیں کیتا۔ تے ایہدے نال ای سوال دا دوجا حصہ اے وے جو تسی اپنی ماں بولی ول کیویں آئے تے تہانوں پنجابی زبان وچ لکھن دا خیال کیویں آیا؟

جواب: ویسے تے جی پنجابی چونکہ ماں بولی اے تے جی بہت کرداسی۔ اج توں بہت پہلے دی گل اے میں ایس پاسے آیا ساں تے میں ۱۹۷۵ء وچ ادب شمارے تخلیق وچ اپنیاں کجھ چیزاں چھپوائیاں تے اوس توں بعد خاصا عرصہ نہ لکھ سکیا تے فیر ۱۹۹۰ء توں بعد میرا ایک دم پنجابی زبان وچ لکھن نوں جی کیتا تے مینوں ایس کر کے وہ چنگا لگا کہ میں اردو دے وچ پچھلے ۵۰ سالاں توں شاعری کیتی تے کوئی گیارہ، بارہ شاعری دے مجموعے پیش کیتے۔ پر جدوں میں پنجابی لکھن لگا تے مینوں اینج محسوس ہویا کہ انسان دی جو سائیکی ہندی اے اوہدیاں جڑیاں ڈونگیاں تھاواں ہندیاں نیں اوس تک شاید اپنی ماں بولی دے ذریعے ای پہنچیا جاسکدا اے کیونکہ اے ماں دا رشتہ ہے تے میں بہت حیران ہویا تے میری پنجابی شاعری وچ جو کجھ بیان ہویا اے بہت آسانی نال میں بیان کیتا اے تے میرا ایمان ہے جو پنجابی زبان وچ جان ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب تسی اے فرماؤ جو تسی پنجابی نظم خود وی لکھی اے تے پڑھی وی ہووے گی تے پنجابی نظم توں پہلاں کافی دی روایت ہے نظم تے کافی بارے تسی کی آکھو گے؟

جواب: ساڈی جیہڑی شاعری اے پنجابی ایہدے وچ رومانی کہانیاں نیں اور اوہناں دے اندر تصوف دیاں گلاں موجود نیں جیویں بلھے شاہ دی شاعری اے یا دوسری اے اوہدے وچ مضامین تصوف تے ہور مضامین نوں Images دے ذریعے بیان کیتا گیا اے تے پوری شاعری اتے تصوف دا عمل زیادہ ہے اصل جو ہے شاعری وچ اوہ Images وچ تبدیلیاں وی آندیاں نیں مثلاً کسے زمانے پنجابی شاعری وچ پنجابی شاعر نے Images "کنویں" دے اردگرد گھمدے نیں اور عورتاں دا کنویں تے جاون۔ گھڑے بھرن تے چوڑے والی بانہہ بجاں دی تے ہن تے کنویں نظر نہیں آندے اوہدے تھاں ٹیوب ویل نظر آوندے نیں سوال اے وے ساجی تبدیلی دے نال نال پنجابی شاعری وچ وی تبدیلی آئی اے چنانچہ میں سمجھناں واں جدید پنجابی نظم وچ تجربات تے نویں تبدیلی دی ضرورت اے۔

سوال: تساں اپنے معروف ادبی پرچے "اوراق" راہیں اپنی زمین نال محبت دے رشتے دی گل سب توں پہلاں کیتی سی تے اج پاکستانی زباناں وچ اپنی دھرتی نال محبت دی گل ہورہی اے کیا تساں اے تبدیلی محسوس کردے او؟

جواب: جی ہاں اے تبدیلی ضرور ہے بلکہ اردو زبان وچ وی پنجابی زبان دے بہت سارے لفظ جذب ہورہے نیں بجائے ایس دے کہ اسی اردو زبان وچ انگریزی زبان دے لفظ ورتیے ساہنوں چاہیدا اے جو لفظ ساڈی رہتل دے نیں، مقامی الفاظ نیں اوہ ساڈی شاعری تے نثر وچ آنے چاہی دے نیں۔

سوال: پاکستانی ثقافت جیویں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان دا کلچر ہے اوہوای پاکستانی کلچر ہے تسی پاکستانی کلچر تے مقامی ثقافت بارے کی آکھو گے؟

جواب: جی ساڈا علاقہ دے نال اک ایسی تہذیب دا زمانہ ہے جیہنوں اسی وادی سندھ دی تہذیب دا زمانہ کہندے آں۔ راجپوتانہ توں لے کے گجرات، کاٹھیاواڑ توں لے کے شملے دیاں پہاڑیاں تک تے پشاور توں لے کے بلوچستان تک اے سارا علاقہ وادی سندھ سی۔ بھانویں تسی کدرے چلے جاؤ پشاور، بلوچستان جتھے وی جاؤ اوہدے وچ یعنی اردو زبان وچ مقامی زباناں دے لفظ وی رل جاندے نیں۔ لہٰذا لباس دے حوالے نال وی تھوڑی تبدیلی دے باوجود پاکستان دا کلچر اکو ای ہے ساڈے پاکستان دیاں جنیاں وی چھوٹیاں بولیاں نیں انہاں دا تعلق ساڈے کلچر نال ہے ساڈیاں زباناں وچ تشدید دا عنصر بہت زیادہ ہے۔

سوال: موجودہ دور وچ اوہ انتشار ہے اوہدے لئی تصوف دے دوبارہ احیاء دی ضرورت ہے اوہ بھانویں تصوف دی شاعری راہیں ہووے یا لوک ناٹک راہیں ہووے یا کافی دی صورت وچ ہووے۔

جواب: گل اے جی انہاں گلاں دی تکرار بار بار ہندی رہندی اے اک صدی وچ اک چیز آوندی اے تے دوجی صدی وچ بھل بھل جاندی اے تیسری صدی فیر اے گل نوں لے لیندی اے اے طراں زباناں، خیالات Revine ہندے رہندے نیں لیکن Revinal اگر تھمی تے کھمی مارن دی صورت وچ ہووے گا تے اوہ ٹھیک نہیں ہاں اگر Revinal وچ نواں علم ہووے تاں ٹھیک ہے۔ مثلاً میں سمجھداں واں تصوف جیہڑا جدیدیت دے حوالے نال آیا اے۔ اے پوری سائنس دے اندر تصوف دا جو عنصر آیا اے اوہدے نال اے جڑیا ہویا اے تاکہ ساڈیاں اکھاں کھلیاں رہن۔ سائنس دی آخیر تے مینوں اک صاحب آکھن لگے میں اس دن دے انتظار وچ

بقیہ انٹرویو صفحہ 25 پر ملاحظہ کریں

ڈاکٹر وزیر آغا ہوراں نال اِک ملاقات

(ڈاکٹر وزیر آغا کا پہلا پنجابی انٹرویو جو ریڈیو پاکستان سرگودھا 2005ء کو دیا)

خالد اقبال

پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان ایف ایم 93 سرگودھا

ڈاکٹر وزیر آغا ہوراں دا ناں ادب وچ اچیرا ہے۔ اج اسی "ماں بولی" دے حوالے نال کجھ گل بات کراں گے"

سوال: ڈاکٹر وزیر آغا صاحب تسی اے فرماؤ تہانوں پنجابی نثر پڑھن دا اتفاق ہویا اے؟ تے تہانوں کیہو جیہا محسوس ہویا؟

جواب: جی بالکل پنجابی نثر پڑھن دا اتفاق ہوا اے جی۔ میں سمجھداں پنجابی زبان وچ اظہار یاں بیان دی سکت بہت ہے۔ میری کتاب چھپی سی "واجاں باجھ وچھوڑے" اوس دا دیباچہ لکھیا سی ریاض احمد شاد ہوراں۔ اونہاں اس قدر خوبصورت زبان وچ تے آسانی دے نال بیان کیتا تے مینوں اے عام بول چال دی زبان بہت چنگی تے خوبصورت لگی آکھن دا مطلب اے ہے جو ساڈے اتے اردو زبان دا اثر موجود ہے تے ایس وجہ توں خالص پنجابی ول اسی پوری طراں نال توجہ نہیں کردے۔ نثر اتے اردو، عربی، فارسی اے۔ میں سمجھناں واں سانوں کوشش کرنی چاہیدی اے جو پنجابی زبان دے خالص لفظ ورتے جان۔ شاعری وچ خالص پنجابی لفظاں دے ورتن دا مسئلہ نہیں ہیگا۔ البتہ پنجابی نثر وچ اے مسئلہ ضرور ہے۔ خالص پنجابی لفظاں دے ورتارے دی لوڑ اے۔

سوال: اے وی ہوسکدا اے خالص لفظاں دا استعمال نہ کیتا گیا ہووے کیوں خالص پنجابی زبان تاں دیہاتاں وچ اج وی موجود اے۔

جواب: حالی تک ساڈی پنجابی زبان مختلف علاقیاں دیاں زباناں نال Amelgamate ہے۔ مثال دے طور تے اردو زبان جو پشاور وچ یا مدارس وچ بولی جاندی اے۔ اوہ اکو جئی ہے پر ساڈے ایتھے پوٹھوہاری، لہندا، سرائیکی، ہندکو، سیالکوٹی پنجابی ہور ہے۔ ایناں زباناں نوں ترقی دیناں ضروری اے۔ تے اے کم ساڈے شاعر کرسکدے نیں کہ اوہ لفظاں دی کھوج پرکھ کرن تے جیہڑا لفظ کسے وی معنی نوں پوری طراں بیان کرسکدا ہووے اوہنوں اپنے ورتارے وچ ادب وچ شامل کرن۔

سوال: تہاڈی پنجابی شاعری دی کتاب "واجاں باجھ وچھوڑے" ہے تسی اوہدے وچ اک لفظ وی اردو زبان دا استعمال نہیں کیتا۔ تے ایہدے نال ای سوال دا دوجا حصہ اے وے جو تسی اپنی ماں بولی ول کینویں آئے تے تہانوں پنجابی زبان وچ لکھن دا خیال کینویں آیا؟

جواب: ویسے تے جی پنجابی چونکہ ماں بولی اے تے جی بہت کرداسی۔ اج توں بہت پہلے دی گل اے میں ایس پاسے آیا ساں تے میں ۱۹۷۵ء وچ ادب شارے تخلیق وچ اپنیاں کجھ چیزاں چھپوائیاں تے اوس توں بعد خاصا عرصہ نہ لکھ سکیا تے فیر ۱۹۹۰ء توں بعد میرا ایک دم پنجابی زبان وچ لکھن نوں جی کیتا تے مینوں ایس کرکے وہ چنگا لگا کہ میں اردو دے وچ پچھلے ۵۰ سالاں توں شاعری کیتی تے کوئی گیارہ، بارہ شاعری دے مجموعے پیش کیتے۔ پر جدوں میں پنجابی لکھن لگا تے مینوں انج محسوس ہویا کہ انسان دی جو سائیکی ہندی اے اودیاں جہڑیاں ڈونگیاں تہواں ہندیاں نیں اوس تک شاید اپنی ماں بولی دے ذریعے ای پہنچیا جاسکدا اے کیوں جے اے ماں دا رشتہ ہے تے میں بہت حیران ہویا تے میری پنجابی شاعری وچ جو کجھ بیان ہویا اے بہت آسانی نال میں بیان کیتا اے تے میرا ایمان ہے جو پنجابی زبان وچ جان ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب تسی اے فرماؤ جو تسی پنجابی نظم خود وی لکھی اے تے پڑھی وی ہووے گی تے پنجابی نظم توں پہلاں کافی دی روایت ہے نظم تے کافی بارے تسی کی آکھو گے؟

جواب: ساڈی جہڑی شاعری اے پنجابی ایہدے وچ رومانی کہانیاں نیں اور اونہاں دے اندر تصوف دیاں گلاں موجود نیں جینویں بلھے شاہؒ دی شاعری اے یا دوسری اے اوہدے وچ مضامین تصوف تے ہور مضامین نوں Images دے ذریعے بیان کیتا گیا اے تے پوری شاعری اتے تصوف دا عمل زیادہ ہے اصل جو ہے شاعری وچ او Images اوچ تبدیلیاں وی آندیاں نیں مثلاً کسے زمانے پنجابی شاعری وچ پنجابی شاعر نے Images "کنویں" دے اردگرد گھمدے نیں اور عورتاں دا کنویں تے جاون۔ گھڑے بھرن تے چوڑے والی بانہہ بچاں دی تے بن تے کنویں نظر نہیں آندے اوہدے تھاں ٹیوب ویل نظر آوندے نیں سوال اے وے سماجی تبدیلی دے نال نال پنجابی شاعری وچ وی تبدیلی آئی اے چنانچہ میں سمجھناواں جدید پنجابی نظم وچ تجربات تے نویں تبدیلی دی ضرورت اے۔

سوال: تساں اپنے معروف ادبی پرچے "اوراق" راہیں اپنی زمین نال محبت دے رشتے دی گل سب توں پہلاں کیتی سی تے اج پاکستانی زباناں وچ اپنی دھرتی نال محبت دی گل ہورہی اے کیا تساں اے تبدیلی محسوس کردے اوہ؟

جواب: جی ہاں اے تبدیلی ضرور ہے بلکہ اردو زبان وچ وی پنجابی زبان دے بہت سارے لفظ جذب ہورہے نیں بجائے ایس دے کہ اسی اردو زبان وچ انگریزی زبان دے لفظ ورتیے سانوں چاہیدا اے جو لفظ ساڈی رہتل دے نیں، مقامی الفاظ نیں اوہ ساڈی شاعری تے نثر وچ آنے چاہی دے نیں۔

سوال: پاکستانی ثقافت جیویں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان دا کلچر ہے اوہوای پاکستانی کلچر ہے تسی پاکستانی کلچر تے مقامی ثقافت بارے کی آکھو گے؟

جواب: جی ساڈا علاقہ دے نال اک ایسی تہذیب دا زمانہ ہے جنہوں اسی وادی سندھ دی تہذیب دا زمانہ کہندے آں۔ راجپوتانہ توں لے کے گجرات، کاٹھیاواڑ توں لے کے شملے دیاں پہاڑیاں تک تے پشاور توں لے کے بلوچستان تک اے سارا علاقہ وادی سندھ سی۔ بھانویں تسی کدرے چلے جاؤ پشاور، بلوچستان جتھے وی جاؤ اوہدے وچ یعنی اردو زبان وچ مقامی زباناں دے لفظ وی رل جاندے نیں۔ لہٰذا لباس دے حوالے نال وی تھوڑی تھوڑی تبدیلی دے باوجود پاکستان دا کلچر اکو ای ہے ساڈے پاکستان دیاں جنیاں وی چھوٹیاں بولیاں نیں انہاں دا تعلق ساڈے کلچر نال ہے ساڈیاں زباناں وچ تشدید دا عنصر بہت زیادہ ہے۔

سوال: موجودہ دور وچ اوہ انتشار ہے اوہدے لئی تصوف دے دوبارہ احیاء دی ضرورت ہے اوہ بھانویں تصوف دی شاعری راہیں ہووے یا لوک ناٹک راہیں ہووے یا کافی دی صورت وچ ہووے۔

جواب: گل اے جی انہاں گلاں دی تکرار بار بار ہندی رہندی اے اک صدی وچ اک چیز آوندی اے تے دوجی صدی وچ بھل بھل جاندی اے تیسری صدی فیر اے گل نوں لے لیندی اے اے طراں زباناں، خیالات Revine ہندے رہندے نیں لیکن Revinal اگر کسی تے کسی مارن دی صورت وچ ہووے گا تے اوہ ٹھیک نہیں ہاں اگر Revinal وچ نواں علم ہووے تاں ٹھیک ہے۔ مثلاً میں سمجھداں واں تصوف جیہڑا جدیدیت دے حوالے نال آیا اے۔ اے پوری سائنس دے اندر تصوف دا جو عنصر آیا اے اوہدے نال اے جڑیا ہویا اے تاکہ ساڈیاں اکھاں کھلیاں رہن۔ سائنس دی آخر تے مینوں اک صاحب آکھن لگے میں اس دن دے انتظار وچ

بقیہ انٹرویو صفحہ 25 پر ملاحظہ کریں

مکالمہ: ذوالفقار احسن

ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک مکالمہ

(سہ ماہی ''اسالیب'' کو دیا گیا ایک یادگار انٹرویو)

احسن: آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟

آغا جی: میں جب گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم تھا تو انگریزی اور اُردو میں شعر کہنے لگا تھا مگر اپنے کلام کو اشاعت کے لیے روانہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ایم اے میں میرا مضمون معاشیات تھا لہٰذا ادب سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں تھا لیکن جب میں اور میرا بھانجا شمس آغا (جو بعد ازاں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوا) مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر (ادبی دنیا) سے ملے تو اس کے بعد ادب کی طرف میں متوجہ ہوا۔ چنانچہ میری پہلی تخلیق میرے اصلی نام سے ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئی، مگر اس کے بعد کافی عرصہ تک میری شاعری نصرت آراء نصرت کے فرضی نام سے اور نثر نصیر آغا کے فرضی نام سے ''ساقی'' اور ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتی رہی۔ 1949ء میں جب ''ادبی دنیا'' کا نیا دور شروع ہوا تو میں نے اپنے اصل نام سے لکھنا شروع کیا چنانچہ نئے دور کے ''ادبی دنیا'' کے پہلے ہی شمارے میں میرے اصل نام سے ایک مضمون شائع ہوا عنوان تھا ''محبت کا تدریجی ارتقاء''۔

احسن: آپ ابتداء میں کن ادبی شخصیات سے متاثر ہوئے؟

آغا جی: ابتداء میں مولانا صلاح الدین احمد سے متاثر ہوا جو ان دنوں ''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر تھے۔ شاعری میں فیض احمد فیض نے مجھے بے حد متاثر کیا اور افسانہ نگاری میں کرشن چندر نے .... ان میں سے بعد ازاں فیض صاحب سے دو تین بار ملاقات بھی ہوئی مگر فاصلہ برقرار رہا۔ میں جب 1963ء میں بمبئی گیا تو کرشن چندر سے کئی بار ملاقات ہوئی اور ہم نے ذہنی طور پر خود کو ایک دوسرے کے بہت قریب محسوس کیا البتہ مولانا صلاح الدین احمد صاحب سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی جو 1945ء سے 1964ء تک پھیلی ہوئی تھی۔

احسن: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دور میں بڑا ادب پیدا نہیں ہوا اس بیان کے بارے میں آپ کا ردِعمل کیا ہے؟

آغا جی: میرا خیال ہے کہ قریب سے چیزیں بڑی نظر نہیں آتیں فاصلے سے دیکھیں تو ان کے قد و قامت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے سو برس جب گزریں گے تو آج کا ادبی تناظر صحیح طور پر نظر آئے گا۔ قریب سے تو اپنا چہرہ بھی نظر نہیں آتا۔

احسن: آپ اقتصادیات کے طالب علم تھے اس کے بعد آپ نے طنز و مزاح پر پی ایچ ڈی کی پھر تصوف سے کیسے دلچسپی پیدا ہوگئی؟

آغا جی: ہمارا تعلق ایران کے قزلباش خاندان سے ہے۔ میرے دادا اس صدی کے شروع میں سرگودھا آ گئے اور وہ رڈیارڈ کپلنگ کے دوست تھے۔ میرے والد کو پتہ نہیں کیسے تصوف سے شغف پیدا ہو گیا وہ تصوف اور ویدانت پر لکھی کتابیں لاتے اور برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر انہیں پڑھتے وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کو اپنی بات بچوں کی سی سیدھی سادی زبان میں کہنی چاہیے تصوف اور بعض دوسرے معاملات میں مجھ پر اپنے والد ہی کا اثر ہے۔

احسن: 'افسانے کے تین ادوار' آپ کا مشہور مضمون ہے اس میں آپ نے لکھا ہے کہ سعادت حسن منٹو کا فن جہاں ختم ہوتا ہے رحمان مذنب کا فن وہاں سے شروع ہوتا ہے اس کی تھوڑی سی وضاحت فرمادیں؟

آغا جی: دراصل میرے بہت سے کرم فرماؤں نے میرے اس جملے کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ میں دراصل افسانے میں طوائف کی پیش کش کے حوالے سے بات کر رہا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ طوائف کا موضوع منٹو نے بھی برتا ہے اور رحمان مذنب نے بھی مگر اس میدان میں منٹو کا دائرہ کار محدود رہا ہے۔ منٹو نے زیادہ تر طوائف میں عورت کو موضوع بنایا ہے جب کہ رحمان مذنب نے طوائف کو بطور طوائف پیش کرتے ہوئے اس سارے ماحول کو پیش کر دیا ہے جو طوائف کا خالق بھی اور اس کی مخلوق بھی .... لہٰذا بات صرف ایک خاص موضوع کی ہو رہی تھی منٹو نے طوائف کے موضوع سے ہٹ کر بھی بہت کچھ لکھا ہے اور بعض ناقابلِ فراموش افسانے تخلیق کیے ہیں۔ جب کہ رحمان مذنب نے صرف طوائف کی دنیا کو منعکس کیا ہے گو یہ دنیا اپنے اندر ایک طلسم ہوشربا چھپائے ہوئے ہے۔ میں نے منٹو کے پورے فن کا رحمان مذنب کے پورے فن سے کہیں بھی موازنہ نہیں کیا۔

احسن: ہمارے ہاں مختصر نظموں کو فروغ کیوں نہیں ہوا؟

آغا جی: ہمارے ہاں مختصر نویسی کا رجحان زیادہ رہا ہے۔ اس لیے دوہے، غزل اور افسانے کو فروغ ملا ہے۔ ہمارے ہاں ضرب الامثال کی کثرت کا بھی یہی سبب ہے۔ طویل نظم کہنا ایک امتحان سے گزرنا ہے زیادہ طویل نظمیں کئی نظموں کا ملغوبہ معلوم ہوتی ہیں۔ اصلاً ایک اچھی نظم کو بطور اکائی وجود میں آنا چاہیے۔

احسن: آپ نے ایک مرتبہ کہیں یہ کہا تھا کہ بڑے شہروں میں بڑے ادیب پیدا نہیں ہوتے کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

آغا جی: یہ حقیقت ہے کہ بڑے شہر بڑے ادیب ذرا کم ہی پیدا کرتے ہیں۔ لاہور ہی کو لیجیے یہاں بھی اکثر ادباء باہر ہی سے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ اقبال بھی .... بڑے شہروں میں زرخیز زمین کو اینٹ اور سیمنٹ ڈھانپ لیتے ہیں۔ آسمان نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ نظریں دیواروں میں مقید ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے بڑے ادیب کم ہی بڑے شہروں میں پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ شہر ادیب کی تربیت ضرور کرتے ہیں۔ لاہور ایک بہت بڑی تربیت گاہ کے طور پر مشہور ہے گو ان دنوں وہ ادب کی تربیت کم اور شہرت حاصل کرنے کی تربیت زیادہ فراہم کر رہا ہے۔

احسن: نثر میں ایک داخلی آہنگ ہوتا ہے کیا یہ بات درست ہے؟

آغا جی: بالکل ہوتا ہے مگر یہ نثری آہنگ ہے شعری آہنگ نہیں۔ ویسے تو تمام کائنات میں آہنگ موجود ہے۔ ہماری گفتگو میں بھی ایک آہنگ ہے آپ جب بے تلے قدموں سے چلتے ہیں تو یہ چلنا نثر کے آہنگ میں ہوتا ہے مگر جب آپ رقص کرتے ہوئے تھرکتے ہوئے قوسیں بناتے ہوئے چلتے ہیں تو یہ شاعری کا انداز ہے میں سمجھتا ہوں سارے کا سارا فن ایک قسم کا رقص ہے۔ موسیقی میں دیکھیں کہ اس میں سُر چکر سا لگا کر دوبارہ وہیں آ جاتے ہیں جہاں سے وہ چلے تھے وہی قوس کا سا انداز .... اسی طرح جسمانی اور افلاطونی (Platonic) محبت کے فرق پر غور کریں جسمانی محبت میں محبت کا حصول اہم ہوتا ہے جبکہ Platonic محبت محبوب کے گرد پروانہ وار گھومنے کا نام ہے تمام فنون ایک مرکزی نقطہ کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس سے جذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ایک بہت لطیف نکتہ آپ کو بتاتا ہوں مولانا رومؒ کے رقاص دائرے میں گھومتے ہوئے جذب کی کیفیت میں ڈوب جاتے تھے۔ مذاہب میں دائرے میں گھومنے کا عمل روحانی طور پر جذب ہونے کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ دائروں اور قوسوں میں گھومنے کا انداز شاعری کا ہے اور مستقیم انداز میں چلنا نثر کا ہے۔ جو فرق قوس اور لکیر میں ہے وہی فرق نظم اور نثر میں ہے۔

احسن: آپ کن کن شاعروں اورادیبوں سے متاثر ہوئے ہیں نئے لکھنے والوں میں آپ کن کوزیادہ صحت مند تخلیق کار کہہ سکتے ہیں۔شعراء کی نئی نسل سے آپ خصوصاً برصغیر ہندو پاک میں کہاں تک مطمئن ہیں کیااس وقت آپ اس نسل کوکوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

آغاجی: اردوادب کی حدتک میں سب سے زیادہ غالب سے متاثر ہوا پھراقبال سےان کے بعد فیض کےابتدائی کلام اور مجید امجد کے سارے کلام سے متاثر ہوا نظم کوشعرا میں سے میراجی، ن۔م راشد، صفدر میر، منیر نیازی، اور بلراج کومل کی بعض نظمیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔احمد ندیم قاسمی کے بعض قطعات مجھے آج بھی بہت پسند ہیں۔فکشن میں کرشن چندر کے ابتدائی افسانے اور ممتاز مفتی کے آخری افسانے، غلام عباس مجھے سارے کاسارا پسند آیا، جوگندر پال اور غلام الثقلین نقوی کے ہاں مجھے عام روش سے ہٹ کرایک کشادہ زاویہ نگاہ ملاجو مجھے بہت اچھالگا۔نئے دور میں افسانہ نگاری کے سلسلے میں رشید امجد، منشایاد، اور جوگندر پال کے افسانوں نے بھی متاثر کیا۔ جدید دور میں غزل گوئی کے سلسلے میں ظفر اقبال کی ابتدائی غزلیں پسند آئیں۔ناصر شہزاد کے گیت اور شکیب جلالی کا کلام بہت اچھالگا۔شکیب جلالی کی شاعری میں ایک انوکھی کسک ہے جوزندگی کے کربناک تجربات سے پھوٹتی ہے:اس کا اسلوب بھی تازہ اور جان دار ہے۔شہزاد احمد نے بہت اچھی غزل کہی ہےاوراب تک کہہ رہے ہیں۔پچھلے پندرہ سالوں کے دوران میں اچھے شعراء کی ایک پوری کہکشاں نظرآ رہی ہے۔آپ نے نئے صحت مند تخلیق کاروں کے بارے میں پوچھا ہے،توسب سے پہلے لفظ صحت کی توضیح ضروری ہے۔ہوسکتا ہے جسے ایک شخص "صحت" قراردے،وہ دوسروں کی نظروں میں "روگ" ہو۔میں نئے لکھنے والوں سے بے حد مطمئن ہوں،وہ اپنے لیے نئے امریکہ دریافت کرنا چاہتے ہیں اور یہی اصل بات ہے، ورنہ روایت کی گہری کھائیوں میں چلتے رہنے کی صورت میں تو کولہو کے بیل ہی برآمد ہوں گے۔نئی نسل کے لیے میرے پاس کوئی پیغام اس لیے نہیں کہ پیغام نے ہمیشہ ہرنئی نسل کوبربادکیا ہے۔دوسرے،اس لیے کہ آج کی نئی نسل اپنی ذات کی طرف سے مہیا کردہ روشنی میں سفرکرنے کی قائل ہے،وہ مانگے کے اجالے کوپسندنہیں کرتی۔

احسن: غلام عباس کے افسانوں میں ایسی کیا خاص بات ہی کہ آپ کواس کا سارے کاسارا کام پسندآیا ؟

آغاجی: غلام عباس نے نسبتاً کم افسانے تخلیق کیے ہیں اور یہ سارے افسانے اعلیٰ پایے کے ہیں جبکہ دوسرے افسانہ نگاروں نے اچھے افسانوں کے ساتھ غیر معیاری افسانے بھی لکھے ہیں۔اس لیے مجھےاس کا ساراکام پسند ہے۔

احسن: لگتا ہے،آپ کوگاؤں کی شام بہت زیادہ پسند ہے۔۔۔اس قدرکہ وہ آپ کی شاعری میں سرایت کرگئی ہے اورآپ کی بعض کتابوں کے عنوانات میں بھی لفظ "شام" موجود ہے۔مثلاً شام کی منڈیر سے،شام اورسائے،اور شام دوستاں آبادوغیرہ!

آغاجی: جی ہاں، مجھے گاؤں کی شام بہت پسند ہے۔ دراصل شام میرے لیےایک پراسرار شے ہے۔۔۔نہ وہ دن ہے نہ رات، وہ دونوں کے سنجوگ کا انوکھا عالم ہے، سوتے جاگنے کی کیفیت ہے۔۔۔میں سمجھتا ہوں،تخلیق بھی سوتے جاگتے کی کیفیت ہی سے جنم لیتی ہے!

احسن: اردوادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کے لیے سرکاری سطح پر کیااقدامات ہونا چاہئیں۔؟

آغاجی: ہمارے ہاں زیادہ تر ون وے ٹریفک ہی دیکھنے میں آیا ہے۔مراد یہ کہ دوسری زبانوں کی کتابوں کوتواردو میں منتقل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔(گو یہ کام بھی بڑے پیمانے پر نہیں ہوا) مگراردو کتابوں کوانگریزی،فرانسیسی، روسی اور دیگر اہم زبانوں میں منتقل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ حکومت نے اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے متعدد ادارے قائم کررکھے ہیں۔ان میں سے بیشتر اداروں نے معمولی کاموں کے سلسلے میں تو غیر معمولی سرگرمی دکھائی ہے مگر اپنے ادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کی کوئی قابل ذکرکوشش نہیں کی۔

احسن : کلچر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔ کیا یہ تہذیب سے کوئی مختلف چیز ہے؟

آغاجی : کلچر کے بارے میں نیز کلچراور تہذیب کے فرق کے بارے میں اظہار خیال کر چکا ہوں کلچر کی جڑیں دھرتی کے اندر بہت دورتک اتری ہوتی ہیں،لہٰذا کلچر دھرتی کا اٹوٹ انگ کہلاتا ہے تاہم کلچر سفربھی کرتا ہے مگراس کے سفر کا انداز نرالا ہے۔کلچر سفر کرنے سے پہلے اپنی قلب ماہیت کرتا ہے۔مثلاً جب کسی درخت پر پھول آتے ہیں تو درخت ان پھولوں کے جوہرکوخوشبو میں منتقل کر کے دُور دُور تک پھیلاتا ہے،مگرخوشبو ایسی شے ہے کہ ہوا کا رخ بدل جائے یا پیچھے سے اس کی آمدکا سلسلہ رک جائے تو یہ رقیق ہوکرفضا میں میں گھل جاتی ہے۔ یہی حال کلچر کا ہے۔یہ خودکوتہذیب میں منتقل کرکے،دُوردُور تک پہنچتا ہےلیکن اسے پیچھے سے کمک نہ ملے تو نئی دھرتی کے مزاج کا حصہ بن کر،اس میں ضم ہو جاتا ہے۔کلچراور تہذیب دراصل انسانی ارتقاء کی دو(۲) سطحیں ہیں۔۔۔ایک تخلیقی سطح اور دوسری تقلیدی۔۔۔کلچر کی سطح تموج اور جست کی سطح ہے جبکہ تہذیب کی سطح پھیلاؤ، جذب اور تقلید سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے اردو شاعری کا مزاج" میں ان دونوں کے فرق کوایک جملے میں یوں بیان کیا ہے:

"تہذیب روایات، رسوم،قوانین وآداب کا وہ جھولا ہے جس میں سوسائٹی کی نیند سوتی ہےاور کلچر وہ روح بیدار ہے جواس سوسائٹی کوجھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتی رہتی ہے۔"

❖OOO❖

پنجابی انٹرویوکا بقیہ حصہ

ہاں جس ویلے کہ سائنس اتے تصوف Science and Metaphysics اک ہوجاون گے میں اونہاں نوں آکھیا کہ جناب اوہو گیاں نیں کیونکہ جدوں دی تھیوری آئی اے جو Physics / Metaphsics دے درمیان اک جو بے کی رکاوٹ اوہدے وچ ملائمت آ گئی اے تے دونویں آپس وچ مائل ہوگیاں نیں۔سو تصوف والے پاسے تاں ساری دنیا جا رہی اے۔تے اے چیز ہی Structuralisum تحریک اے ایہدے وچ تصوف دا عنصر بہت اے آرہیا اے تے طبیعات وی تصوف ول جا رہی اے سچائی ہمیشہ سچائی ہندی اے لیکن ایہہ اے کہ اوہنوں ہر زمانے وچ نویں بھیس وچ پیش کیتا جاندا اے۔

سوال : نویں لکھاریاں نوں پیغام ؟

جواب: ساڈی نظم یا غزل اک حدتک اینوں Modem Sensilit دے نال ملانا چاہیدا اے تے جو Images ساڈے اردگرد پیدا ہورہے نیں اوہ جو سانوں نظر نہیں آوندے اوہ نظرآن تے شاعر دا کم وی ایہوای ہے کہ اوہنوں چیزاں نظر آن تے حیرت جاگے تاں شاعری ہندی ہے تے ایس واسطے سانوں کلیشے وچ نہیں جاناں چاہیدا۔ساڈی قلب ماہیت Metamorphysis ہووے گا پنجابی زبان خاص طور تے شاعری وچ تاں سانوں نویاں راہواں ول جانا چاہیدا اے بنیاں بنائیاں ترکیباں، Ecology تے ثقافتی قدراں جو بنیاں بنائیاں بن اونہاں دی نویاں تشریحات جمڑیاں نیں اونہاں ول توجہ کرنی چاہیدی اے۔

ڈاکٹر وزیرآغاصاحب تہاڈا بہت بہت شکریہ

❖OOO❖

غزل

رنگوں کو پہلے دل کے ترازو میں تولئے
پھر ان کو آنسوؤں کے سمندر میں گھولئے

اٹھیے کہ آسمان بھی چھت بن کے جھک پڑا
آپ آسماں کے نیچے بڑی دیر سو لئے

سورج نے کر دیا ہے زمیں کو لہو لہان
یاتُو نے اپنے پاؤں میں کانٹے چبھو لئے

آنگن میں پہلے تاروں کی کرچیں بچھا یئے
پھر مست ہو کے ڈولئے ہنس ہنس کے بولئے

شاید کہ کوئی نخل تکلم ہرا ملے
نظروں سے ریگزار کے تن کو ٹٹولئے

شاید کہ اس سکوت میں بھی میرا ہاتھ ہو
قفل سکوت کھولئے کچھ منہ سے بولئے

خواہش کی کہکشاں کو کیا ہم نے مختصر
اور تو نے لاکھ رنگ نظر میں سمو لئے

❖○○○❖

غزل

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور
چاندنی رات ترا ہی مکھ ہے، ترا ہی روپ ہے بھور

کس بادل کا دامن تھام کے تیرے دیس سے جاؤں
تیرا قد آکاش سے اونچا، لانبی تیری پور

تُو کندن سی اوس میں ڈھل کر بکھرے شام ڈھلے
چندا کے زینے سے اترے آدھی رات کا چور

تُو سورج کی آنکھ سے جھانکے پل پل وار کرے
میں اک پیڑ کی گھائل چھایا، میرا کس پر زور

میں آوارہ، بھاگ کے تجھ سے، دیس بدیس پھروں
رُک جاؤں تو ہاتھ تمہارا کھینچے میری ڈور

غزل

مٹی اڑی تو پھولتی سرسوں کا دم گھٹا
شبنم گری تو سبز درختوں کا دم گھٹا

آنسو بھری نگاہ سے دیکھا تو کیا نہ تھا
چلمن اتر گئی تو مکانوں کا دم گھٹا

آواز دی تو ساتوں فلک جھک کے آ گئے
لب سی لئے تو دونوں جہانوں کا دم گھٹا

دیکھا تو سارا دشت ہی اک لالہ زار تھا
خوشبو گھنی تھی اتنی، ہواؤں کا دم گھٹا

کس کو خبر کہ کیسے ہوا رت جگا تمام
اور کیسے شب کے پنچھی کی چیخوں کا دم گھٹا

❖○○○❖

غزل

صورت سے آشنا تھا مگر جانا نہ تھا
پہچان کر بھی مجھ کو وہ پہچانا نہ تھا

مر جائے گی ہوا مجھے اس کا گماں نہ تھا
تھک جائے گی صدا، میرا جی مانا نہ تھا

آخر اُسی نے تجھ پہ نچھاور کیا لہو
وہ شخص جس کو اپنا تو گردانا نہ تھا

وہ دن بھی یاد کر کہ بھرے شہر میں یہاں
تیرے سوا کوئی بھی تجھے جانا نہ تھا

میں خوش کہ مل سکا تجھے اک اجنبی کی طرح
تو مطمئن کہ میں تجھے پہچانا نہ تھا

❖○○○❖

غزل

کبھی پھولوں پہ موتی بو گئے ہو
کبھی چپ چاپ مٹی ہو گئے ہو

گھنے جنگل میں گم رستہ ہوا ہے
بھری محفل میں تنہا ہو گئے ہو

سنو تم صبح کی دستک کا نغمہ
کہاں تاریکیوں میں کھو گئے ہو

مہک تو ہر بُنِ مو سے اڑی ہے
تمہیں بے دست و پا سے ہو گئے ہو

ہزاروں بار پہلے بھی گرے تم
مگر اس با پتھر ہو گئے ہو

(نوٹ۔ یہ تمام غزلیں "دن کا زرد پہاڑ" میں شامل ہیں)

❖○○○❖

شمس الرحمن فاروقی

میں نے وزیر آغا کو بہت پڑھا ہے اور تھوڑا بہت اُن کی خدمت میں مجھے نیاز بھی حاصل ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے ممتاز دانش اور مفکر ہی نہیں، بڑی شائستہ اور دل نواز شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے آدمی اور خاص کر ادب کی دنیا کے بڑے آدمی، دل کش شخصیت کے مالک نہیں ہوتے۔ کارلائل کی بیوی تو کھلے عام کہا کرتی تھی کہ انسان کچھ بھی کرے لیکن کسی Genius کی بیوی نہ بنے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ وزیر آغا سے جتنی ملاقات میری رہی ہے اور جو کچھ میں نے اُن کے بارے میں پڑھا اور سنا ہے اس کی بنا پر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وزیر آغا بڑے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ انسان بھی ہیں۔ حاسدوں نے اُن کے بارے میں کیا نہ کہا اور لکھا...... انھوں نے خود کسی بات کا جواب نہ دیا اور بالآخر کہنے والوں کے منہ میں ہی خاک پڑی۔

وزیر آغا اُردو اور مغربی ادب اور مغرب کے جدید علوم سے گہری اور وسیع واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک نظام فکر بنایا ہے۔ اور ادب کا مطالعہ وہ اسی نظام فکر کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تضاد یا تناقض بالکل نہیں۔ ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں'' بالکل الگ الگ میدان کی کتابیں ہیں۔ لیکن ان پر اگر نام نہ بھی ہوتو بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا مصنف ایک ہی شخص ہے۔ اپنے افکار ونظریات کو مسلسل کسی انحراف کے بغیر ادب کے مختلف موضوعات پر برتنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

وزیر آغا کی شاعری الگ سے ایک میدان ہے جس کا مطالعہ اُن کی تنقید اور ان کے انشائیوں سے الگ ایک بالکل آزاد تخلیقی کارنامے کے طور پر کرنا چاہیے۔ غزل اور نظم اور پھر طویل نظم، ان سب اصناف میں وزیر آغا نے اعلیٰ کامیابی کی روشن مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کے کلام میں ان کا تفکر، ان کی شائستگی، ان کی انسان دوستی، نغمہ ونور میں ڈھل کر نمایاں ہوتی ہیں۔

وزیر آغا نقاد، وزیر آغا شاعر، وزیر آغا انشائیہ نگار، وزیر آغا مدیر، ان مختلف صفاتی الفاظ کو یکجا کرنے کے بعد بھی وزیر آغا کی پوری شخصیت سامنے نہیں آتی۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ مختلف اجزا مل کر جو ایک کُل بنتا ہے، وہ ان اجزا کی مجموعی میزان یا حاصل جمع سے بڑھ کر ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وزیر آغا نے اپنی پوری ادبی زندگی میں نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر کے انھیں ادب میں قائم ہونے میں مدد کی ہے۔ وہ صرف ادیب ہی نہیں، ادیب گر بھی ہیں۔ اور یہ مرتبہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔
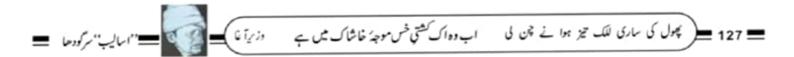
ڈاکٹر وزیر آغا بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ عمر فاروق جوئیہ ریزیڈنٹ ڈائریکٹر آرٹس کونسل

ڈاکٹر وزیر آغا بلند پایہ شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انسان بھی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ محبت اور خلوص کا درس دیا ہے۔ میں جب بھی سرگودھا تعینات ہوا کسی پروگرام کی مشاورت کے سلسلہ میں ان سے ملا تو انھوں نے کمال محبت سے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ آرٹس کونسل کے کئی پروگرامز میں شریک ہوتے رہتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہر پروگرام کی جان ہوا کرتے تھے۔ جس پروگرام میں ڈاکٹر وزیر آغا شریک ہوتے وہ پروگرام برسوں یاد رہتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا دو ہفتے کے لیے سویڈن گئے تو واپس آنے پر ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر مشتمل ایک خوبصورت کتاب سرگودھا رائٹرز کلب اور آرٹس کونسل کے تعاون شائع کی گئی۔ پھر کئی بار ان کے دولت کدہ پر بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کی محفلوں میں بھی بیٹھا ہوں۔ وہ واقعی ایک عظیم تخلیق کار تھے۔ جن کی کتابیں اس وقت بھی پاکستان، ہندوستان اور دیگر ممالک میں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کسی ایک صنف میں نہیں بلکہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنا ایک الگ تشخص قائم کیا۔ انھوں اردو غزل، اردو جدید نظم، انشائیہ، سفرنامہ، خودنوشت سوانح، تنقید میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ ان خیالات کا اظہار گوجرنوالہ آرٹس کونسل کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر عمر فاروق جوئیہ نے سہ ماہی اسالیب کی ٹیم سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سرگودھا تعیناتی پر ان کی یاد میں ایک شاندار پروگرام کیا جائے گا۔

قائداعظم کالج آف مینجمنٹ اینڈ کامرس کے زیر اہتمام تعزیتی ریفرنس

قائداعظم کالج آف مینجمنٹ اینڈ کامرس سرگودھا کے زیر اہتمام ڈاکٹر وزیر آغا کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس ہوا جس میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، سابق صوبائی وزیر عامر سلطان چیمہ صدر ڈسٹرکٹ بار محمد سلیم ٹمسیلا مہمانان خصوصی تھے، اور اس تقریب کے روح رواں محمد قاسم سٹیج پر متمکن تھے۔ محمد قاسم نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے فعال کردار ادا کیا انھوں نے کارڈز کی تقسیم، بینرز اور ٹیلی فونز کالز کے ذریعے دوستوں کا اس پروگرام کی دعوت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کافی تعداد میں اہل قلم اور معزز شہریوں نے شرکت کی جن اہل قلم نے مضامین و مقالہ جات پڑھے ان میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، محمد قاسم، پروفیسر تنویر الرحمن، ارشد ملک پروفیسر ریاض احمد شاد، شاکر کنڈان، ڈاکٹر حسین احمد پراچہ، یوسف خالد، پروفیسر طارق حبیب، ذوالفقار احسن، عابد خورشید، منزہ انور گوندی، ثمینہ گل، ارشد جبار پراچہ، اور خالد اقبال شامل تھے مقررین نے زبردست انداز میں ڈاکٹر وزیر آغا کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہ ہو سکے گا۔ آخر میں ان کے لیے اجتماعی مغفرت بھی کی گئی۔

قائداعظم کالج آف مینجمنٹ اینڈ کامرس کا وزیر آغا کی پہلی برسی کے موقع تعزیتی ریفرنس اور ''شام وزیر آغا''

قائداعظم کالج آف مینجمنٹ اینڈ کامرس سرگودھا نے ڈاکٹر وزیر آغا کی پہلی برسی کے موقع پر ایک پروگرام جس میں ملک بھر سے مقررین شریک ہو رہے ہیں وہ ہے۔

''A Tribute to Wazir Agha'

جبکہ دوسرا پروگرام

''شام وزیر آغا'' ہے۔

جس میں ان کی معروف غزلیں گلوکار ساز و آواز کے ساتھ پیش کریں گے اور حاضر شعراء اپنا کلام پیش کریں گے ان پروگرامز کو کامیاب بنانے کے لیے محمد قاسم کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کالج ہذا میں مین لائبریری میں وزیر آغا کارنر بھی قائم کر دیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی بکس اور ان پر لکھی گئی بکس رکھی گئی ہیں۔

منظوم خراج تحسین

جو وزیر آغا دقیقہ رس تھے اور انشا نگار
اپنے مداحوں کو شاہد چھوڑ کر جاتے رہے
ہوگئیں بے کیف اب محافل شعر و ادب
کیونکہ شاعر فلسفی نامور جاتے رہے

دنیا سے چل بسے ہیں ڈاکٹر وزیر آغا
تھے غم اگرچہ اور بھی یہ غم بھی اب سہو
اک سایہ دار پیڑ زمیں بوس ہوگیا
تپتی زمیں پہ شاہد رہنا ہے تو رہو

صاحبزادہ شمشاد حسین شاہد

فہیم احمد صابری کو ترقی دے دی گئی

گورنمنٹ کیڈٹ کالج کوہاٹ کے شعبہ اردو کے لیکچرار فہیم احمد صابری جو سہ ماہی ''اسالیب'' کے مستقل قلمی معاون بھی ہیں ان کی کئی جاندار تحریریں قارئین پڑھ چکے ہیں ان کو گزشتہ دنوں اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا ہے۔ ادارہ اسالیب ان کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اور دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی مزید کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرتے رہیں۔ اسسٹنٹ پروفیسر فہیم احمد صابری نے کافی سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کی انگریزی نظموں پر اپنا ایم اے کی سطح کا تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا تھا۔ یہ تحقیقی مقالہ پروفیسر ڈاکٹر سجاد حسین شیرازی کی نگرانی میں لکھا گیا۔ اس تحقیقی مقالے کو بہت زیادہ سراہا گیا تھا۔